اُردو زبان
کی
مختصر ترین تاریخ

ڈاکٹر سلیم اختر

یشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

URDU ZABAN KI MUKHTASAR-
TAREEN TAREEKH

by

Dr. Salim Akhtar

Year of 1st Edition 2003
ISBN 81-87667-80-x
Price Rs. 95/-

نام کتاب	اُردو زبان کی مختصر ترین تاریخ
مصنف	ڈاکٹر سلیم اختر
سنِ اشاعت اوّل	۲۰۰۳ء
قیمت	۹۵ روپے
مطبع	آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil street, Kucha pandit, Lal kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465, Fax: 91-011-23211540
E-mail: ephdelhi@yahoo.com

پیش لفظ

اردو زبان کے لسانی اور فنی پہلوؤں پر متعدد اہلِ علم اور محققین کی تصانیف موجود ہیں۔ اب بھی بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ماہرینِ لسانیات اردو زبان کی لسانیاتی تاریخ پر خصوصی توجہ دیں۔ یہ ہماری علمی ضرورت بھی ہے اور درسی ضرورت بھی۔ اردو کی بیشتر لسانیاتی تاریخ مختلف ادبی تاریخوں میں موجود ہے لیکن اس موضوع پر مزید معیاری کام کا بھی طلبہ اور اہلِ ذوق کو انتظار ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس موضوع پر توجہ کرکے ایک اہم مسئلے کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ زیرِ نظر کتاب بنیادی طور پر ایم۔ اے اردو کے طلبہ کی درسی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر تصنیف کی گئی ہے۔ کتاب کو آٹھ ابواب میں تقسیم کرکے ان تمام مباحث کا احاطہ کر لیا گیا ہے جو اردو زبان کے لسانی اور تاریخی مطالعے کے دوران قارئین کے سامنے آ سکتے تھے۔ مصنف کی کوشش ہے کہ کتاب زبان، اصطلاحات اور مباحث کے اعتبار سے عام قاری کی دلچسپی کا باعث بھی ہو اور طلبہ بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ انھوں نے کتاب کی زبان اور اسلوب کو اتنا سادہ اور عام فہم بنا دیا ہے کہ اس موضوع کا مطالعہ کرنے والا خواہ کسی سطح پر ہو اس کتاب سے مستفید ہو سکتا ہے۔ امید ہے کہ درسیات سے متعلق مقتدرہ کی دیگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی اساتذہ، طلبہ اور عام قارئین میں مقبولیت حاصل کرے گی۔ اس کام کی نگرانی ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب نے کی اور اس کی نوک پلک سنوارنے میں جس محنت سے کام کیا اس پر وہ بجا طور پر ستائش کے مستحق ہیں۔

—— افتخار عارف

ترتیب

HaSnain Sialvi

مقدمہ

ہمارے ہاں لسانیات کا جو معیاری کام ہوا اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن یہ کتابیں صرف ان ماہرین کے لیے ہیں۔ جنھوں نے لسانیات کا خصوصی مطالعہ کر رکھا ہو۔ عام قارئین کے لیے یہ کتابیں بھاری پتھر ثابت ہوتی ہیں جسے وہ احتراماً چھو کر اور پھر چوم لینے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ لسانیات کی بعض اہم کتابوں میں جو نظریہ سازی ملتی ہے، اس کے باعث مواد کی پیش کش کسی مخصوص لسانی تصور کے تابع ہوتی ہے۔ یعنی اپنے نظریہ کی توثیق اور برعکس تصورات کی تردید کا یوں دائرہ کار محدود ہو جاتا ہے۔ اور اس نظریہ سے موافقانہ یا مخالفانہ دلچسپی رکھنے والے حضرات ہی اس سے شوق فرماتے ہیں۔ ان کتابوں کی اہمیت اور افادیت سر آنکھوں پر لیکن اس حقیقت سے اغماز ممکن نہیں کہ یہ صرف ماہرین کے کام آسکتی ہیں عام قارئین کے لیے یہ سب کچھ "یونانی" ثابت ہوتا ہے اور اسی کو میں نے "اردو" بنانے کی سعی کی ہے۔

"اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کے پہلے دو باب - اردو کے مختلف ناموں اور پیدائش کے نظریات سے بحث کرتے ہیں۔ کتاب لکھنے کے دوران فراہمی مواد کے سلسلے میں مجھے اردو زبان کی ایسی تاریخ کی ضرورت کا احساس ہو گیا جو اردو زبان کی لسانی تاریخ نہ ہو۔ یعنی اسے کسی محقق یا ماہر لسانیات نے قلمبند نہ کیا ہو۔ اور اتنی ٹیکنیکل بھی نہ ہو کہ عام قاری زبان، اصطلاحات اور مباحث کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرے۔ یعنی کتاب کا خطاب ماہرین کے بجائے ان حضرات سے ہو جو لسانیات کے بنیادی مباحث سے آشنائی پیدا کیے بغیر اردو زبان کے بارے میں اساسی معلومات اور ضروری کوائف حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں۔ زیر نظر کتاب اسی احساس کی عملی صورت ہے۔

زبان انسان کے لیے اور انسان زبان کے لیے ہے اسی لیے زبان کے آغاز نشو و نما اور تشکیلی عناصر کا مطالعہ "انسان" کے مطالعے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ زبان کا مطالعہ اب محض صرف و نحو اور لغات کے مطالعے سے بلند ہو کر اساطیر، قدیم تاریخ، آثارِ قدیمہ اور علم الانسان کی حدود میں داخل ہو چکا ہے اسی لیے میں نے بھی زبان کی ماہیت آغاز اور رسم الخط سے متعلق مباحث کو ان علوم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ امر بطور خاص اجاگر کیا کہ

زبان کی تشکیل میں قوم کی تہذیبی اقدار اور افراد کی تخلیقی صلاحیتیں کس طرح سے وہ موثر کردار ادا کرتی ہیں جس کے باعث زبان محض بے جان الفاظ کی بھیڑ ثابت ہونے کے برعکس زندہ عضویت میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی لیے کہیں واضح طور پر تو کہیں بین السطور زبان کا تہذیبی، عمرانی اور نفسیاتی تناظر ابھاگر کرنے کی سعی کی۔

اردو زبان کی تاریخ میں موضوعات و مباحث کی ترتیب میں عام ڈگر سے روگردانی کرتے ہوئے زبان کی تشکیل و تعمیر میں ان عناصر سے خصوصی بحث کی گئی جنہیں بالعموم تاریخ ساز نہیں سمجھا جاتا یعنی لغت، قواعد، ترجمہ اصطلاحات اور متروکات۔ زبان اور رسم الخط ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ لہذا رسم الخط کے آغاز اور مدارج ارتقا کا تعین کرنے کے لیے جداگانہ باب مختص کیا گیا۔ اور تازہ کتابوں اور تازہ ترین مقالات کی امداد سے موضوعات و مسائل پر نئے زاویہ سے روشنی ڈالتے ہوئے انہیں اپ ٹو ڈیٹ کرنے کی سعی بھی کی گئی۔ یہ سعی مشکور ہے۔ یا نامشکور۔ اس کا فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

کتاب میں مواد کی پیش کش کا انداز "مختصر ترین تاریخ" والا ہے یعنی ضمنی سرخیوں سے مخصوص مباحث کو نمایاں کرنا شاید بعض حضرات کو یہ انداز کچھ قدیم سا محسوس ہو۔ لیکن میرا تجربہ ہے کہ ضمنی سرخیوں سے بڑ متنوع مواد کی پیش کش میں سہولت رہتی ہے۔ یہ بھی ایک نوع کی درجہ بندی ہے۔ نظر واحد سے موضوع کی حدود یا پھیلاؤ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بعض اہم مباحث کے بارے میں اہم کتابوں اور مقالات کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ تاکہ مزید معلومات کے خواہاں حضرات ان سے رجوع کر سکیں۔

کتاب پر کئی برس پہلے کام شروع کیا تھا۔ میں تیز گامی میں خاصا بدنام ہوں۔ لیکن جانتا تھا کہ فراہمی مواد میں مشکلات کے باعث یہ کام تیزی والا نہیں چنانچہ کتابیں اور جرائد جمع کرتا رہا پھر دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں سے بھی بہت کچھ حاصل کیا۔ بہرحال گذشتہ برس کام ختم کر لیا مگر مسودہ اتنا گندہ اور پراگندہ تھا کہ کاتب تو کجا میں خود بھی اس کے بعض حصے پڑھنے کے قابل نہ تھا۔ پورا سال ----- جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت ----- کی آرزو میں بسر ہو گیا۔ حتی کہ موسم گرما کی تعطیلات شروع ہو گئیں۔ تب میری اہلیہ سعیدہ اور بیٹی ارم سلیم نے ترس کھا کر مسودہ صاف کرنے کی حامی بھر لی۔ ماں بیٹی نے یوں شنشوں میں کام کیا کہ چند دنوں میں مسودہ دیدہ زیب بنا ڈالا۔ بیوی اور بیٹی کی میرے کام سے دلچسپی جس محبت کی مظہر ہے وہ ہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔ اکثر اوقات لوگ پوچھتے ہیں کہ میں نے اتنا کام

کیسے کر لیا۔ اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ سعیدہ نے ہر ممکن کوشش سے میرے لیے گھر کا ماحول پر سکون، خوشگوار اور پر آسائش بنائے رکھا۔ ایسے میں کام نہ کرنا کفرانِ نعمت ہوتا۔

جناب افتخار عارف صدر نشین مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کا شکریہ لازم ہے جن کی توجہ سے کتاب مراحل طباعت طے کر کے آپ تک پہنچ سکی۔

ڈاکٹر سلیم اختر

پہلا باب

زبان کیا ہے؟

ماہرین لسانیات نے بحیثیت مجموعی زبانوں کے آٹھ عظیم خاندان بنائے ہیں۔ یہ آٹھ لسانی خاندان کچھ یوں ہیں۔ (۱) سامی (۲) ہند چینی (۳) دراوڑی (۴) سونٹرا (۵) افریقہ کی بانتو (۶) امریکی (۷) ملایا (۸) ہند یورپی۔ ان کی تفصیل کچھ یوں بنتی ہے۔

(۱) سامی: اس میں عبرانی، فنیقی، عاشوری اور قدیم شام اور بابل کی وہ زبانیں شامل ہیں جو اب ناپید ہو چکی ہیں۔ موجودہ دور میں عربی اور افریقہ میں چند حبشی زبانیں اس کی نمائندگی کرتی ہیں۔

(۲) ہند چینی: اس میں چینی سیامی (اس سلسلے کی سات زبانیں) تبتی (ہمالوی اور اسی سلسلے کی تیئس زبانیں) اور برمی سو چھبیس شاخوں کے شامل ہیں۔

(۳) دراوڑی: تامل، تلگو، ملیالم، کنٹری ہندوستان میں، پاکستان میں براہوی۔

(۴) سونٹرا: اس میں ہندوستان کی گونڈ، نستال، منڈلی، راج محل اور سنبھل پوری۔

(۵) بانتو: افریقہ کی ایک سو پچاس زبانیں۔

(۶) امریکی ریڈ انڈین قبائل: متعدد ریڈ انڈین قبائل کی زبانیں، ان میں سے بعض اب ان قبائل کے ساتھ ہی ناپید ہو چکی ہیں۔

(۷) ملایا: اس علاقے کی متعدد زبانیں۔

(۸) ہند یورپی: زبانوں کے اس عظیم سلسلے کو آریائی اور ہند جرمانی بھی کہتے ہیں۔ ہندوستان کی بیشتر بڑی زبانوں کے علاوہ یورپ کی تمام اہم زبانیں جیسے انگریزی، جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور کیلٹک زبانیں۔

لسانی اشتراک:

بعض ماہرین لسانیات اس بات کے قائل ہیں کہ یقیناً ابتدا میں کوئی ایک زبان ہو گی (جیسا کہ عہد نامہ عتیق سے بھی واضح ہوتا ہے)۔ اس ضمن میں یہ بنیادی دلیل دی جاتی ہے کہ پہلے پہل انسان نے کسی ایک خطہ ارض میں مل جل کر رہنا شروع کیا۔ بعض ماہرین کے نزدیک یہ آرین تھے جنھوں نے پہلی مرتبہ ایک سماج کی صورت میں رہنا شروع کیا اور انھی کو موجودہ یورپ کی مختلف اقوام کا جد سمجھا جاتا ہے۔[1]

بہر حال آریوں کی جو بھی حیثیت ہو آج سے ہزاروں برس قبل جب وہ دریائے ڈینوب (موجودہ جرمنی) کی وادی سے نکلے، تو انھوں نے دو گروہ کی صورت میں مختلف ممالک کا رخ کیا، کچھ ہندوستان پہنچے تو کچھ یورپ۔ مختلف ممالک میں آباد ہو جانے کے بعد وہاں کے مخصوص جغرافیائی ماحول اور سماجی تغیرات کے نتیجے میں، وہ خود اور ان کے زبان یوں بدل کر ماضی بعید کے "بھائیوں" سے کوئی رابطہ نہ رہا۔ جدید لسانی محققین اب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جرمنی، لاطینی، یونانی، سنسکرت اور اوستا کی اصل ایک ہی ہے۔ ان زبانوں کے خاندان کو "Indo Europian" یا "Indo Germanic" کہتے ہیں۔ زمانی بُعد کے باوجود آج بھی ان زبانوں میں لسانی اشتراک کی کچھ صورتیں نظر آ جاتی ہیں جیسے اردو، سنسکرت، فارسی، یونانی اور لاطینی کے یہ مشترک الاصل الفاظ بطور مثال درج ذیل ہیں:

اردو:	سنسکرت:	فارسی:	یونانی:	لاطینی:
ماں	ماتر، ماتا	مادر	میتر	ماتر
باپ	پیتر، پتا	پدر	پاتر	پیتر
بھائی	بھراتر	برادر	بھراتر	فراتر
بیٹی	دوہتر	دختر	تغتر	-
دانت	دانت	دندان	دنتوس	دنیت
پاوں	پد	پاہ	پاوس	پیس
چھ	ششش	شش	ہیکس	سیکس
سات	سپت	ہفت	ہیپت	سیپتم
آٹھ	اشٹ	ہشت	اکتو	اوکتو[2]

لسانی اشتراک کا یہ تصور دراصل اساطیر کے "واحد الاسطور" (Mono Myth) کے متوازی نظریہ ہے یعنی دنیا میں ابتدا میں صرف ایک ہی اساطیر تھی اور بقیہ اسی سرچشمے سے پھوٹی ہیں لیکن علم الانسان سے اس لسانی اشتراک کی قطعی توثیق نہیں ہوتی مثلاً اب یہ قطعی طور پر ثابت کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں آریوں کی آمد سے پہلے دراوڑ اور ان سے بھی پہلے منڈا آباد تھے اور اس زمانے کے لحاظ سے اچھے خاصے متمدن تھے۔ وہ بستیوں میں رہتے تھے نیز عمارت سازی اور زراعت سے واقف تھے، اب یہ الگ بات ہے کہ فاتح آریوں نے انہیں جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ خود کو اعلیٰ نسل قرار دے کر انہیں شودر، ملیچھ اور راکھشش بنا کر سماجی لحاظ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پس ماندہ بلکہ راندۂ درگاہ بنا دیا۔ آریوں کی آمد سے قبل اس خطہ میں منڈا اور دراوڑی زبانوں کا چلن تھا، یہی نہیں اب تو ماہرین کا ایک ایسا گروہ بھی ملتا ہے جن کی دانست میں خود اردو نے بھی دراوڑی سے ہی جنم لیا ہے۔ ان حالات میں لسانی اشتراک کا نظریہ زیادہ سے زیادہ جزوی طور پر صحیح ہو سکتا ہے۔

انسانی آواز اور زبان سے بچے کا پہلا تعارف ماں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر حالات سازگار رہیں (یعنی ماں زندہ رہے، زیادہ مصروف نہ رہتی ہو، ملازمت نہ کرتی ہو اور شہرت کی بھوکی سوشل ورکر نہ ہو) تو بچہ ابتدائی لسانی تربیت بھی ماں (یا ارد گرد کے افراد) سے حاصل کرتا ہے۔ وہ جب ابا، دادا، ماما، بابا، دودو یا مم جیسے الفاظ کہنا سیکھتا ہے، تو اس میں بڑی حد تک ماں کی "کوچنگ" کا بھی دخل ہوتا ہے۔

جب بچہ قدرے بڑا ہو کر خود کھانے پینے کے قابل ہو جاتا ہے تو وہ ماں کے دودھ سے تو بے نیاز ہو جاتا ہے مگر اس کی زبان سے نہیں، یہ زبان لوریوں کی صورت میں ہو یا کہانیوں کی صورت میں۔ چنانچہ مادری زبان، ماں بولی(۲) اور Mother Tongue جیسے الفاظ اسی امر کے مظہر ہیں کہ زبان کو نسوانی روپ دے کر اس کی ماں کے ساتھ تطبیق کر دی گئی۔ اسی لیے اصول و قواعد کے احترام کی صورت میں زبان کو بعض اوقات "مقدس" کا درجہ دے دیا جاتا ہے، تو اس کا نفسیاتی سبب مادرانہ وابستگی میں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس رویہ نے جب تخلیقی سطح پر اظہار پایا تو زبان اظہار مطالب کے ایک آلہ سے بڑھ کر مقصود بالذات قرار پائی۔ جب کہ تنقیدی سطح پر اہل زبان کا وہ طہارت پسندانہ رویہ معرض وجود میں آ گیا جس کے باعث زبان کو دیوی سمجھتے ہوئے گویا اس کا معبد بنا دیا جاتا ہے اور وہ خود اس معبد کے پجاری بلکہ مہا پجاری بن بیٹھتے ہیں۔ ایسی صورت میں دوسرا یعنی زبان دان "غیر" کی صورت

اختیار کر لیتا ہے، چنانچہ اظہار و اسلوب میں اس تجربہ، جدت اور اختراع، گویا ماں کی طرف اٹھتی نگاہ ضمیر میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں لسانی عصبیت جنم لیتی ہے جیسے دہلی اور لکھنؤ کی لسانی آویزش جس کے نتیجے میں اگر ایک طرف تذکیر و تانیث کی بحثیں تھیں، تو دوسری طرف "باغ و بہار" کے جواب میں "فسانۂ عجائب" قلم بند کی گئی۔ یہ لسانی تشدد پسندی صحیح ہے یا غلط، یہ الگ بحث ہے لیکن خالص لسانی نقطہ سے قطع نظر، اس کا نفسیاتی سبب بھی دلچسپ ہے۔

آوازوں کی آبشار:

دیکھا جائے تو بچہ آوازوں کی آبشار میں ہوتا ہے۔ اس کے لیے تمام آوازیں بامعنی نہیں ہوتیں، اس لیے کہ وہ ابھی اصوات کے حروف بننے، حروف کے الفاظ کے سانچے میں ڈھلنے اور پھر ان الفاظ کے فقرات کی مالا میں پروئے جانے کے عمل سے آگاہ نہیں لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، ایک تو اس لیے کہ بچے کی محدود ضروریات بڑوں نے پوری کرنا ہوتی ہیں اور دوسرے اس لیے بھی کہ "دودو" اور "مم" جیسے الفاظ (بڑوں کو ہنسانے کے باوجود) بچے کے لیے کافی ثابت ہوتے ہیں۔

البتہ بار بار ایک ہی انداز و لہجہ کے الفاظ سننے کے نتیجے میں بچے کے آلات صوت اور اعصاب، مختلف آوازوں کو ان کے مخصوص لہجہ اور آواز کے زیر و بم سے بالآخر انفرادی لفظ کے روپ میں پہچاننے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ابتدا میں یہ عمل غیر شعوری ہوتا ہے لیکن جب بچہ شے اور لفظ کے رشتے کو سمجھ لیتا ہے تو پھر زبان سیکھنے کے عمل میں تیزی آجاتی ہے۔ اس ضمن میں قطعی طور پر عمر کا تعین کرنا ضروری نہیں یعنی بچہ کب دودو کو دودھ اور مم کو پانی کہنا شروع کرتا ہے۔ اس بچہ کی ذہانت، آلات صوت کی حساسیت اور قوت نطق کا قوت گویائی کے ساتھ گہرے رابطے کا تعلق ہے لیکن اتنا ہے کہ ایک مرتبہ جب بچہ لفظ شناسی کے راستے پر گامزن ہو گیا تو پھر اس سفر کا انت نہیں۔ اگر بچے کا مشاہدہ کیا جائے تو وہ بالعموم ایک ایک لفظ کو بار بار دہراتا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ "ابا کوا" کی رٹ لگائے جاتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات بڑے، تنگ آ کر اسے جھڑک بھی دیتے ہیں۔ بچے کے یوں بار بار لفظ دہرانے کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ یوں بار بار دہرانے سے وہ اپنے ذہن میں لفظ اور شے کا رشتہ مستحکم کرتا ہے اور دوسرے وہ لفظ کے صوتی مزے سے آشنائی حاصل کرتا ہے۔ جب وہ مدرسے جاتا ہے تو وہاں الفاظ کو بار بار دہرانے کا عمل شعوری طور پر کیا جاتا

ہے۔ آ۔ آم، ب۔ بکری، پ۔ پنکھا سے حروف یاد کرانا صوت شناسی کے علاوہ اور کچھ نہیں، البتہ اب یہ ہوتا ہے کہ اسے صوت کے ساتھ ساتھ حرف کی ساخت بھی یاد ہو جاتی ہے۔

زبان کا انسان کی زبان (عضو) سے کتنا گہرا تعلق ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس طرح اردو میں زبان (عضو) اور زبان ایک ہی ہیں، اسی طرح انگریزی میں بھی Tongue کا لفظ عضو کے ساتھ ساتھ زبان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کی مختلف حرکات ہی مختلف النوع الفاظ ادا کرتی ہیں۔ اس لیے زبان سے "زبان" یوں مشروط ہوئی کہ دونوں یک نام ہو گئیں۔ آج اس کا تعین مشکل ہے کہ عضو کو پہلے زبان کہا گیا یا زبان کی مناسبت سے بعد میں عضو کو زبان قرار دیا گیا، صورت جو بھی رہی ہو، اب عضو اور صوت ایک ہو چکے ہیں۔

حرف اور پھر لفظ کی تشکیل کے سلسلے میں یہ واضح رہے کہ صوت پہلے تھی البتہ اس نے لفظ کا جامہ نہ پہنا تھا یعنی حروف اور الفاظ تو موجود تھے لیکن گویائی کی حد تک ابھی تحریری زبان ایجاد نہ ہوئی تھی۔

جہاں تک انفرادی حیثیت میں حرف کا تعلق ہے تو ہر حرف زبان کی تشکیل میں اساسی کردار ادا کرنے والی صورت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسے الف سے ظاہر کیا جائے یا ب سے، ج سے یا ک سے، م سے یا ن سے، اس سے فرق نہیں پڑتا کہ الف، ب، ج، ک، م اور ن کی اصوات کو کسی نہ کسی طرح سے ظاہر کیا جانا تھا۔ ہر چند کہ الف، ب، ج، ک، م، ن کی مخصوص صورتیں بھی یونہی الل ٹپ نہ بن گئی تھیں بلکہ ہر حرف کی مخصوص شکل متعدد ارتقائی مراحل کے بعد موجودہ صورت میں سامنے آئی ہے (رسم الخط والے باب میں اس پر مفصل بحث ہوگی)۔ ہر حرف انسانی حلق سے نکلی ہوئی کسی خاص آواز کی نشانی ہے لہذا کسی بھی زبان کے حروف تہجی کی تعداد سے اس امر کا با آسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ زبان بولنے والے افراد کون کون سی آوازیں ادا کرنے کے اہل ہیں اور کن آوازوں کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں زبان میں مٹھاس ہے اور وہ خوش آہنگ ہے، جب کہ اس کے مقابلے میں دوسری کرخت ہے اور اس سے ثقل سماعت ہوتا ہے، تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس زبان کے بولنے والے ملائم یا ثقیل اصوات کے اخراج پر قادر ہیں۔ چنانچہ اردو کے مقابلے میں فارسی اور انگریزی کے مقابلے میں فرانسیسی زبانیں اگر زیادہ خوش آہنگ

سمجھی جاتی ہیں تو اس سے مراد یہی ہے کہ فارسی اور فرانسیسی بولنے والے کرخت اور ثقیل الفاظ کی ادائیگی پر قادر نہیں جیسے ٹ اور T جب بائرن نے "The Isle of Greece" میں اطالوی زبان کی خوش آہنگی کو یوں خراج تحسین پیش کیا: It Flows Like Kisses From a Female Mouth. تو وہ بھی در حقیقت اسی لسانی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

حرف کا سانچہ:

حروف تہجی اس امر کے مظہر ہوتے ہیں کہ اس زبان کے بولنے والے کون کون سی آوازیں حلق سے ادا کرنے پر قادر ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے لوگ اس بناء پر خوش قسمت ہیں کہ ہر طرح کی آوازیں ادا کرنے کے اہل ہیں چنانچہ اگر ایک طرف سنسکرت اور دراوڑی الفاظ سے مخصوص کرخت اصوات ادا کر سکتے ہیں تو دوسری طرف عربی، ترکی، فارسی اور مغربی زبانوں سے مخصوص آوازیں بھی حلق سے نکال سکتے ہیں۔ اردو کے حروف تہجی اس امر کے مظہر ہیں کہ یہاں کے باشندے تعداد میں کئی اصوات کی ادائیگی پر قادر ہیں۔ اردو زبان میں دنیا کی ہر زبان کا لفظ اپنا اصل لہجہ برقرار رکھتے ہوئے ادا ہو جاتا ہے، اس کا یہی سبب ہے کہ اہل اردو متنوع اصوات کی دوست ادائیگی پر قادر ہیں۔ فارسی برصغیر کی تہذیبی اور تخلیقی زبان تھی، اس لیے زبان میں اس کے تمام حروف تو برقرار رہتے ہی تھے جبکہ اسلام، قرآن مجید، عبادات اور دینی رسوم کی بناء پر عربی زبان کا بول بالا رہا۔ چنانچہ عربی کے ث، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، غ بھی اردو حروف میں شامل ہو گئے۔ مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو ہندو دھرم اور سنسکرت کلچر بھی رہا۔ چنانچہ ڑ، ڈ، ٹ اور دو چشمی ھ والے تمام حروف جیسے بھ، ٹھ، تھ، ڈھ، دھ وغیرہ بھی حروف تہجی کا حصہ بن گئے۔ یہ اثرات باہمی تھے، چنانچہ اردو کی مانند ہندی میں بھی ان حروف کا اضافہ کیا گیا مگر یوں کہ جو صوت جس طرح ادا ہو سکے اسے اسی طرح ادا کیا، اس کا اصل لہجہ متروک کر دیا۔ بھارتی دور درشن کے رسیا اس کی گواہی دے سکتے ہیں جہاں اناؤنسر غزل کو گجل اور غالب کو گالب بنا دیتی ہے۔

ذیل میں اردو اصوات کی جدول درج کی جاتی ہے۔

خالص ہندی کی آوازیں: پھ، بھ، تھ، دھ، ٹھ، ڈھ، چھ، جھ، کھ، گھ، ٹ، ڈ، ڑ، ڑھ۔

ہندی اور عربی فارسی کی مشترک آوازیں: ب، پ، ت، ج، چ، د، ر، س، ز، ش، ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی۔

عربی فارسی کی مشترک آوازیں جو ہندی میں بھی ہیں: ق، خ، غ، ز، ف [۴]۔

اردو حروف تہجی جہاں پر تنوع اصوات کے مظہر ہیں، وہاں س ص، ت ط، ز ذ ض ظ جیسی اصوات کی تکرار بھی ملتی ہے۔ اسی طرح ژ کی صورت میں ایک حرف ایسا بھی ملتا ہے جس کا استعمال اردو کے بہت کم الفاظ میں ہوتا ہے۔ اسی تکرارِ صوت کے نتیجے میں جب کبھی بھی اصلاح زبان اور رسم الخط کی اصلاح کا مسئلہ چھڑا تو یہ ہمیشہ وجہ اعتراض ہوا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے بقول:

"ز ض ظ ط ث ص وغیرہ یہ تمام حروف ہیں۔ صوت نہیں اردو رسم الخط کے لیے ایک طرح سے وبال جان بنے ہیں۔۔۔ صوتی نقطہ نظر سے یہ مردہ لاشیں ہیں جسے اردو رسم الخط اٹھائے ہوئے ہے، اس لیے کہ ہمارا رشتہ عربی سے ثابت رہے۔[۵]

ڈاکٹر مسعود صاحب کا اعتراض بھی دراصل بنیادی سبب بھی ہے اور یہ ختم نہیں ہو سکتا۔

صوتی تفاوت:

جہاں تک اصوات کی درست ادائیگی کا تعلق ہے تو برصغیر کے مختلف علاقوں میں صوتی تفاوت ملتا ہے۔ ایک علاقے کے لوگ کسی مخصوص آواز کی ادائیگی پر قادر نہیں ہوتے جیسے حیدر آباد دکن کے اصل باشندے ق کو خ سے بدل لیتے ہیں۔ پنجابی ق کو ک سے اور اصل لاہوری ر کو ڑ بولتے ہیں۔ برصغیر کی جغرافیائی اور لسانی وسعت کی بنا پر صوتی ہم آہنگی پر مبنی یکساں لہجہ کی برقراری ممکن نہیں۔ تاہم عربی فارسی کے مقابلہ میں اردو اس لحاظ سے بہتر ہے کہ غیر ملکی الفاظ کو اپنے مخصوص لسانی سانچو میں ڈھالنے کی ضرورت پیش نہیں آتی یعنی پ کو ب سے بدل کر معرب بنانے اور ٹ کو ت سے بدل کر مفرس بنانے کی ضرورت نہیں۔ اہل عرب پ کے علاوہ چ ژ گ بھی ادا کرنے پر قادر نہیں جب کہ ان کا ق اور خ درست ادا کرنے کے لیے غیر عرب لوگوں کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑتا ہے۔

غالباً یورپ میں انگریز واحد قوم ہے جو ت نہیں کہہ سکتی جبکہ دیگر یورپین زبانوں میں ٹ کی آواز نہیں ہوتی۔ جرمن میں ٹ کی آواز ڈ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ الغرض اصوات کا یہ تنوع جغرافیائی، تہذیبی اور لسانی حالات کے تحت معرض وجود میں آتا ہے جس سے لسانی بوقلمونی ملتی ہے۔ اسی لیے بعض اصوات کی ادائیگی کی بنا پر ایک زبان کو کسی دوسری زبان پر فوقیت نہیں دی جاتی۔ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"۔

حواشی

۱۔ آریں کو بالعموم ایک خصوص نسل سمجھا جاتا ہے مگر محمد مجیب کی دانست میں ایسا نہیں ہے۔ وہ "تاریخ تمدن ہند" (ص ۳۶۱) میں لکھتے ہیں کہ "آریا نسل کی کوئی ایسی علامت نہیں جس سے وہ پہچانی جا سکے۔ آریا کے لغوی معنی ہیں نیک، شریف، برادری والے۔ یہ دراصل نسل کا نام نہیں۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ ہم اس لفظ کو بالکل چھوڑ دیتے اور ان لوگوں کے لیے جو اپنے آپ کو ہندوستان میں آکر آریا کہنے لگے تھے، کوئی اور نام تجویز کر لیتے لیکن یہ اصطلاح اس قدر رائج ہو گئی ہے کہ اس کو ترک نہیں کیا جا سکتا ہے، اس لیے اس سے کام نکالنا پڑتا ہے۔ غلط فہمی سے بچنے کی یہ صورت ہے کہ ہم یاد رکھیں کہ آریا سب گورے اور قد آور نہیں تھے، سب کی ناک اونچی، بال سنہرے اور آنکھیں نیلی نہیں تھیں۔ انھیں آریا صرف اس بنا پر کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو آریا کہتے"۔

۲۔ بحوالہ "اردو زبان کی قدیم تاریخ" ص ۲۱۰

۳۔ دلی اور لکھنؤ میں مردوں کے مقابلے میں گھریلو خواتین کی زبان زیادہ فصیح سمجھی جاتی تھی جب میر انیس کے بعض الفاظ پر اعتراض ہوا تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے گھر میں اس طرح بولتے ہیں۔

۴۔ ڈاکٹر رام آسرا راز "اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ" ص ۸۸

۵۔ ایضاً ص ۹۲

دوسرا باب

اردو زبان کے نام

ہندی اہندوی:

بقول حافظ محمود شیرانی:

"اردو کا قدیم ترین نام ہندی یا ہندوی ہے"

ہندوستان کی مناسبت سے سب سے پہلے اسے "ہندی" یا "ہندوی" کہا گیا۔ سدھیشوروما کے بموجب: "ہندوی وہ زبان ہے جو شور سینی پراکرت (جو کہ وسطی ہندوستان میں مروج تھی) کی نسل سے ہے۔ جب مسلم حملہ آور ہندوستان میں آئے تو اس وقت شور سینی پراکرت سے ماخوذ شور سینی اپ بھر نش مغربی دہلی اور اس کے گردو نواح میں بولی جاتی تھی۔ ہندی کا ارتقا سات سو سالوں میں ہوا (یعنی ۱۱۰۰ عیسوی سے ۱۸۰۰ عیسوی تک) گیارھویں اور بارھویں صدی کے چند مسلم مورخوں نے ہند کی زبان ہندوی یا ہندی کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ۱۰۲۲ عیسوی میں "طبقات اکبری" کے مصنف نظام الدین نے کالنجر کے راجہ کی مصنفہ چند نظموں کا (جو اس نے ہندوزبان میں تیار کیں) ذکر کیا ہے۔ پہلا مسلمان جس نے ہندوی میں کچھ لکھا، مسعود ابن سعد سلمان تھا جس کا انتقال ۱۱۳۰ کے قریب ہوا لیکن یہ ہندوی یا ہندی مغربی اپ بھر نش کی ایک شاخ تھی غالباً ابھی ہندی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سولھویں صدی سے پیشتر ہندوی کا کوئی بہت وسیع اور معتبر مواد و نمونہ نہیں ملتا"(۱)۔

ابوالفضل نے "آئین اکبری" (جلد ۳ ص ۹۸) میں اکبر کے زمانے میں ہندوستان کی زبانیں گنواتے ہوئے یہ نام لیے ہیں "دہلی، بنگالہ، ملتان، مارواڑ، گجرات، تلنگانہ، مرہٹہ، کرناٹک، سندھ اور افغان شال (جو سندھ اور کابل اور قندھار کے درمیان ہے)، بلوچستان، کشمیر میں رائج ہیں"۔ حافظ محمود شیرانی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "کہ افغان شال سے اس کی مراد پشتو ہے اور "زبان دہلی میں ابوالفضل غالباً اردو یا ہندی کو شامل کر رہا ہے"(۲) اگرچہ خود ابوالفضل نے بھی مختلف مواقع پر زبان کے سلسلے میں ہندی کا لفظ ہی استعمال کیا ہے لیکن "آئین اکبری" کی جلد اول میں اس لفظ کے متنوع استعمالات سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے

کہ اس کے اپنے ذہن میں بھی ہندی کے بارے میں واضح تصور نہ تھا۔ چنانچہ جب وہ دیباچہ میں یہ لکھتا ہے "چونکہ میں نے اپنے دفتر میں بعض مقامات پر ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں (ص ۱۳)" تو ظاہر ہے کہ یہ مروج زبان کے عام اور مستعمل الفاظ کے بارے میں ہے لیکن جب وہ یہ لکھتا ہے: "اہل زبان و زباندان حضرات کا ایک گروہ ہمیشہ ہندی و یونانی و عربی و فارسی زبانوں کی کتابوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرتا ہے" (ص ۱۹۱) تو یقیناً یہاں اس کے ذہن میں سنسکرت ہے کیونکہ ہندی سے ترجمہ کی گئی کتابوں کے سلسلے میں اس نے مہابھارت اور رامائن کا نام لیا ہے۔ جب وہ مختلف مواقع پر قدیم علوم اور فنون کے ضمن میں "ہندی حکما" (ص ۵۴۷) یا "ہندی حکیم" (جلد دوئم ص ۲۰) لکھتا ہے تو اس وقت بھی اس کے ذہن میں قدیم سنسکرت مصنفین ہوتے ہیں۔ اسی طرح "ہندی تاریخ" (ص ۵۴۸) کا عنوان قائم کر کے جو کچھ لکھا، وہ در حقیقت اسطور سازی کے بارے میں ہے۔ الغرض! اردو زبان کے ہندی نام کے بارے میں ابوالفضل کی سند کوئی اتنی معتبر نہیں۔ البتہ "آئین اکبری" کی بدولت لاتعداد ایسے الفاظ محفوظ ہو گئے جو آج بھی یا تو جوں کے توں بولے جاتے ہیں یا ان میں لہجہ یا املا کا معمولی سا تغیر ہوا۔ اسی سے حافظ محمود شیرانی نے یہ استدلال کیا کہ "ابوالفضل جس زبان کو زبان ہندی و زبان روزگار کہہ رہا ہے، اس سے اس کی مراد یہی اردو زبان ہے"[۱۰]۔

مغل ہندو اور ہندوی:

بابر اور ہمایوں کو ہندوستان میں امن اور سکون سے رہنا نصیب نہ ہوا کہ سلطنت کی بنا استوار ہو رہی تھی لیکن اکبر اعظم کا دور اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ برصغیر کے مخصوص تمدنی اور مذہبی حالات کی روشنی میں اپنائی گئی حکمت عملی سے مغل سلطنت کی مضبوطی اور مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس کی حدود میں بھی وسعت ہوئی۔ سیاسی امور سے قطع نظر، تہذیبی، تمدنی اور اسی لیے لسانی اعتبار سے بھی، عہد اکبر بے حد اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس دور میں مختلف علاقوں کے باشندے اپنی اپنی زبانیں اور کلچر لیے مغل پرچم تلے اکٹھے ہو گئے اور یوں ان مشترک تہذیبی اقدار کی اساس استوار ہوئی جن کے نتیجے میں گنبد پر کلس بنایا گیا اور ہندو شاعر نعت اور منقبت کہنے لگے[۱۱]۔

اس تہذیبی سنگم کی تشکیل میں صوفیائے کرام کی انسان دوستی اور رواداری نے اہم

کروار ادا کیا۔ چنانچہ "اردو زبان ہندوستانی کلچر اور صوفیائے کرام" کے مصنف نثار احمد فاروقی کے بموجب ہجکری "دراصل "ذکر ہی کی ہندی شکل ہے۔ چشتی صوفیا کی خانقاہوں میں قوالی کی محفل میں ہجکریاں گائی جاتی تھیں، اسے کسی حد تک موجود ٹھمری کی بندش سے سمجھا جاسکتا ہے"۔(۵)

جہانگیر اور پھر شاہجہاں کے عہد میں ایرانی، ترکی اور ہندی کلچر کے امتزاج نے مصوری، رقص، موسیقی اور تعمیرات میں جو جمالیاتی اضافے کیے، وہ پر تنوع ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیبی اعتبار سے دور رس نتائج کے حامل بھی ثابت ہوئے۔ اس عہد میں برصغیر کے مختلف تمدنی رویوں اور تہذیبی روایات نے خارجی (یعنی فارسی، ترکی اور عربی) اثرات کو جذب کرکے جس نئے تہذیبی تناظر کی تشکیل کی، تاج محل، اردو زبان اور غزل اس کی اہم ترین عطائیں اور یہی آج سلطنت مغلیہ کی علامات قرار دی جاسکتی ہیں۔

جہانگیر کے عہد تک اردو زبان کے خط و خال نمایاں ہو رہے تھے بلکہ حافظ محمود شیرانی نے تو "تزک جہانگیری" کے کئی واقعات اور متعدد الفاظ کی بنا پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ "ان میں سے اکثر الفاظ آج بھی اردو زبان میں مستعمل ہیں۔ اس لیے ہم اس قیاس کے ترتیب دینے میں حق بجانب ہیں کہ یہ زبان جس کے ذخیرے سے جہانگیر بادشاہ یہ لفظ دے رہا ہے، اردو ہے اور اردو ان ایام میں دربار اور اردوئے شاہی میں بولی جارہی ہے"۔(۶)

حافظ محمود شیرانی نے اس ضمن میں معاصر شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "اردو زبان مغل دربار میں ابتدا سے ہی موجود ہے۔ اس زبان کے سینکڑوں الفاظ مغلیہ مؤرخین نے اپنی فارسی تاریخوں میں استعمال کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان ان ایام میں اگرچہ تحریر میں نہیں آئی ہے لیکن مسلمانوں کے روزمرہ کی بول چال میں "ملازموں "گھر کی عورتوں، مسافروں، پیشہ وروں ہندوں اور غیر اقوام کے ساتھ برابر استعمال میں آ رہی ہے۔ اردو کے تحریری نمونے جو اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں، آج دستیاب نہیں ہوتے اور نہ ان ایام میں اس زبان میں شعروادب پیدا کرنے کی کوشش کی گئی البتہ گاہے ماہے بعض اہل قلم نے جو کچھ لکھا ہے مثلاً بابر کا شعر، جمالی اور نوری کے ریختے، سید مبارک اور علامہ سعد اللہ خان کے فقرے اور سب سے آخر میں محمد افضل کی بکٹ کہانی ہے جو ہمارے سامنے ان ایام کی اردو نمونے پیش کرتی ہے"۔(۷)

زبان کی تشکیل کے ضمن میں برصغیر کی وسعت کے ساتھ یہ امر بھی ذہن نشین رکھنا

جائے کہ جغرافیائی حالات اور طویل فاصلوں کی بنا پر تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے بعض علاقے ایک دوسرے سے اتنے دور تھے گویا جداگانہ ملک ہوں۔ کشمیر، پنجاب، بہار، مدارس، بنگال اور مہاراشٹر وغیرہ، سب ایک ملک کے حصے ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت میں چھوٹے چھوٹے ممالک محسوس ہوتے ہیں لیکن صرف اردو ہی ایسی زبان تھی جو ان میں رابطہ کا ذریعہ بنی۔

قدیم ہندی کے مختلف نام:

شمالی اور جنوبی ہندی کو جس طرح کوہ بندیاچل نے الگ کیے رکھا، اس سے فطری طور پر برصغیر دو جداگانہ خطوں میں تقسیم ہوگیا جس کے نتیجہ میں تمدنی اقدار میں اساسی نوعیت کا اتنا بعد پیدا ہوگیا کہ آج بھی ایک دھرم کا ہونے کے باوجود شمالی اور جنوبی ہند کا ہندو الگ الگ نظر آتا ہے۔ جب آج یہ حال ہے، تو قدیم زمانے میں ان علاقوں کے جداگانہ تمدن اپنانے کی وجوہات سمجھنی دشوار نہیں۔ اس تناظر میں زبان کا مطالعہ کرنے پر تشکیلی مراحل میں اس کے ابتدائی نقوش کی تلاش سے وابستہ دشواریوں کا باسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اردو کے ہندی نام کے سلسلے میں بھی یہی دشواری پیش آتی ہے کیونکہ ہر خطے نے اسے اپنے کام کی مناسبت سے نیا نام دے دیا مثلاً دکن میں اسے دکنی کہا گیا تو گجرات میں گجراتی۔ گجری یا بولی گجرات۔ یہ نئی زبانیں نہ تھیں بلکہ مقامی نام اپنائے ہوئے اردو ہی تھی جس کے ان علاقوں میں فروغ کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:۔

> "مشترک کلچر کے لیے رابطے کی ایک مشترک زبان چونکہ ایک بنیادی شرط ہے، دکن و گجرات کی ان مختلف زبانوں کے علاقے میں اردو زبان کی حیثیت ایک مشترک بین الاقوامی زبان کی تھی اور آبادی کے مختلف عناصر کے درمیان اس کو استعمال کیے بغیر کوئی اور راستہ نہ تھا، اس لیے یہ زبان یہاں خوب پھلتی پھولتی رہی"(۸)۔

ہندوی، قدیم اردو کا مقبول نام رہا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بعض ماہرین کی دانست میں یہ صرف اس زبان کے استعمال کے لیے مخصوص نہیں رہا جسے ہم اردو کہتے ہیں بلکہ مختلف اوقات میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کی بولیاں (جیسے کھڑی بولی، گجری، دکنی یا گجری وغیرہ) اس نام سے موسوم کی جاتی رہی ہیں بلکہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تو ہندوی کے

اردو سانچے میں ڈھلنے کے زمانہ کی تخصیص بھی کر دی ہے۔ انھوں نے اپنی "تاریخ ادب اردو" (جلد اول) میں جنوبی ہند میں بیجاپور کے عادل شاہی دور حکومت (۱۶۵۸ء تا ۱۳۹۵ء) میں سلطان محمد عادل شاہ (۵۶ - ۱۶۲۷ء) میں ۳۰ - ۱۶۷۲ء میں کی گئی تحقیقات کے لسانی تجزیہ کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

"اس دور کا اہم اور بنیادی رجحان یہ ہے کہ فارسی اثرات بیجاپور کے ہندوی اسلوب پر تیزی سے غالب آ رہے ہیں اور ہندوی اصناف و اوزان کی جگہ فارسی اصناف و بحور، رمزیات و تراکیب اور اسالیب بیان لے رہے ہیں" (ص ۲۳۴)۔

جب یہ طے پا گیا کہ مختلف علاقوں میں مختلف ناموں کے باوجود بھی اردو ہندوی یا ہندی تھی، تو پھر کونسی زبان ہندی ٹھہری؟ ڈاکٹر رام آسرا راز کے الفاظ میں "انیسویں صدی عیسوی سے پہلے ہندی کسی بھی مخصوص زبان کا نام نہ تھا۔ ملک کے مختلف علاقوں، صوبوں بلکہ ان کے مختلف ضلعوں میں بولی جانے والی بولیوں اور زبانوں مثلاً پنجاب کے علاقہ ملتان میں لہندا، سندھ میں سندھی، لاہور میں لاہوری آگرہ اور متھرا کے علاقے میں برج بھاشا اودھ کے دیہات میں اودھی یا پوربی حصار رہتک میں ہریانی، بگھیل کھنڈ میں بگھیل کھنڈی، کانپور میں فتح گڑھ اٹاوہ، بریلی، علی گڑھ کے گرد و نواح میں قنوجی بنارس، غازی پوری آرہ وغیرہ میں بھوج پوری، بندھیل کھنڈ میں بندھیل کھنڈی، اجین میں اجینی۔ مارواڑ میں مارواڑی بیکانیر میں بیکانیری۔ جے پور میں جے پوری۔ بہار اور پٹنہ میں مگدھی وغیرہ سبھی ہندوستان کی بولیوں اور زبانوں کی نسبت سے ہندی کہلاتی تھیں۔ اردو کی بنیاد بھی چونکہ ہندوستان کی ہی بولیاں تھیں، اس نسبت سے اردو بھی ہندی کے نام سے موسوم کی جاتی تھی"[9]۔

ڈاکٹر راز کے بقول عرف عام میں ہندی صرف دو ہی بولیوں کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ پہلی برج بھاشا جو شری کرشن کی سرزمین متھرا اور اسکے گرد و نواح میں بولی جاتی تھی، دوسری اودھی جو اودھ کے راجہ شری رام چندر جی کی راجدھانی اجودھیا کی بولی ہے۔۔۔۔۔ ہندوی کے مذہبی نقطہ نظر سے یہ دونوں بولیاں بہت مقدس سمجھی جاتی ہیں"[10]۔

شاید اسی لیے میر نے یہ کہا:۔

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرور قلب
آیا نہیں ہے لفظ یہ ہندی زبان کے بیچ

الفرڈ ماتیر لندن کا ایک مضمون "اردو کی ابتدا" اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ کس کس نے سب سے پہلے اردو کے مختلف ناموں میں امتیاز کیا۔ ان

کے بقول کول بروک پہلا شخص ہے جس نے ۱۸۰۱ عیسوی میں ہندی اردو اور عوامی ہندوستانی میں فرق کیا۔ اس سے قبل ۱۷۸۷ء میں گلکرسٹ ہندوستانی کے الفاظ کو عربی، فارسی اردو اور ہندوی میں تقسیم کر چکا تھا۔ کھڑی بولی کا (ادبی) اظہار ۱۸۰۳ء عیسوی میں ہوتا ہے اور ۱۸۱۱ء عیسوی میں للولال جی کوی اس کو بے میل ہندی قرار دیتے ہیں اور اس کا مقابلہ ریختہ یا اردو سے کرتے ہیں "مصنف اپنی بات جاری رکھتے ہوئے استدلال کرتا ہے" ہندوی کے متعلق یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ ایک شہر میں پیدا ہوئی مثلاً قنوج میں جیسا کہ کول برک نے کہا ہے، دہلی میں جیسا کہ گریرسن نے کہا ہے یا لاہور میں جیسا کہ گراہم بیلی نے کہا ہے اور نہ وہ برج سے پیدا ہوئی جیسا کہ للولال جی نے رائے ظاہر کی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ قرین حقیقت ہے کہ وہ آریائی ہندوستان کے تمام شہروں میں پیدا ہوئی۔ اس کی لفظی ساخت یکساں تھی اور اس کے ذخیرہ الفاظ میں مقامی بولیوں کی آمیزش تھی۔ اصل میں یہ کاروبار کی زبان تھی جیسا کہ ڈاکٹر سینتی کمار چڑجی نے کہا ہے۔ گریرسن نے جس مقامی زبان ہندوستانی کا ذکر کیا ہے، وہ اردو کی بنیاد نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کے رہنے اور بسنے کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی اور اس کو یہ شرف تیرھویں صدی تک حاصل رہا اور وہ اسی طرح ممتاز اور ممیز تھی جیسے کہ بعد میں ہندوی اشارہ دیش بھاشاؤں میں ممتاز ممیز ہو گئی۔ اگرچہ یہ نام پراکرت اور بھاشا کی طرح بہت عرصے تک بغیر کسی قید اور تعین کے ہر بولی کے لیے استعمال ہوتا رہا[۲۱]۔

خسرو مشترک لسانی کلچر کی علامت:

امیر خسرو نے مثنوی "نہ سپہر" میں جہاں ہندوستان کی متعدد خصوصیات کا تذکرہ کیا وہاں اس امر پر بطور خاص زور دیا کہ دیگر زبانیں بولنے والے افراد یہاں کی ہندی نہیں بول سکتے لیکن ہندوستانی تمام زبانیں بولنے پر قادر ہیں:

> خطائی، مغل، ترک عرب کے سب کے سب ہندی زبان میں دوختہ لب ہیں:
> ہم (ہندوستانی) نہایت راستی سخن کے ساتھ ہر ملک کے لوگوں کی بولیاں بول لیتے ہیں اور اس خوبی کے ساتھ کہ جس طرح چرواہا اپنے جانوروں کی شناخت اور رہنمائی کرتا ہے۔ یہ مثل اس لیے صادق آتی ہے تاکہ ہم دوسرے ملکوں کا سفر کر سکیں۔ (اور وہاں کی باتیں آسانی سے بول سکیں) دوسروں میں یہ طاقت نہیں ہے کہ کبھی اس توانائی (صحت کے ساتھ) اس جانب نگاہ کر سکیں...[۲۲]

اس کے بعد ایک مقام پر یہ عنوان قائم کیا ہے:
"اس مثبت دلیل میں کہ گفتگو ہند (زبان) ہندی کو اپنے خوشگوار الفاظ کی بنا پر ترکی و فارسی زبان پر ترجیح ہے" (ترجمہ محمد رفیق عابد)
امیر خسرو نے اپنے دیوان "غرۃ الکمال" (۶۹۳ھ) کے آخر میں لکھا ہے:

چو من طوطی ہندم ار راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

اسی دیوان کے دیباچہ میں وہ مزید رقمطراز ہیں:

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم چو آب
شکرِ مصری، نہ دارم کز عرب گویم سخن
"جزوے چند نظم ہندوی نیز نذر دوستاں
کردہ شدہ است انجاہم بہ یگوی
بس کردم و نظر برنداشت کہ لفظ ہندوی
درپارسی لطیف آوردن چنداں لطفی
ندارد مگر بضرورت آں جا کہ ضرورت
بودہ است آوردہ شدہ۔"

امیر خسرو کی مثنوی "نہ سپہر" کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس میں ایک مقام پر انھوں نے ہندوستان میں مروج زبانوں کا تذکرہ یوں کیا ہے:

سندی و لاہوری و کشمیر و کبر
دھور سندری تلنگی و گجر
معبری و گوری و بنگال و اودھ
دہلی و پیرا مشی اندر ہمہ حد
این ہمہ ہندوست ز ایام کہن
عامہ بہ چہ کارست بہ ہر گونہ سخن

اس ضمن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس رائے کا اظہار کیا ہے:
ان اشعار میں امیر خسرو نے جن بارہ زبانوں کا ذکر کیا ہے، پانچویں مصرعے میں ان سب کو ہندوی کہا ہے۔ گویا خود امیر خسرو کی زبان دہلی کا

باشندہ ہونے کے ناطے "دہلوی ہندوی" ہوئی جو اس فہرست کی بارھویں زبان ہے اور جس کو خسرو دہلی اور پیرامنش دہلی کی زبان بتاتے ہیں۔ گویا امیر خسرو نے جس ہندوی اردو یا ہندوستانی میں شعر کہے ہیں، انکو "دہلوی ہندوی" سمجھنا چاہیے"[۱۳]۔

ان زبانوں کی تفصیل یوں ہے سندی (سندھی)، لاہوری (پنجابی)، کشمیر (کشمیری) کبر (ڈوگری)، دھور سمندری (تامل) تلنگی، گجر (گجر، گجراتی) معبر (گھائی) گوری (بہارمی)، بنگال (بنگلہ)، اودھ (اودھی)، دہلی (ہندوی)۔

مثنوی "نہ سپہر" میں امیر خسرو نے ہندوی کے ضمن میں یوں لکھا:

"ہند کی زبانوں پر بھی اس قاعدہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ پرانے زمانے میں یہ ہندوی زبان کہلاتی تھی-------- غوریوں اور ترکوں کی آمد ہوئی تو ان کی ظاہری، باطنی زبان فارسی تھی------ جب اہل ملک کے چھوٹے بڑے ان سے گھل مل گئے تو ہر شخص نے اچھی بری فارسی سیکھ لی------- اور اس کے علاوہ جو زبانیں یہاں تھیں وہ اپنی حدود سے باہر (یعنی علاقوں سے باہر) راہ نہ پا سکیں------ الغرض اگر ہم فارسیوں، ترکوں اور عربوں سے انسباط ولی حاصل کرنے کی کوشش کریں تو لغو ہوگا" ص [۱۴]۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کی دانست میں زبان کے لیے ہندی نام نسبتی ہے "جو مسلمانوں نے ہند (ہندوستان) سے بنایا اور ہندوستان کی دیسی یا مقامی زبان کے لیے استعمال کیا ہے، اس لیے آج جو لوگ اس لفظ سے ہر جگہ صرف ایک ہی مخصوص بولی مراد لیتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ مسعود سعد سلمان کے ہندی دیوان کی بولی امیر خسرو کی ہندی سے اور ملک محمد جائسی کی ہندی امیر خسرو کی ہندی سے مختلف زبان ہے"[۱۵]

میر اثر نے اپنی مثنوی خواب و خیال (۱۱۵۳ھ) میں جہاں اپنی زبان کو ریختہ کہا ہے، وہاں ہندوی بھی کہا ہے ملاحظہ ہو یہ شعر:

فارسی سو ہیں ہندوی سو ہیں
باقی اشعار مثنوی سو ہیں

میر تقی میر نے اپنا تذکرہ نکات الشعر "۱۱۶۲ھ" میں مکمل کیا تو ترقیمہ میں یوں لکھا:

"تمام شد نکات الشعرا ہندی"[۱۶]

ڈاکٹر سہیل بخاری نے "اردو کا روپ" میں متعدد ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں ہندی اور ہندوی نام کی جو مثالیں جمع کی ہیں، ان میں سے بعض پیش ہیں: شاہ عبدالقادر دہلوی نے قرآن مجید کے ترجمے کو "زبان ہندی میں" قرار دیا۔ میر نے تذکرہ "نکات الشعرا" میں سودا کے لیے لکھا ہے:

سر آمد شعرائے ہندی اوست

جبکہ میر حسن اردو شعرا کے تذکرے کو "تذکرہ سخن آفرینان ہندی گویاں" کہتے ہیں۔ اسی طرح مصحفی نے تذکرہ "ریاض الفصحا" کو "تذکرہ ہندی گویاں" سمجھا ہے جبکہ ڈاکٹر گلگرسٹ کی دو کتابوں کے نام "بیاض ہندی" اور "اتالیق ہندی" ہیں۔ وہ مزید رقم طراز ہیں کہ عرب والے ہندوستان کی ہر بولی کو ہندی یا ہندیا کہتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ اہل عرب یہاں کی قدیم زبانوں میں سے ہر ایک کو ہندی یا ہندیا کہتے تھے، وہ سنسکرت یا پالی، سندھی، ملتانی، گجراتی سب کو ہندی ہی کہتے تھے ("عجائب الہند" ص ۳)

ڈاکٹر سہیل بخاری نے ہندوی کے ضمن میں یہ لکھا ہے: یہ بول ہندی ہی کا بدلا ہوا روپ ہے جس میں واو نے ہمزہ کی جگہ لے لی ہے۔ یعنی ہندوی ہند + وی (ای) اردو میں ایسے اور بھی بول پائے جاتے ہیں جیسے منتری اور منتوی، ہندھی یا ہندوی کھندھی اور کھنڈوی۔ اندھی اور اندوی۔ گرہی اور گڑوی جن کے ایک روپ میں ہمزہ اور دوسرے روپ میں واو ملتا ہے"۔

ہندوستانی:

جب انگریزوں کی سیاسی (اور کسی حد تک لسانی) پالیسی کے نتیجے میں نفاق کے بوئے ہوئے بیج کانٹوں بھری فصل لائے تو اگر ایک طرف ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہوا اور نسلی اور مذہبی فسادات عام ہوئے تو دوسری طرف بعض رہنماؤں نے دیگر امور کے ساتھ ساتھ زبان کے اشتراک سے اس نفاق کو اتحاد میں تبدیل کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے اردو اور ہندی دونوں ترک کر کے ہندوستانی اپنانے کی تلقین کی گئی۔ مہاتما گاندھی اس کے پرچارک تھے، پریم چند اس کے حامی تھے۔ انھوں نے ایک مضمون "اردو ہندی ہندوستانی" (زمانہ ۱۹۳۵ء) میں بڑے پرجوش انداز میں لکھا:

"اردو اور ہندی کی نوعیت جدا ہے۔ یہاں تو دونوں ہی ہندوستان کی قومی

زبان کہلانے کی مدعی ہیں مگر چونکہ اپنی انفرادی صورت میں وہ قومی ضرورتوں کی تکمیل نہ کر سکیں اس لیے اضطراری طور پر خود بخود ان کے استحصال کا عمل شروع ہو گیا اور وہ متحدہ صورت پیدا ہو گئی جسے ہم ہندوستانی زبان کہنے میں حق بجانب ہیں۔۔۔۔ جس طرح انگریزوں کی زبان انگریزی۔ جاپان کی جاپانی۔ چین کی چینی، اسی طرح ہندوستان کی قومی زبان کو اسی وزن پر ہندوستانی کہنا مناسب ہی نہیں بلکہ لازمی ہے۔ اگر اس ملک کو ہندوستان نہ کہہ کر صرف ہند کہیں تو اس کی زبان کو ہندی کہہ سکتے ہیں لیکن اس کی زبان کو اردو تو نہیں کہا جاسکتا تاوقتیکہ ہم ہندوستان کو اردوستان نہ کہنے لگ جائیں جو اب ممکنات سے خارج ہیں۔۔۔ بہرحال ہندوستان کی قومی زبان نہ اردو ہے نہ ہندی بلکہ ہندوستانی ہے جو سارے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے اور بڑے حصے میں بولی جاتی ہے لیکن لکھی کہیں نہیں جاتی اور اگر کوئی لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اردو اور ہندی کے ادیب ٹاٹ باہر کر دیتے ہیں"[۴۷]۔

زبان کے لیے "ہندوستانی" نام کے سیاسی حضرات کے لیے ملاحظہ ہو۔ "قو... پاکستان" کراچی جنوری ۱۹۸۵ء کا شمارہ جس میں ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، باب... جندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، آصف علی خان اور مدیر ڈاک... فرمان فتح پوری کے مقالات شامل ہیں۔

اگر اردو زبان کو ہند[۴۸] کی نسبت سے ہندی[۴۹] یا ہندوی کہا جاسکتا ہے تو پھر یہ کیس... ممکن تھا کہ ہندوستان کی مناسبت سے اسے "ہندوستانی" نہ کہا جاتا۔ قدیم کتب کا جائزہ لی... پر ہندوستانی نام کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں جن میں سرفہرست "تزک بابری" ہے ب... رقمطراز ہے:

> "میں نے اسے (دولت خان لودھی کو) اپنے سامنے بٹھایا اور اس کو پکا یقین دلانے کے لیے ایک شخص کے ذریعے جو ہندوستانی زبان جانتا تھا ایک ایک جملے کا مطلب واضح کروایا"[۵۰]۔

گولکنڈہ کے قطب شاہی عہد کے ملا وجہی کی "سب رس" (۱۶۵۳ء/۱۰۳۵ء) استعمال ... "ہندوستانی" کے سب سے معروف حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وجہی نے اس مش... تمثیلی قصے کا عنوان یوں قائم کیا تھا۔ "آغاز داستان زبان ہندوستان"

اور کہانی کا آغاز یوں کیا:

"نقل ایک شہر تھا اس کا ناو سیستان"

اردو کو ہندوستانی کہنے کی یہ مثال قدیم بھی ہے اور معروف بھی لیکن میری ناقص رائے میں اسے بطور مثال پیش کرنے والے محققین اور ماہرین لسانیات نے وجہی کی اس عبارت کو اس کی ظاہری حالت میں تسلیم کر لیا یعنی مصنف کی "نیت" پر غور نہ کیا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ "سب رس" مقفیٰ اور مسجع اسلوب میں قلم بند کی گئی تھی، اس لیے یہ شبہ ہوتا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ داستان اور سیستان کی رعایت سے اس نے زبان ہندوستان کہہ دیا ہو جیسے اس نے "سب رس" کی توجیح کی، یہ کہہ کر:

"اس کتاب کا ناو سب رس سب کو پڑھنے آوے
ہور بول بول کوں چڑھے آس یادگار ہو اچھے
گا و دنیا میں کئی لاکھ برس"۔

اس قیاس کو اس امر سے مزید تقویت ملتی ہے کہ ملا وجہی نے ایک اور موقعے پر زبان کے لیے ہندی کا لفظ بھی استعمال کیا ہے:

"آج لگن اس جہان میں ہندوستان
میں ہندی زبان سوں اس لطافت اس
چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر
گلا کر نہیں بولیا"۔

ادھر جب شمالی ہند میں اردو کی پہلی نثری کتاب فضلی کی "کربل کتھا" (دہ مجلس: ۱۱۳۵ھ/۱۷۳۲-۳۳ء) لکھی گئی تو فضلی نے اپنے اس ترجمے "انوار سہیلی" از ملا حسین بن علی الواعظ الکاشفی کو ہندی قرار دیا:

"یہ ترجمہ فارسی کا ہندی
از فہم وو کائے ہوش مندی"(۲۱)

انھوں نے ترجمہ کی وجہ بتاتے ہوئے لکھا کہ انوار سہیلی فارسی میں تھی اور فارسی سے نابلد خواتین مطالب نہ سمجھ پائیں اور رونے کے ثواب سے محروم رہتیں اس لیے انھوں نے اس کا ترجمہ کیا وہ لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔۔ اگر ترجمہ اس کتاب کا برنگین

عبارت و حسن استعارات ہندی قریب
الفہم عامہ مومنین و مومنات کیجیے"
انھیں اس ترجمے پر فخر ہے:
"پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں
ہوا مخترع لو اب تک ترجمہ فارسی
بہ عبارت ہندی نہیں ہوئے" ۔ ص[۲۲]
اسی طرح نظر ثانی (۱۱۶۱ھ) کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا:
"نظر ثانی کر بجمیت و کیفیت مضامین
بہ ہندی ...."[۲۳]

بہر حال وجہی کی سب رس سے قطع نظر ہندوستانی نام کے ضمن میں ڈاکٹر سہیل بخاری نے مختلف کتابوں کی مدد سے جو شواہد جمع کیے ہیں، ان کی رو سے:

۱۔ یہ نام سب سے پہلے عبدالحمید لاہوری کے "بادشاہ نامہ" کی دوسری جلد میں ملتا ہے۔ اس میں شاہ جہاں کے درباری گویے مغل خان کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے "دریں عہد سعادت مہر سر آمد نغمہ سرائیاں، ہندوستان زبان است"۔

۲۔ نواب صدر جنگ بہادر کہتے ہیں "سب سے پہلے پرتگیزوں نے سترویں صدی عیسوی میں ہماری زبان کا نام ہندوستان رکھا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مسلمان مور کہلاتے تھے۔ اسی صدی میں زبان کو انڈوستانی بول جاتے تھے، مور بھی کہہ دیتے تھے۔ ۱۶۹۷ھ میں ہندوستانی زبان (Hindostani Language) کا لفظ پایا جاتا ہے۔ ۱۷۲۶ء میں ایک مورخ لکھتا ہے "یہاں کی (ہندوستانی) زبان ہندوستانڈ "Hindostand" یا مورز ہے۔"

۳۔ گلکرسٹ نے اپنی ڈکشنری کا نام انگریزی ہندوستانی رکھا ہے۔

۴۔ میر امن باغ و بہار کے دیباچے میں کہتے ہیں "جان گلکرسٹ صاحب نے.... فرمایا کہ قصے کو ایسی ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان عورت مرد لڑکے بالے خاص و عام آپ میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو"

۵۔ گارسن دتاسی بھی اسے ہندوستانی کہتا ہے "حضرات لفظ ہندوستانی جیسا کہ میں متعدد بار آپ سے عرض کر چکا ہوں...."

۶۔ گریرسن نے بھی اس بولی کو ہندوستانی کہا ہے[۲۴]۔

الغرض اس انداز کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ طوطی کی اشتقاقی مثال سے قطع نظر، زبان کے لیے لفظ "ہندوستانی" غیر ملکیوں نے ہی استعمال کیا کیونکہ یہ یورپین زبانوں (انگریزی، فرانسیسی یا ڈچ) کے مزاج کے عین مطابق تھا بلکہ اویس احمد ادیب نے تو یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اردو زبان کے لیے سب سے پہلے "ہندوستانی" لفظ گلکرسٹ نے ۱۷۸۷ء میں استعمال کیا تھا[۲۰]۔

لیکن حقیقت برعکس ہے کہ گلکرسٹ سے بھی قدیم تر شواہد پیش کیے جا چکے ہیں، اس لیے اس ضمن میں اس کی روایت تسلیم نہیں کی جا سکتی حالانکہ گلکرسٹ کے اپنے بیانات سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ نام اسی کی ایجاد ہے جیسا کہ اس نے "قصص ہند" کے دیباچے میں لکھا:

"میں نے ہندوستانی کی تعریف یہ کی کہ وہ ایسی زبان ہے جس میں ہندی عربی اور فارسی کی آمیزش برابر تناسب سے ہو"

گلکرسٹ ۱۷۹۶ء میں "ہندوستانی گرامر" کلکتہ سے طبع کرا چکا تھا۔

اردو کے لیے "ہندوستانی" نام کے ضمن میں مزید شواہد پیش کیے جاتے ہیں:

کپتان جوزف ٹیلر کی مدون کردہ ڈکشنری جب ۱۸۰۸ء عیسوی میں چھپی تو اردو کو "Hindoostance" قرار دیا گیا۔ جان شکسپئر نے بھی اپنی لغت کو "Hindustani and english" کہاں جبکہ دیباچے میں اس نے اردو کو ہر جگہ "ہندوستانی" لکھا ہے۔ ڈاکٹر ہیرس "Haris" بھی یہی لکھتا ہے۔ ملاحظہ ہوں اس کی یہ دو ڈکشنریاں۔

1. Dictionary English and Hindostany (Madras: 1790)
2. An Introduction to the study of the Hindostany language as spoken in the larnatic (Madras : 1929)

اسی طرح جان جوشوا کیٹلر کی قواعد (۱۷۱۵) اور شلز کی قواعد (۱۷۴۵) میں بھی اردو کو "ہندوستانی" ہی کہا گیا ہے۔

اردو کے لیے "ہندوستانی" نام انگریزوں کو بہت مرغوب رہا ہے۔ مندرجہ بالا تمام حوالے تو ڈیڑھ دو صدی پرانے ہیں جبکہ امور قواعد اور لغت کے بارے میں نہ تو اساسی نوعیت کا مواد موجود تھا اور نہ ہی کسی کو لسانی تحقیقات کی شد بد تھی، اس لیے جس نے جو کچھ لکھ دیا وہ اگر سند نہ بنا تو بر بنائے قدامت، حوالہ تو ضروری ہی قرار پا گیا۔ تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انگریزی میں مختصر تاریخ ادب اردو کا مولف ڈاکٹر گراہم بیلی اپنی

وفات ۱۹۴۲ء تک اردو کو ہندوستانی ہی لکھتا رہا۔ اس کے انتقال کے بعد Teach your self Hindostany (۱۹۵۰) طبع ہوئی ہے۔ جی نہیں بلکہ اس کے کاغذات سے اس کتاب کو ترتیب دینے والے مرتبین پروفیسر جے۔ آر۔ فرتھ (Prof. J. R. Firth) اور اے۔ ایچ۔ ہارلے (A. H. Harley)[۲۴] نے بھی دیباچے میں ہر موقعے پر "آج کی دنیا کی عظیم زبانوں میں سے ایک زبان کو ہندوستانی لکھا ہے (دیباچہ از قلم جے۔ آر۔ فرتھ) لیکن جب وہ رسم الخط کی بات کرتا ہے تو Urdu Script لکھتا ہے۔

اب جب کہ جدید دور کے انگریز مصنفین کا تذکرہ ہو رہا ہے تو ایک اور کتاب کا ذکر بھی سن لیجیے جس میں اردو کو واقعی اردو ہی کہا گیا ہے یہ ہے:

A text Book of Urdu Prosody and Rhetoric"

By Capt. G.o. Pybus (London, 1924)

ریختہ:

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالب کا یہ مشہور شعر سب نے سن رکھا ہے اور اسے بالعموم اس امر کی شہادت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں اردو کو ریختہ بھی کہتے تھے اور یہ نام عہد غالب تک مستعمل بھی تھا۔ ریختہ کے ضمن میں غالب کا ایک اور شعر بھی پیش کیا جا سکتا ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ریختہ کی تعریف پر غور کرتے ہوئے اس کے عمومی مفہوم کے ساتھ اردو کے قدیم نام کے طور پر اس کا مطالعہ کیا جائے تو دلچسپ صورت حال نظر آتی ہے۔

حافظ محمود شیرانی کی تحقیقات سے یہ احساس ہوتا ہے کہ بابر کے زمانے سے ہی اردو فارسی اور ترکی زبانوں کی آمیزش یعنی ریختہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بابر کا ترکی زبان کا یہ شعر نقل کرنے کے بعد اس کے بارے میں ڈاکٹر ڈینی سن راس کی رائے بھی درج کی ہے:

"مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا بلیغہ بس بولقدر پانی و روتی

الغرض اس انداز کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ طلاوہی کی استثنائی مثال سے قطع نظر، زبان کے لیے لفظ "ہندوستانی" غیر ملکیوں نے ہی استعمال کیا کیونکہ یہ یورپین زبانوں (انگریزی، فرانسیسی یا ڈچ) کے مزاج کے عین مطابق تھا بلکہ اویس احمد ادیب نے تو یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اردو زبان کے لیے سب سے پہلے "ہندوستانی" لفظ گلکرسٹ نے ۱۸۸۷ء میں استعمال کیا تھا[۲۵]۔

لیکن حقیقت برعکس ہے کہ گلکرسٹ سے بھی قدیم تر شواہد پیش کیے جا چکے ہیں، اس لیے اس ضمن میں اس کی روایت تسلیم نہیں کی جاسکتی حالانکہ گلکرسٹ کے اپنے بیانات سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ نام اسی کی ایجاد ہے جیسا کہ اس نے "قصص ہند" کے دیباچے میں لکھا:

"میں نے ہندوستانی کی تعریف یہ کی کہ وہ ایسی زبان ہے جس میں ہندی عربی اور فارسی کی آمیزش برابر تناسب سے ہو"

گلکرسٹ ۱۷۹۶ء میں "ہندوستانی گرامر" کلکتہ سے طبع کرا چکا تھا۔

اردو کے لیے "ہندوستانی" نام کے ضمن میں مزید شواہد پیش کیے جاتے ہیں:

کیپٹن جوزف ٹیلر کی مدون کردہ ڈکشنری جب ۱۸۰۸ء عیسوی میں چھپی تو اردو کو "Hindoostance" قرار دیا گیا۔ جان شیکسپیئر نے بھی اپنی لغت کو "Hindustani and english" کہا جبکہ دیباچے میں اس نے اردو کو ہر جگہ "ہندوستانی" لکھا ہے۔ ڈاکٹر ہیرس "Haris" بھی یہی لکھتا ہے۔ ملاحظہ ہوں اس کی یہ دو ڈکشنریاں۔

1. Dictionary English and Hindostany (Madras: 1790)
2. An Introduction to the study of the Hindostany language as spoken in the larnatic (Madras : 1929)

اسی طرح جان جوشوا کیٹلر کی قواعد (۱۷۱۵) اور شلز کی قواعد (۱۷۴۵) میں بھی اردو کو "ہندوستانی" ہی کہا گیا ہے۔

اردو کے لیے "ہندوستانی" نام انگریزوں کو بہت مرغوب رہا ہے۔ مندرجہ بالا تمام حوالے تو ڈیڑھ دو صدی پرانے ہیں جبکہ امور قواعد اور لغت کے بارے میں نہ تو اساسی نوعیت کا مواد موجود تھا اور نہ ہی کسی کو لسانی تحقیقات کی شدید تھی، اس لیے جس نے جو کچھ لکھ دیا وہ اگر سند نہ بنا تو بر بنائے قدامت، حوالہ تو ضرور ہی قرار پا گیا۔ تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انگریزی میں مختصر تاریخ ادب اردو کا مولف ڈاکٹر گراہم بیلی اپنی

وفات ۱۹۳۲ء تک اردو کو ہندوستانی ہی لکھتا رہا۔ اس کے انتقال کے بعد Teach your self Hindostany (۱۹۵۰) طبع ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے کاغذات سے اس کتاب کو ترتیب دینے والے مرتبین پروفیسر جے۔ آر۔ فرتھ (Prof. J. R. Firth) اور اے۔ ایچ۔ ہارلے (A. H. Harley)[۲۲] نے بھی دیباچے میں ہر موقعے پر "آج کی دنیا کی عظیم زبانوں میں سے ایک زبان کو ہندوستانی لکھا ہے (دیباچہ از قلم جے۔ آر۔ فرتھ) لیکن جب وہ رسم الخط کی بات کرتا ہے تو Urdu Script لکھتا ہے۔

اب جب کہ جدید دور کے انگریز مصنفین کا تذکرہ ہو رہا ہے تو ایک اور کتاب کا ذکر بھی سن لیجیے جس میں اردو کو واقعی اردو ہی کہا گیا ہے یہ ہے:

A text Book of Urdu Prosody and Rhetoric"

By Capt. G.o. Pybus (London, 1924)

ریختہ:

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالب کا یہ مشہور شعر سب نے سن رکھا ہے اور اسے بالعموم اس امر کی شہادت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں اردو کو ریختہ بھی کہتے تھے اور یہ نام عہد غالب تک مستعمل بھی تھا۔ ریختہ کے ضمن میں غالب کا ایک اور شعر بھی پیش کیا جا سکتا ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ریختہ کی تعریف پر غور کرتے ہوئے اس کے عمومی مفہوم کے ساتھ اردو کے قدیم نام کے طور پر اس کا مطالعہ کیا جائے تو دلچسپ صورت حال نظر آتی ہے۔

حافظ محمود شیرانی کی تحقیقات سے یہ احساس ہوتا ہے کہ بابر کے زمانے سے ہی اردو فارسی اور ترکی زبانوں کی آمیزش یعنی ریختہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بابر کا ترکی زبان کا یہ شعر نقل کرنے کے بعد اس کے بارے میں ڈاکٹر ڈینی سن راس کی رائے بھی درج کی ہے:

"مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا بلیغہ بس بولدر پانی و روتی

پہلا مصرعہ تو بالکل صاف ہے جیسے آج کل ہم لکھیں گے"

مجھ کو نہ ہوئی کچھ ہوس مانک و موتی

یعنی مجھ کو لعل اور موتیوں کی آرزو نہیں ہے

دوسرے مصرعے کے معنی ڈاکٹر ڈینی سن راس نے یوں بیان کیے ہیں۔

"فقیروں کے لیے صرف روٹی اور پانی کفایت کرتے ہیں"

ڈاکٹر ڈینی سن راس اپنے دیباچے میں اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس شعر میں ہم اردو اور ترکی زبانوں کا ایک غیر معمولی اتحاد مشاہدہ کرتے ہیں۔ فارسی اور اردو کے مخلوط اشعار ایک زمانے میں نہایت عام تھے جن سے ریختہ کی اصلاح جس نام سے پرانی اردو شاعری معروف ہے رواج پذیر ہوئی"[۲۸]۔

ڈاکٹر ڈینی سن راس نے دیوان بابر رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (۱۹۰۰) میں شائع کرایا تھا۔

بابر اور مغلوں کی اپنی زبان اور اہل ہند پر اس کے اثرات کے بارے میں ماسکو یونیورسٹی کے ایک محقق فال میرزا ئف تاش ہے۔ مرزا کے بموجب "بابر کے زمانے میں وسطی ایشیا کے علوم کی زبان عربی سمجھی جاتی تھی۔ دربار کی زبان فارسی تھی جس میں شعروشاعری ہوتی تھی اور سارا سرکاری کام بھی ہوتا تھا اور کئی بادشاہوں مثلاً بابر کے گھر کی زبان ترکی تھی۔ بابر اور اس کے رفقا فرغانہ کے باشندے ہوتے ہوئے بھی اپنی مادری زبان اچھی طرح جانتے اور بولتے تھے"[۲۸]۔

جہاں تک ریختہ کے لغوی معنی کا تعلق ہے، تو تمام لغات ان پر متفق ملتی ہیں۔ مثلاً سٹین گاس کی "Persian English Dictionary" (لندن طبع اول ۱۸۹۲ء) میں ریختگی، ریختم، ریختن، ریختنی، ریختہ، ریختہ گر، ریختہ گری۔۔۔۔ الفاظ ملتے ہیں، ان میں سے ریختگی کا مطلب Effusion اور ریختم کا چھجہ (یا چھت پر) پشتہ یا مچان ہے۔ ریختنی کے البتہ متعدد معانی ہیں۔

To pour, Infuse, Difuse, To eat, Melt, To scatter, Disperse, Break in pieces, To flow, To fall, Drop, To throw one self down, To lay out in pieces (as meat)
Rekhtani bahar: spring is coming to an end bashri (bar - ari) kase.

Rekhtan: To fall upon, Firo-rekhtan, To pour out, To scatter arestuary, Frith mouth of a river.

ریختگاہ آب در دریا:

ریختنی: A scatter dispersion, Capable of being poured in or injected, anything thrown about on festive occasions (As money flows)

ریختہ: Poured, Spilled, As mess mady by spilling anything, Cast or poured, Scattered, Syrup or medicanal pre-peration from sugar, An egg beat and fried, Morter plaster, A stone house, Easily understoop (As in verse or a meaning)

از ہم ریختہ شدن: To be scattered

زبان ریختہ: A ssixed language, agibberish, Name given to the Hindustani Language.

ریختہ گر: A medjer of brass or copper, one who makes any kind of fusiks works,

ریختہ گری: The art of casting metal

جان رچرڈسن کی فارسی عربی انگلش ڈکشنری (لندن: ۱۸۲۹ء) میں ریختم، ریختن ریختی اور ریختہ گر الفاظ ملتے ہیں اور معانی میں یہ صورت نظر آئی۔

ریختم (زبر کے ساتھ بھی) Earth with which they make plat forms for walking on the tops of houses.

ریختن: To Pour, To Infuse, To difuse, To Cast, Melt, To scatter, Disperse, To Break in pieces, To Flow,

ریختی: A scattering, A dispersion.

ریختہ: Poured, Cast, Or poured Scattered, As your or medicinal preperation from sugar, An egg beat and fried, Morter plaster, A sort of language Formed of the persian And Hindustani mixed in which many poems have been

written, A Stone house.

ریختہ گر: A melter of brass and copper one who makes any kind of fusike work,

جبکہ شیکسپیئر کی لغت (۱۸۳۴ء) میں صرف لفظ "ریختہ" ملتا ہے جسے ریختن سے مشتق بناتے ہوئے یہ معانی لکھے ہیں۔

1. Scattered
2. The Hindustani Language is called rekhtam Being a mixed dilect.
3. A Hindustani ope. 1
4. Morter plaster.

لغات کشوری (۱۸۹۱ء) میں اگرچہ ریختہ تو نہیں ملتا لیکن سے متعلق دیگر الفاظ ملتے ہیں:

ریختن: ڈالنا، پھینکنا، بکھیرنا

ریختہ پا: تیز قدم گھوڑا، خوبصورت۔

ریختہ دم: وہ تلوار یا چھری جس کی دار سخت چیز پر پڑنے سے گر گئی ہو۔

ریختہ گر: قالب میں ڈھال کر برتن بنانے والا۔

ان لغات میں ریختہ اور اس سے متعلق دیگر الفاظ کے متنوع معانی سے جو مفہوم مرتب ہوتا ہے، اسے مولانا محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" کے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

> "مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا، سفیدی وغیرہ ریختہ کرتے ہیں یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہے، گری پڑی پریشان چیز کیونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں (ص ۲۱)۔

مولوی عبدالغفور نساخ نے اپنے رسالہ "زبان ریختہ"[۲۴] میں بھی اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے مختلف زبانوں کے الفاظ کی مثالوں سے اس کی وضاحت کی ہے "معماروں کے محاورے میں ریختہ اس مسالہ (کذا) کو کہتے ہیں جو کہ واسطے استحکام در و دیوار کے چند اجزا مخلوط کر کے بناتے ہیں اور چونکہ زبان اردو کی نظم میں بھی الفاظ عربی مثل اللہ رسول و فارسی مثل دل و زبان و ترکی مثل چاقو و باورچی و عبرانی مثل یوسف اور ہارون و یونانی مثل کیمیا و قرطاس و اسطرلاب و ہندی مثل مجرو و پر کالا انگل و سنسکرت مثل سوئی و دانت و سہالو و زبان تامل مثل اڑو بمعنی (ماش) و زبان تلنگو (کذا) مثل "بڑا"۔ جو کہ ماش وغیرہ چیزوں کے لیے بناتے ہیں و زبان گجرات مثل ننھا بمعنی خورد کے و زبان چین مثل لیچی یا لیموں، میوہ معروف و زبان ملاّئی

مثل کدام و زبان امر کہ مثل تنباکو کی ترکیب ہے اس لیے اس کا نام ریختہ رکھا گیا[۱۰۲]۔

لفظی معنی سے قطع نظر کرکے بطور ایک لسانی اصطلاح، ریختہ کا مطالعہ کرنے پر واضح ہو جاتا ہے کہ ریختہ اردو زبان کے لیے نسبتاً کم اور شاعری کے لیے زیادہ تر استعمال ہوتا رہا ہے۔ ان شعرا کے ہاں بھی جنھوں نے اردو کے لیے ہندوی یا ہندی استعمال کیا، گزشتہ سطور میں میر اثر کی مثنوی خواب و خیال (۱۱۵۳ھ) میں سے ہندوی کی مثال پیش کی گئی تھی۔ اسی مثنوی میں اثر نے ایک موقع پر یہ کہا ہے:

مرتبہ ریختہ کا اور ہوا
معتبر فارسی کے طور ہوا

لیکن اس سے پہلے ولی بھی ریختہ استعمال کر چکا تھا:

ولی تجھ حسن کی تعریف میں جب ریختہ بولے
سنے تو اس کو جان و دل سوں حسان عجم آ کر

اس انداز کے شاکر ناجی کے دو اشعار بھی پیش ہیں:

ریختہ ناجی کا ہے محکم اساس
بات میری باتی ابہام ہے
بلندی سی کے ناجی ریختے کی
ہوا ہے پست شہرہ فارسی کا

میاں شاہ قیام الدین علی قائم چاند پوری (وفات ۱۲۰۸ھ - ۱۷۹۳ھ) کے دیوان سے ریختہ کے استعمال کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

قائم نے ریختہ کو دیا خلعت قبول
ورنہ یہ پیش اہل ہنر کیا کمال تھا
قائم جو کہیں ہیں فارسی یار
اس سے تو یہ ریختہ ہے بہتر
قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی[۱۰۳]

ادھر مصحفی نے اپنے غزلوں میں ہندوی اور ریختہ، دونوں الفاظ استعمال کیے ہیں:

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعار ہندوی کا رواج
کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا
بو آتی ہے اس میں فارسی کی

ان شعرا کے علاوہ اس انداز کی مزید مثالیں بعض نثر نگاروں کی کتابوں سے بھی مل سکتی ہیں مثلاً میر کے معاصر گردیزی نے "تذکرہ ریختہ گویاں" (۱۱۶۶ھ) میں "ریختہ" استعمال کیا ہے۔ ریختہ کی فنی حیثیت کے ضمن میں میر تقی میر کے تذکرہ "نکات الشعرا" (۱۷۵۰ عیسوی/۱۱۶۳ ہجری) سے رجوع کیا جا سکتا ہے جس کے اختتام پر "خاتمہ" کے زیر عنوان ریختہ کے بارے میں جو لکھا، وہ آج بھی سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ میر خود شاعر تھے، شعرا کے مرتبے سے واقف تھے۔ شاعری پر تنقیدی نگاہ رکھتے اور لفظ و معنی کی نزاکتوں سے آگاہ تھے۔ انھوں نے ریختہ کی جو چھ اقسام گنوائی ہیں، دیکھا جائے تو وہ معاصر غزل پر محیط ہیں:

"ریختہ میں متعدد اقسام ملتی ہیں۔ ان میں سے فقیر کو جن سے آگاہی ہے، ان کو لکھا جاتا ہے۔ پہلی وہ جس میں ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی ہوتا ہے چنانچہ حضرت امیر خسرو علیہ رحمت کا قطعہ لکھا گیا۔ دوسری وہ جس میں نصف مصرعہ فارسی، نصف ہندی چنانچہ میر معز کا شعر لکھا گیا۔ تیسری وہ جس میں "حرف و فعل، فارسی" بروئے کار لائے جاتے ہیں اور یہ "قبیح" ہے۔ چوتھی صورت میں "ترکیبات فارسی" لے آتے ہیں۔ ان میں سے جو "مناسب زبان ریختہ" ہوں، ان کا استعمال تو جائزہ ہے لیکن "غیر شاعر" اس سے آگاہ نہیں ہوتے "نامانوس ریختہ" ترکیبوں کا استعمال "معیوب" ہے اور اس کا جاننا بھی "سلیقہ شاعری" پر موقوف ہے۔ اس فقیر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کہ "ترکیب فارسی" گفتگوئے ریختہ" کے مطابق ہو تو پھر اس کے استعمال میں چنداں مضائقہ نہیں۔ پانچویں قسم "ایہام" ہے اس "فن" کا "شاعران سلف" میں رواج تھا لیکن اب اس "صنعت" کی طرف طبیعتیں کم مائل ہیں مگر سلیقہ شرط ہے۔ ایہام کے معنی یہ ہیں کہ جس لفظ پر "بنائے بیت" استوار کی جاتی ہے، اس کے دو معنی ہوتے ہیں۔ ایک "قریب" کے، دوسرے "بعید" کے لیکن شاعر کو قریب کے نہیں بلکہ دور کے معنی "منظور" ہوتے ہیں۔ چھٹا انداز وہ ہے جو ہمیں

نے اختیار کیا ہے اور تمام "صفتوں" پر محیط ہے۔ چنانچہ "تجنیس"، "توصیح"، "تشبیہ"، "صفائے گفتگو"، "فصاحت"، "بلاغت"، "ادا بندی"، "خیال"، وغیرہ کا اس "ضمن" میں نام لیا جا سکتا"(۳۲)۔

اگرچہ میر تقی میر کا یہ اقتباس قدرے طویل ہے لیکن میر نے ریختہ کے جو چھ انداز گنوائے، ان کی آج بھی اہمیت ہے۔ مزید برآں دیگر معاصر شہادتوں کے ساتھ ساتھ خود میر کے بیان سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان کو تو ہندی کہتا ہے مگر "شاعری" کو "ہندی شاعری" یا "غزل" یا "ریختہ" قرار دیتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ عہد محمد شاہی میں، ہندی اور ریختہ کا مفہوم طے پا چکا ہے اور ان کے استعمال میں کوئی الجھن نہ تھی۔ جبھی تو میر نے یوں تعلّی کی:

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

ریختے کے اس استعمال کی مزید مثالیں پیش ہیں:

قاضی نور الدین فائق کا تذکرہ "مخزن الشعرا" (تذکرہ شعرائے گجرات) (۱۸۶۴/۱۲۶۸) میں بھی کئی مواقع پر ریختہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ تذکرہ کے تقریظ نگار میر کمال الدین حسین کامل نے بھی ریختہ کا لفظ استعمال کیا ہے(۳۳)۔

شاید یہ طے کرنا مشکل ہو کہ ریختہ آخری مرتبہ شاعری کے مفہوم میں کب استعمال ہوا تاہم جہاں تک نثر کا تعلق ہے تو رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد (جلد اول) میں اس کا استعمال آخری معلوم ہوتا ہے۔ فسانہ آزاد کے آغاز میں صبح کی منظر نگاری کرتے ہوئے آزاد نے یہ لکھا:

"روشنی طبع کے صدقے ایک ایک قدم پر ایک ایک مصرعہ ریختہ موزوں ہوتا چلا جاتا تھا"----------(۳۴)۔

سرشار نے منشی نول کشور کے اودھ اخبار (اجرا: ۱۸۵۸ء) میں "فسانہ آزاد" بالاقساط لکھنا شروع کیا تھا۔ پہلی قسط ستمبر ۱۸۷۸ء کے شمارے میں طبع ہوئی جبکہ ناول تین برس بعد پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا۔

حافظ محمود شیرانی نے بحیثیت مجموعی ریختہ پر جو تبصرہ کیا، وہ درج ذیل ہے۔

"ریختہ سے ہماری مراد ایسا کلام منظوم ہے جس میں طبع کی طرح فارسی اور ہندی کے

الفاظ یا فقرے متحد ہو کر کسی خاص مقصد یا مفہوم کو ادا کریں۔ ابتدائی دور کے ریختوں میں ہندی الفاظ کی آمیزش بہت کم ہوتی ہے بلکہ بعض میں تو پورے پورے شعر میں صرف ایک لفظ ہندی کا ملتا ہے جو بھی قافیے میں نمودار ہوتا ہے۔ ایسی نظموں کی تحریک ہزل و ظرافت اور تفنن طبع کی خاطر شروع ہوتی ہے مگر وقت گزرنے پر یہی تحریک بڑے سنجیدہ اور اہم مقاصد کا مرکز بن جاتی ہے اور ہماری اردو شاعری کا تمام قصر اسی کی بنیاد پر تعمیر پاتا ہے۔ اگر ریختہ کے بانی حضرت امیر خسرو مانے جائیں تو اس کی ابتدا ساتویں صدی ہجری کے ربع چہارم سے تسلیم کرنی ہوگی لیکن اگر یہ مانا جائے کہ امیر خسرو کے بعد یہ نظمیں رائج ہوئیں تو ہمیں ان کا زمانہ اس عہد سے دو صدی بعد یعنی نویں صدی کا ربع چہارم ماننا پڑے گا جو شیخ باجن اور شیخ جمالی کا زمانہ ہے اور جب بہلول اور سکندر لودھی حکمران تھے۔ دسویں صدی کے ریختہ کے نمونے بہت کم ملتے ہیں[۲۵]۔"

حافظ شیرانی نے "دسویں صدی ہجری کے بعض جدید دریافت شدہ ریختے" پیش کیے ہیں بلکہ جس مقالے سے یہ اقتباس لیا گیا، یہ اس کا عنوان ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو (جلد اول) میں بھی اس نوع کی مثالیں پیش کی ہیں۔ طوالت کی وجہ سے ان سب سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

ریختہ ساز: امیر خسرو:

خسرو کا مشہور ریختہ درج ہے۔ ہر چند کہ میر تقی میر نے "تذکرہ نکات الشعرا" میں اس کے بہانے یہ درج کیا ہے۔

زرگر پسرے چو ماہ پارا
کچھ گھڑیے سنواریے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست
پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

بحر متقارب میں لکھا گیا امیر خسرو کا یہ ریختہ پیش ہے۔

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیو کاہے لگائے چھتیاں

زحال یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرو تسکین
کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے پی سے ہماری بتیاں
شبان ہجراں دراز چو زلف و روز وصلت چو عمر کو تاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیران ہمیشہ گریاں بہ عشق آں
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں
بہ حق آں مہ کہ روز محشر بداد مارا فریب خسرو
سپیت من کے دورائے راکھوں جو جانے پاؤں پیا کی کھتیاں

خسرو کی یہ ریختہ غزل اگر ایک طرف مستند لسانی حوالے کی صورت اختیار کر چکی ہے، تو دوسری طرف تخلیقی سطح پر یہ اس طرز احساس کی غماز ہے جو ہندی گیت اور دوہوں سے مخصوص رہا ہے۔

اگرچہ خسرو کا یہ ریختہ لسانی اہمیت اختیار کر چکا ہے لیکن مختلف کتابوں اور مقالات میں یہ مختلف صورتوں میں ملتا ہے (مثلاً مقالات حافظ محمود شیرانی جلد دوم ص ۸۸)۔ دراصل یہ ریختہ بھی اچھی خاصی تحقیقی داستان کا حامل ہے۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند، تاریخی اعتبار سے امیر خسرو کے ہندوی کلام کا چوتھا اہم ماخذ، قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ "مجموعہ نغز" (اختتام ۱۵۰۶ عیسوی / ۱۲۲۱ ہجری) ہے جس میں امیر خسرو کی مشہور غزل، زحال مسکیں مکن تغافل کے پانچ اشعار درج کیے گئے ہیں۔ جنہیں بعد میں محمد حسین آزاد نے آب حیات میں شامل کیا۔ اگرچہ آب حیات کا متن بعینہٖ وہی نہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے مجموعہ نغز کو مرتب کر کے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا جبکہ وہ اپنی کتاب پنجاب میں اردو ۱۹۲۸ء میں شائع کروا چکے تھے اور اس میں اس غزل کے اشعار مجموعہ نغز قلمی سے ہی لیے ہوں گے لیکن اس میں بھی متن بالکل وہی نہیں۔۔۔۔۔۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مجموعہ نغز کا مندرجہ بالا متن ہی اس غزل کا قدیم ترین متن ہے۔

خسرو کے والد سیف الدین محمود (وفات ۶۵۸ھ) لاچینی ترک تھے۔ محمد تغلق کے دربار سے وابستہ تھے۔ والدہ مقامی خاتون تھیں اور ان کے نانا عماد الملک ہندی نژاد تھے۔ امیر خسرو ۶۵۱ھ / ۱۲۵۳ء میں ضلع ایٹہ کے شہر پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ آٹھ برس کی عمر

میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو دہلی میں اپنے نانا عماد الملک کے پاس آ گئے جو غیاث الدین بلبن کے درباری تھے اور یہیں سے ان کا تعلق دہلی کے درباروں سے ہوتا ہے۔ چنانچہ مختلف سفارتی اور فوجی امور میں بنگال اور اودھ سے لے کر ملتان تک کے علاقوں کی سیر کی بلکہ ملتان میں تو قید بھی ہو گئے تھے۔ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا۔ امیر خسرو نے جن گیارہ سلطانوں کا زمانہ دیکھا، ان کے نام یہ ہیں، غیاث الدین بلبن، معیز الدین، کیومرث، جلال الدین خلجی، فیروز خلجی، علاؤ الدین خلجی، شہاب الدین خلجی، مبارک خان، خسرو خان، غیاث الدین تغلق، محمد بن تغلق۔

امیر خسرو متنوع ذہنی دلچسپیوں کے حامل تھے۔ تخلیقی شخصیت اور انسائیکلوپیڈیا ذہن کے مالک تھے۔ ان کی مادری زبان ہندوی تھی، مذہبی زبان عربی، دربار اور ادبیات کی زبان ترکی اور فارسی تھی۔ وہ ان سب زبانوں کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور بعض دیگر مقامی بولیوں سے بھی آشنا تھے اور ان سب میں شعر کہنے پر قادر تھے لیکن خسرو کی تخلیقی اپج کسی ایک میدان کی پابند نہ تھی۔ انہوں نے شاعری، موسیقی، تصوف اور دربارداری، سب میں کمال حاصل کیا۔

چونکہ خسرو باہر سے نہ آئے تھے، اس لیے وہ اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

اثبات، گفت، ہندیہ حجت کہ راجع است
برپارسی و ترکی از الفاظ خوش گوار

ہماری مقصد امیر خسرو کے حالات زندگی بیان کرنا نہیں، صرف اس تہذیبی عمل کی نشاندہی مقصود تھی۔

ریختہ میں تنوع:

ریختہ کے ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی ایک غزل نقل کی ہے۔ یہ حسن دہلوی کی ہے جس کے بارے میں جالبی صاحب لکھتے ہیں "امیر خسرو کے ایک ہم عصر اور ان کے پیر بھائی امیر حسن، حسن دہلوی (م: ۷۳۸ ہجری / ۱۳۳۷ عیسوی) جنہیں عبدالرحمن جامی نے سعدی ہندوستانی کہا ہے۔ حسن دہلوی فارسی کے پرگو، قادر الکلام اور بے مثال شاعر

تھے۔ محمد تغلق کے زمانے میں برہان الدین غریب (م ۷۳۸ھ ہجری / ۱۳۴۱ عیسوی) کے ساتھ دولت آباد چلے گئے تھے۔ ان کی ایک غزل سے اس دور کی زبان پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان بھی ادبی سطح پر استعمال میں آ کر اپنا نیا سفر ارتقا طے کرنے لگی تھی۔ حسن نے بھی فارسی اور ہندی کو ملا کر وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو امیر خسرو کے کلام کی خصوصیت ہے۔

ہر لحظہ آید در دلم دیکھوں اسے ٹک جائے کر
گویم حکایت ہجر خود با آں صنم جیولائے کر
آں سیم تن گوید مرا در کوئے ما آئی چرا
ماہی صفت تریوں جو ٹک نہ دیکھوں اس کوں جائے کر
تا کے خورم خون جگر کا سین کہوں دکھ جائے کر
سوزم فتادہ در تنم، یہ دے گئے سلگائے کر
گفتم چوں جوگی دربدر یابم اگر جانے خبر
پھر پھر رہیا بہوتوں مگر اجہوں نہ ملیا آئے کر
بسیار گفتم ایں سخن اے دل بکس رغبت مکن
ان کی تباہی آت کٹھن، بہو کوں کھے سمجھائے کر
بس حیلہ کردم اے حسن بے جا شدم از دم بدم
کیسے رہوں تجھ جیو بن تم لے گئے سنگ لائے کر(۳۱)

حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" اور "مقالات حافظ محمود شیرانی" (جلد دوم) نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے متذکرہ تاریخ میں اس عہد کے متعدد شعرا اور صوفیا کے کلام اور اقوال سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جنھیں ریختہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

سعدی (مگر شیرازی نہیں) کی صورت میں ایک اور ریختہ گو کی دلچسپ غزل ملتی ہے۔ کچھ محققین نے انھیں سعدی کاکوروی لکھا تو بعض نے اورنگ آباد کا بتایا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر

الواس اشپرنگر (پیدائش آسٹریا ۳ ستمبر ۱۸۱۳ وفات ۱۸۹۳) کے ایک مقالے HAS SADY SHYRAZI WRITTEN REKHTA VERSE (مطبوعہ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۵۲) کا تذکرہ بھی ملتا ہے ڈاکٹر محمد وحید مرزا کی کتاب "امیر خسرو" میں بھی اس کا حوالہ ملتا ہے اور اسی مقالے میں خسرو کا مشہور ریختہ "زحال مسکین" بھی شامل ہے۔ بہر حال سعدی جو کوئی بھی ہو، اس کا ریختہ بے پر لطف اور قاطب چینا کوئی جنجل نار ہے۔

گفتہ چو دیدم بررخش گفتم کہ یہ کار ت ہے
گفتا کہ در اے باوے اس ملک کی یہ ریت ہے[۲۷]
اے مرداں شہر شما گفتی بری یہ ریت ہے
ہے ہے! نہیں پرسد کے پردیسیا مارت ہے
ہمنا تنی کو دل دیا تم مٹ اور دکھ دیا[۲۸]
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت[۲۹] ہے
اونہیں کی کیا کچھ کہوں رو رو جنونِ دل کروں
پیش سگ کوبت و ھروں پیاسا نہ جانے میت ہے
سعدی طرح انگیختہ شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ دُر ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے[۳۰]

بعض کتب میں مقطع یوں بھی درج ہے:

سعدی کہ گفتہ ریختہ دُر ریختہ دُر ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

نساخ کے رسالے زبانِ ریختہ کے مرتب انصار اللہ نظر نے حاشیے میں یہ لکھا ہے:

"پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی تحقیق کے مطابق یہ غزل سعدی کی نہیں بلکہ ملاشیری متوفی ۹۹۳ھ کی ہے اشعار کا متن ہاشمی صاحب کے مطابق یوں ہے:

جیوے ترے دکھ دیا تیرا ہموں سمجھ کیا کیا
تم وہ کیا ہم یہ کیا کیسی بھلی پرتیت ہے

وہ نین کے کھنجر کروں رو رو جنون دل بھروں
پیش سنگ کورت دھولیہ پیاسا نہ جاوئے میت ہے
تیسری سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ دُر ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے"

الغرض ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانوں اور تمدنوں کے امتزاج سے تخلیقی سط
ہندوستان میں جو نئی امتزاجی تحریک جنم لے رہی تھی، ریختہ اس کی منفرد علامت قرار پایا
جس کو شاعروں اور تذکرہ نگاروں نے زندہ رکھا چنانچہ پہلے اردو تذکرہ گلشن ہند (۱۸۰۱ء)
مولف میرزا علی لطف زبان کے لیے ریختہ اور اردو دونوں کو بیک وقت استعمال کرتے ہ
وہ تذکرہ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"زاحاتی اور زیبائی دلبران سخن کو اس زینت آفریں کی حمد سے
حاصل ہے جس نے معشوقانہ زبان ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ
پہنایا۔ دلربائی اور رنگین ادائی ناز فروشان ناطق کو اس بے نیاز کی ثنا
سے حاصل ہے جس نے محبوبان کلام اردو کو زیور الفاظ عربی اور فارسی
کی آرائش کے ساتھ خرام ناز سکھایا"(۲۱)۔

شیخ ناسخ نے متروکات کے جس عمل کا آغاز کیا، ریختہ بھی اس کی زد میں آگیا چنا
ناسخ اور اس کے شاگردوں نے اسے ترک کر دیا۔ غالب جو ریختہ کا لفظ استعمال کر گیا تو ایک
اس لیے کہ وہ شاگرد ناسخ نہ تھا اور دوسرے اس لیے بھی کہ ناسخ کے مقابلہ میں غالب کے ہا
الفاظ کا جمالیاتی اور تہذیبی شعور کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔

غزل عربی قصیدے کی تشبیب سے جدا ہوئی (حق تو یہ ہے کہ قصیدہ میں صرف
تشبیب ہی تخلیقی حسن کی حامل ہوتی ہے)، ایرانی نفاست پسندوں کی تخلیقی توانائی سے پختگی
حاصل کی اور ہندوستان کی تخلیقی جمالیات کی مظہر قرار پائی۔ تخلیقی سطح پر ریختہ تہذیبی اور
لسانی امتزاج کے زمانے کی یادگار ہے۔ شاید اسی لیے جب تمدن یک رنگ ہو گیا تو خسرو کا
طرز احساس اور اس کا مظہر ریختہ متروک قرار پا گیا۔ مجھے ذاتی طور پر ریختہ بہت پسند ہے اور
خسرو اور سعدی کے اسلوب والے ریختے آج بھی سنے جاتے ہیں۔

ریختہ کی مماثلت کے لیے کبھی کبھی "مراختہ" بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے جیسا کہ ڈاکٹر
محبوب الہی نے "نکات الشعرا" کے مقدمہ میں لکھا ہے:

"۔۔۔۔۔۔ نہ صرف مراختہ کی مجلسوں میں بلکہ نج کی ملاقاتوں میں بھی معاصرین کے افکار پر نکتہ چینی کی جاتی تھی"[۴۲]

ریختہ اور موسیقی

گزشتہ سطور میں ریختہ کے سلسلے میں جو لکھا گیا، وہ لسانی اور ادبی نقطہ نظر سے تھا لیکن ریختہ کا ایک مفہوم موسیقی کے حوالہ سے بھی اجاگر ہوتا ہے اور یہ معلوم مقامی تھا یعنی ایرانی موسیقی کی روایات سے اس کا کوئی تعلق نہیں بقول حافظ محمود شیرانی:

> "ریختہ نے ساتویں قرن ہجری میں ہندوستان میں نئے معنی پیدا کر لیے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب امیر خسرو دہلوی نے ایرانی اور ہندی موسیقی کے اتحاد سے ایک نئی چیز تیار کی، اس کے لیے انھوں نے بعض نئی اصطلاحات مثلاً قول، ترانہ، معروضی صوت، بسیط، دو، سہ، چہار اصول، نقش، فارسی، اور غزل وغیرہ وضع کیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ریختہ کی اصطلاح بھی وضع کی۔ اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی خیال ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود، ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں، اس کو ریختہ کہتے ہیں۔ ریختہ کے لیے کسی پردے کی قید نہیں ہے، وہ ہر پردے میں باندھی جاتی ہے۔۔۔۔۔ گویا ریختہ کا اطلاق ایسے سرود پر ہوتا ہے جس میں ہندی اور فارسی اشعار یا مصرعے یا فقرے جو مضمون، تال اور راگ کے اعتبار سے متحد ہوتے تھے ترکیب دے دیے جاتے تھے۔ اس کی مثال میں امیر خسرو کی وہ غزل بتائی جاتی ہے جس کا مطلع ہے
>
> زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
> کہ تاب ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیو کا ہے لگائے چھتیاں"[۴۳]

ریختہ کی تاریخ کا مطالعہ زبانی اور موسیقی کے ساتھ ساتھ ایک تہذیبی تناظر کا حامل بھی نظر آتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے جس عمل کا آغاز شہنشاہ اکبر نے مغل سلطنت کے استحکام کے

لیے کیا تھا، وہ جب تہذیبی رنگ میں رنگا گیا تو اس نے جس تمدن کی بنا استوار کی وہ نہ خالص ہندوانہ تھا اور نہ ہی خالص مسلم بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے جو معرض وجود میں آیا، وہ بھی ہندوستانی تمدن تھا۔ اسی نے جب تخلیقی سطح پر اظہار پایا تو ریختہ (اور اس کی مظہر چیزیں) معرض وجود میں آئیں۔ عوامی سطح پر ہندو مسلم تمدن کے ملاپ سے جو نئی صورت حال رونما ہوئی تھی غزل اور موسیقی میں ریختہ اس کا مظہر تھا۔

اردو اور چنگیز خان:

مسلمانوں کی آمد سے ہندوستان کی جامع تاریخ میں تغیرات نو کی جو لہریں پیدا ہوئیں، ان کا متنوع جہات پر مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک زبان کی تشکیل کا تعلق ہے تو لمبی چوڑی لسانی تحقیقات کے بغیر صرف بدلتے ناموں ہندی، ہندوی، ریختہ، ہندوستانی اور اردوئے معلیٰ ہی سے تاریخی تغیرات اور ان سے وابستہ سیاسی، سماجی اور تمدنی امور کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

ترکی میں اردو لشکر کو کہتے ہیں۔ اسے ثابت کرنے کے لیے اب شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے تاہم ایک دو حوالے پیش ہیں۔

حکیم سید شمس اللہ قادری کے بموجب "امیر علاؤالدین جوینی کی تاریخ "جہاں کشا" اور وزیر رشید الدین فضل اللہ کی "جامع التواریخ" سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خان اور اس کی اولاد کے زمانے میں مغل بادشاہوں اور بادشاہ زادوں کی فرودگاہوں اور لشکر گاہوں کو اردو کہا کرتے تھے۔ یہاں تک ان کا مستقر حکومت بھی اردو کہلاتا تھا اور قراقرم کا قدیم نام بھی اردو بالیغ تھا۔ چنگیز خان کے فرزند جوجی خاں کی اولاد نے "دشت قپ چاق" اور "روس و بلغار" میں ایک وسیع حکومت قائم کرلی تھی، اس کے حکمران جب کسی مہم پر مستقر سے روانہ ہوتے تو زریں خیموں میں قیام کرتے تھے جس کے باعث ان کی لشکر گاہیں اردوئے طلا (Golden Hord) کہلاتی تھیں خود انہیں "خوانینِ اردوئے طلا" کے لقب سے شہرت ہوگئی تھی۔"[۲۲]

آئی آئی قاضی نے ۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء کو کراچی میں منعقدہ یوم اردو کے خطبہ صدارت میں لفظ اردو کے آغاز اور بدلی صورتوں کے بارے میں خاصی دلچسپ اور معلومات افزا گفتگو کی۔ ان کے بقول "یہ لفظ اصلاً ترکی نہیں ہے" بلکہ "اردو سندھی میں بھی ڈھیر یا اشیا کے ذخیروں اور انسانوں کے اجتماع کو کہتے ہیں" اور "عربوں کے سندھ میں وردو سے تین ہزار

سال پہلے سے رائج ہے"

وہ اس لفظ کی حکایت یوں بیان کرتے ہیں:

"لفظ اردو (Urdu) سندھ یا ہند میں پیدا نہیں ہوا اس کی ابتدا ما قبل تاریخ کے ماضی میں ہوئی وہ لوگ جو ہند السانی (Indo Germanie) زبانوں سے کچھ شناسائی رکھتے ہیں اس لفظ کو سکونڈے نیویا، ایران اور ہندوستان میں (یہ تینوں علاقے آریاؤں کے خاص وطن ہیں) بیک وقت موجود پاتے ہیں۔ قدیم نارڈک (Nordic) دیومالا میں لفظ ارد (Urd) یا ارتھ (Urth) ایک دیوی کا نام ہے جو خود تقدیر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہند السانی زبانوں کے بولنے والوں میں اپنے مغربی و مشرقی ساکن کی طرف مراجعت سے پہلے ہی یہ لفظ مستعمل تھا۔ اگر ہم اویستا یا قدیم فارسی زبان کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ لفظ وہاں مل جائے گا۔ اردو بل کا شہر، ارد شیر بادشاہ، اسی لفظ کے استعمال کے ثبوت ہیں جس مفہوم میں یہ لفظ آج سندھ میں، مستعمل ہے۔ اسی مفہوم میں جدید فارسی میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً فوج، کیمپ، بازار وغیرہ اور ان تمام معانیم میں قدر مشترک بالکل واضح ہے۔ یہ دھیر بھی ہے، مجمع بھی اور مجموعہ بھی۔ لفظ "ارد" میں شروع ہی سے ایک مخصوص اشارہ دہشت اور خوف کا بھی ملتا ہے جیسی صورت میں بھی خصوصیت "ارد" دیوی کی ہے جس کے معنی ایک ایسی شے کے ہیں جو مقدر کی طرح دہلا دینے والی ہو۔۔۔۔۔ ان آریا مہاجرین نے جو اسکنڈے نیویا کی طرف گئے، اس لفظ کے ساتھ یہی مفہوم وابستہ کیا۔۔۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "ارد" آریائی زبان کے قدیم ترین لفظوں میں سے ہے اور آج تک زندہ چلا آتا ہے۔ یہ آریائی تمدن کی ابتدا اور اس کی خاصیت کا مظہر ہے یعنی السانی معاشرت کا۔ حضرات یہی وہ لفظ ہے جو لفظ اردو کا ماخذ ہے"[29]۔

حافظ محمود شیرانی کی تحقیقات سے اردو کی کہانی کچھ اور ہی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "یہ لفظ ترکی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے یعنی اوردا اوردہ، اوردو، اردو۔۔۔ جس کے معنی فرودگاہ، لشکر اور پڑاؤ نیز لشکر و حصہ لشکر ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال خیمہ، بازار، لشکر، حرم گاہ، محل و محل سرائے، شاہی و قلعہ پر بھی ہوتا ہے"[30]۔ اس پر جابر علی سید کی اس رائے کا اضافہ کر لیجیے تو اردو کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے "اردو، یلدرم، بیگ، بیگم، اتا، باجی، ترکی منگول، کشور۔ کشاؤں کے ہمراہ جب پولونڈ (استان فارسی) پہنچا تو پولش زبان کے مزاج میں ڈھل کر Hord بن گیا جس کی جمع Hords ہے اور Mongol

Hords منگولی عساکر کے معنی میں انگریزی میں متداول ہے[۲۷]۔

سلجوق یونیورسٹی قونیہ (ترکی) کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر ایرکان ترکمان کے بموجب ۷۳۲ میلادی میں کل تگین بادشاہ نے ایک ستون کندہ کرایا جس کی عبارت ترکی زبان کے قدیم ترین نمونوں میں سمجھی جاتی ہے۔ اس میں لفظ اردو (Ordu) "مرکز حکومت" "دارالخلافہ یا چھاؤنی کے معنی میں کندہ ملتا ہے۔ ان کے مقالہ بعنوان "لفظ اردو کا مطلب اور تاریخی پس منظر" (اخبار اردو اسلام آباد جولائی ۸۷ء) سے اردو کے استعمال کی تاریخ پیش ہے:

"ترکوں کے مسلمان ہونے کے بعد سنہ ۱۰۷۲ میلادی میں یوسف خاص حاجب نے "قوتادغو بیلیک" کے نام سے کتاب لکھی تھی جس کا مطلب "مبارک علم یا علم دولت"۔ اس ضخیم کتاب میں جگہ جگہ اردو کا لفظ آتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس صدی میں اس لفظ کے معنی یہ تھے محل یا شہر، ترکی کے پرانے لہجے "اویغوری" میں اردو کا لفظ "محل اور لشکر گاہ" کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس کا تلفظ "اورتو" کی شکل میں بھی مستعمل تھا۔ گیارھویں صدی عیسوی میں محمود کاشغری نے عربی پر ترکی کی فوقیت دکھانے کے لیے ایک لغت لکھی تھی جس کا نام "دیوان لغات الترک" ہے۔ اس میں سات ہزار پانچ سو کے لگ بھگ الفاظ اور ان کے معانی ملتے ہیں۔ لفظ اردو کے بارے میں جو کچھ اس میں ہے، پیش کرتا ہوں:۔

اردو: وہ شہر جس میں خاقان (بادشاہ) مقیم ہوتا ہے۔ اس طرح کے شہر میں کیونکہ بادشاہ رہتے تھے، اس لیے اسے بھی "اردو کند" سمجھا جاتا تھا۔

اردو: بالاساغون کے نزدیک ایک شہر کا نام ہے۔ بالاساغون شہر کو "قوز اردو" کہتے ہیں۔

اردو باشی (Ordu Basi) وہ شخص جو خاقان کا بستر بناتا ہے۔ کلوزن صاحب اپنی لغت[۲۸] میں ایسے ہی معنی دیتے ہوئے لکھتے ہیں "اردو (Ordu) یا اوردو (Ordo) بادشاہ کے رہنے کا محل بادشاہ کا خیمہ، منگولی میں یہ لفظ اوردو (Ordo) کی شکل میں ترکی سے لیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جب منگولین فوج نے انجام پایا اور ترکی کی عسکری طرز کو اپنایا تو یہ لفظ چنگیز خان کے بعد یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں منگولی سے یورپ کی زبانوں میں (Hord) کی شکل اختیار کر گیا۔ لاطینی میں Ordo اور چینی میں Ao-Tot کی شکل ہو گئی۔ ترکی کے چغتائی لہجے میں اردو سے مراد قیام گاہ لشکر، لشکر حرم سلاطین محل ہے"

الغرض اردو کے معنی کی جتنی متنوع صورتیں گنوائی جاتی ہیں، ان سب کا بلاواسطہ یا

بالواسطہ طور پر لشکر ہی سے تعلق بنتا ہے اور کیا پتہ لاہور کا اردو بازار بھی دراصل لشکر کی قیام گاہ ہو جبکہ آج ناشرین اور سٹیشنرز کی وجہ سے اردو زبان وادب سے اس کا تعلق سمجھا جاتا ہے۔

اردو: لشکر:

جب اردو لشکر تھا تو پھر اردو کا لفظ بھی ترکی لشکر کے ساتھ یہاں آنا چاہیے تھا اور ایسا ہی ہوا۔ شاید تاریخی شواہد یا کسی سیاح کے سفرنامے میں اردو کا لفظ مغلوں سے پہلے نظر آجائے تاہم مغلوں کی آمد کے بعد سے تو اردو کا لفظ کہیں نہ کہیں اپنے اصل مفہوم (لشکر) میں مل جاتا ہے۔ اولین اور قدیم حوالہ سے مغل حملہ آور بابر کے ہاں ملنا چاہیے تھا اور واقعی ملتا بھی ہے۔ چنانچہ اس کی تزک میں لفظ اردو کا استعمال اگر قدیم ترین نہیں تو کم از کم قدیم یقیناً ہے۔

"دروقت رسیدن نزد باصیان چادر ہائے مارا
کہ عقب ماندہ بودے بوشد، مارا خیال کردہ
زود بری گروند وارد وئے خود رسید چہ
ہیچ چیز تقصیہ نہ شدہ کوچ می کنند"

بابر اپنی لشکری ٹکسال کو بھی "اردو" کہتا تھا[49]

اکبری عہد حکومت میں بھی لفظ اردو لشکر اور اس کے متعلقات کے لیے استعمال ہوتا رہا چنانچہ شیرانی نے اردوئے علیا اردو معلی، اردوئے لشکر، اردوئے حضرت، اردوئے ظفر قرین، اردو حالی اور اردوئے بزرگ جیسے الفاظ گنوائے ہیں[50]۔ ان مرعوب کن ناموں کا بابر کے سیدھے سادے لشکر سے موازنہ نفسیاتی دلچسپی سے خالی نہیں۔ بابر تھوڑی جمعیت (محض دس بارہ ہزار) لے کر آیا تھا، اس لیے یہ محض "اردو" تھا لیکن اکبر کے عہد میں سلطنت وسیع بھی تھی اور مضبوط بنیادوں پر مستحکم بھی، اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ اکبر اعظم کا لشکر محض "اردو" رہے، چنانچہ وہ اردوئے معلیٰ کہلاتا ہے۔ یہ وہ احساس تفاخر ہے جو شہنشاہیت سے مخصوص ہے جس کے باعث محض ایک فانی شخص ظل سبحانی کہلواتا ہے۔ اکبر تو خیر اعظم تھا ہی چنانچہ مہابلی بنا اس کے لشکر کی ٹکسال نے اردو ظفر قرین اور اردوئے ظفر قرین کا نام پایا۔

مغل اور اردو:

امن امان خوشحالی، فتوحات اور ان کے نتیجے میں وسیع مغل سلطنت کی حدود میں بسنے والی متنوع نسلوں پر مشتمل اپنی اپنی زبانیں اور بولیاں بولنے والی رعایا میں جو ترک لفظ مقبول بلکہ زبان زد عوام ہوئے ہوں گے "اردو" اور اس کی متنوع صورتیں بھی ان میں شامل ہوں گی، اس لیے کہ اس عہد میں لشکری ہونا باعث عزت بھی تھا اور تحفظ اور حصول زر کا ذریعہ بھی۔

جہانگیر کے عہد تک اردو کا لفظ ملتا ہے، وہی اپنے اصل ترکی مفہوم میں لیکن زبان کے لیے ہندی ہی مستعمل تھا۔ ایک موقعہ پر اس نے اپنی تزک میں یوں لکھا:

"بہ کالا پانی فرود آمدم کہ بزبان ہندی مراد آب سیاہ است"۔ تزک میں جہانگیر پر جستجو ذہن کا مالک نظر آتا ہے، اسی لیے تجربات اور مشاہدات کا شائق ہے۔ وہ اشیا اور وقوعات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی مے نوشی سے ابھرنے والے عمومی تاثر کے برعکس وہ کھلی آنکھ رکھنے والا انسان نظر آتا ہے جو بے حد ذہین اور معاملہ فہم ہے۔ منجملہ دیگر امور کے تہذیبی، تمدنی، لسانی اور افسانی نقطہ نظر سے بھی اس کی تزک مالا مال ہے۔ جب ہم اس کی تزک میں عام الفاظ پڑھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ یہ اتنے پرانے ہیں۔ تالاب۔ بلی۔ تھانہ۔ بوٹا۔ گوشت۔ ٹیکہ۔ چوکیدار۔ چبوترہ۔ گول۔ چمپا۔ گھڑی۔ کٹوری۔ کھچڑی باجرہ وغیرہ ویسے اس انداز کی مزید مثالوں کی تلاش میں کسی حد تک تزک بابری اور بڑی حد تک ابوالفضل کی "آئین اکبری" سے بھی مدد مل سکتی ہے، بھی نہیں بلکہ سفرناموں ناموں، تہذیبی یا تاریخی کتابوں سے بھی اس نوع کی قدیم مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اس انداز کی ایک نمایاں مثال ابن بطوطہ کا سفرنامہ (۷۲۵ ہجری) بھی ہے۔ یہ فیروز شاہ تغلق کے دور میں آیا تھا اور ہندوستان کے بارے میں جو کچھ لکھا، وہ اب اہم تاریخی ماخذ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اس نے چالیس کے لگ بھگ ایسے الفاظ استعمال کیے جو آج بھی مروج ہیں۔ کوتوال، سوسہ، پودا، منڈھی، گھ بان، بارگھہ، ٹٹو ڈال، چک، مرتبان (وہ اسے مرطبان لکھتا ہے)"[۵۸]۔

بہرحال ان قدیم الفاظ کا زندہ رہنا ایک الگ بحث ہے۔ جہاں تک خود اردو کا تعلق ہے تو خود محققین متفق ہیں کہ اردو کے ہندی یا ہندوی نام عہد شاہجہان میں متروک ہونے اور شاہجہان آباد میں زبان نے اردوئے معلیٰ کا نام پایا۔

قدیم دور میں تہذیب و تمدن کا مرکز دربار شاہی ہوتا تھا۔ بادشاہ کی پسند و ناپسند عوام کے لیے مثال اور نمونہ ہوتی تھی۔ جب شاہ جہاں آباد کی زبان محض عوام کی بولی نہ رہی بلکہ اردوئے معلیٰ قرار پائی، تو ظاہر ہے کہ اس نے لطافت کی کئی حدوں کو چھو لیا ہوگا۔ شاہی محل "شہزادے" شہزادیاں شاہی دربار اور اراکین دربار زبان کے ساتھ ساتھ دیگر تمدنی امور میں بھی سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ آج کی اصطلاح میں انھیں Trend Setter کہہ سکتے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ بحیثیت مجموعی انداز زیست میں جو لطافت پیدا ہو رہی تھی، زبان پر اس کے اثرات نہ پڑتے۔ ہونا تھا اور یہی ہوا۔ شاہجہان آباد اور اردو یوں لازم ملزوم ہوئے کہ اردوئے معلیٰ کے ساتھ ساتھ زبان شاہجہان آباد یا اصطلاح شاہجہاں آباد کا نام بھی پایا۔ ملاحظہ ہو سراج الدین علی خان آرزو (۱۶۸۹ عیسوی/۱۷۳۶ ہجری) کی لغت "نوادر الالفاظ" جس میں آرزو نے ہندوستان کی زبانیں گنواتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے:

"زبان اردو یا اردوئے معلیٰ یا زبان شاہجہاں آباد یا اصطلاح شاہجہان آباد یا اہل اردو یا ہندی فصحا"

اس سے اردو کے مترادفات کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس دور میں اردو شاہجہان آباد سے مخصوص تھی اور بعض اوقات جو اسے زبان دہلوی کہا گیا تو وہ بھی اسی مناسبت سے۔

غالب کے مشہور شاگرد علاء الدین علائی کا ایک نادر مضمون "ریختہ کی کہانی علائی کی زبانی" ملتا ہے جو ۵ مئی ۱۸۶۶ء کو دلی سوسائٹی کی ایک نشست میں پڑھا گیا تھا اور "ماہ نو" کراچی جلد ۱۲ شمارہ ۳۰، ۱۹۵۹ میں اس کی اشاعت مکرر ہوئی۔ تاریخی اہمیت کے اس مضمون سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "واضح ہو کہ لشکر کو فارسی میں اردو بھی کہتے ہیں جس کا ترجمہ عربی میں جیش اور انگریزی میں کیمپ یا آرمی ہے۔ ہر چند کہ بعض لوگ بمعنی لشکر ترکی بتاتے ہیں مگر یہ لفظ فارسی کا ہے بایں حال جب اس زبان نے ترکیب پائی اور لشکر کے بازار گاہ میں جہاں اطراف و اکناف عالم کے تجار آ جاتے تھے، صرف محاورات و مکالمات ہوتے تھے، تو یوماً بعد یوم اس کی ترقی ہوتی گئی اور نام اس کا زبان اردو ہوا۔ ازاں جا کہ بعد عہد اکبر زمانہ شاہ جہاں آیا وہ قرار پایا اور خود اپنی ذات سے بادشاہ

بھی اسی جگہ متمکن بردوام رہا تو نام اس لشکر کا قطعیتاً اردوئے معلیٰ رکھا۔ جس کا ترجمہ انگریزی میں رائل کیمپ ہو سکتا ہے۔ بدیں نظر اردو سے مراد خاص زبان شاہ جہاں آباد ہوئی"۔

شاید اردو زبان، عوام کی زبان پر اس سے پہلے بھی ہو لیکن اتنا یقینی ہے کہ شاہجہان آباد کی نستعلیق فضا اور تعلیم یافتہ افراد کی سرپرستی کے باعث اردو کے ذخیرہ الفاظ میں خصوصی اضافہ ہوا ہوگا۔ یہ قیاس اس لیے غلط نہیں کہ دارالحکومت میں دربار کی زبان فارسی ہی تھی جو تخلیقی مقاصد کے لیے بھی استعمال کی جا رہی تھی۔ یہی درباری علما اور فصحا جب اردو بولتے ہوں گے تو غیر شعوری طور پر اپنے مطالعے کی بنا پر اس میں عربی فارسی، ترکی الفاظ کی آمیزش بھی کر جاتے ہوں گے مزید برآں دارالحکومت ہونے کی بنا پر نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگ اپنی اپنی مخصوص زبانیں اور بولیاں بولتے یہاں آتے رہتے تھے بلکہ غیر ملکی سفارت کار بھی آتے تھے۔ غیر ملکی لوگ نئے الفاظ لاتے۔ نئی چیزیں نئے نام ہمراہ لاتیں اور نئے تصورات نئے اصطلاحات لاتے۔ یوں قطرہ قطرہ بہم شود دریا کے مصداق، ذخیرہ الفاظ میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ اکھڑ لشکریوں کے معمولی ضروریات پوری کرنے والی گنواری بولی بطور ایک شائستہ مزاج زبان کے اپنا روپ نکھارتی گئی، اس حد تک کہ شاہ جہاں آباد کی تعمیر کے نصف صدی بعد وہ ایک ایسی معیاری زبان کی صورت اختیار کر گئی جس میں اب تخلیقی قوت بھی تھی۔ اس لیے ولی کی دہلی آمد پر (۱۱۱۲ ہجری) جب مشہور صوفی شیخ سعد اللہ گلشن نے دکنی اسلوب کی غزلیں سن کر یہ مشورہ دیا تو (تحقیقی اعتبار سے متنازعہ ہونے کے باوجود بھی) لسانی نقطہ نظر سے اہمیت اختیار کر جاتا ہے:

"زبان دکنی را گزاشتہ و ریختہ را موافق اردو معلی شاہ جہاں آباد موزوں بکنند"

اس عہد کے مخصوص لسانی تناظر میں دکنی میں کوئی خرابی نہ تھی (کہ اس میں ایک صدی سے مثنوی، قصیدہ، مرثیہ اور غزل لکھی جا رہی تھی)۔ میرے خیال میں واحد خرابی یہ تھی کہ وہ دکنی تھی۔ شاہجہان آباد کی نہ تھی یعنی مفرس اور معرب نہ تھی۔ اس کا تعلق پس ماندہ دکن کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں سے تھا جبکہ اردوئے معلیٰ عظیم مغل سلطنت کے ذی شان دارالحکومت شاہجہان آباد کی زبان تھی، اسی لیے وہ فصیح تھی اور سند بھی۔ سوچ کا یہی انداز قائم چاند پوری کے اس مشہور شعر سے بھی عیاں ہے:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

شیخ سعد اللہ گلشن کے قول اور قائم کے اس مقطع سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اب تک ریختہ شاعری (بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ غزل) کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ جبکہ اردو زبان کے لیے دکنی اور اردوئے معلیٰ، ملتے ہیں۔ چنانچہ میر کے نکات الشعرا (۱۷۵۲) اور قائم کے مخزن نکات (۱۷۵۷) دونوں میں زبان کے لیے "اردوئے معلیٰ" یا "اردو معلیٰ" کے محاورے کے مطابق لکھا گیا ہے۔ میر تقی میر کے فرزند میر کلو عرش (نام میر حسن عسکری) کا یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں زبان کے لیے اردوئے معلیٰ لایا گیا ہے:

ہم ہیں اردوئے معلیٰ کے زباںداں اے عرش
مستند ہے جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں[۲۳]

اردوئے معلیٰ:

اردوئے معلیٰ خوبصورت اصطلاح اور شاعرانہ ترکیب تھی لیکن زبان زد عوام نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ عوامی زبان پر یہ مختصر ہو کر اردو رہ گئی۔ اس عہد کے کئی تذکروں سے اس امر کی شہادت بھی مل جاتی ہے "تذکرہ گلزار ابراہیم" (۱۷۸۴ ہجری) اور مصحفی کے "تذکرہ ہندی" دونوں میں اردو معلیٰ کی جگہ اردو مستعمل ہے، یہی نہیں بلکہ نثر کے ساتھ ساتھ غزل میں بھی اردو کا استعمال نظر آ جاتا ہے جیسے مصحفی کا یہ مقطع:

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول: "غالباً آرزو ہی پہلے مصنف ہیں جن کی تصانیف میں اردو کا لفظ زبان کے معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ تحسین (نوطرز مرصع) شاہ مراد لاہوری (نامہ مراد) اور مصحفی کا زمانہ، آرزو سے موخر ہے۔ نوادر الالفاظ میں لفظ اردو کئی موقعوں پر آیا ہے۔ مثلاً ہڑپنا بزبان اردو اہل شہر نیست شاید زبان قریان و مواضع باشد۔ بدیں معنی لگنا شہرت دارد۔۔۔۔ " اردو کا لفظ خان آرزو کی تصنیف مثمر میں بھی بعض موقعوں پر استعمال ہوا ہے" (مقدمہ نوادر الالفاظ ص ۲۹)

ہڑپنا کے معنی کی تشریح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ گرد و نواح کے مقابلے میں شہر دہلی کی زبان فصیح سمجھی جاتی تھی۔ جبھی تو خان آرزو نے بطور خاص یہ کہا کہ اہل شہر کی زبان

پر یہ لفظ نہیں ہے۔

حافظ محمود شیرانی کی تحقیقات کے مطابق "مغربی مصنفین میں مسٹر گل کرائسٹ پہلے شخص ہیں جو اپنی انگریزی تالیف " قواعد زبان ہندوستانی " طبع ۱۷۹۶ عیسوی مطابق ۱۲۱۰ ہجری میں اردو کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے جملے کا ترجمہ یہ ہے:

"ریختہ وہ مخلوط زبان ہے جس کو اردو یا دربار کی شستہ زبان بھی کہتے ہیں"[۱۳]۔

ڈاکٹر گیان چند جین کی تحقیقات کے نتیجے میں "جہاں تک لشکر" بازار یا لال قلعے سے ہٹ کر اردو کو زبان کے معنی میں استعمال کرنے کا تعلق ہے، اس کی قدیم ترین مثال میں محمدی مائل دہلوی شاگرد قائم کے دیوان میں ملتی ہے۔ اس کا دیوان ۱۱۷۶ ہجری میں مرتب ہوا۔۔۔۔۔ اس دیوان میں ایک قطعہ ہے جس کا ذکر محمد اکرام چغتائی نے کیا ہے۔ اس قطعہ میں کوئی شاعر سے لفظ اردو کے بارے میں پوچھتا ہے، شاعر جواب دیتا ہے:

مشہور خلق اردو کا تھا ہندوی لقب

اگلے سنوں بیچ یہ کہاتے ہیں سب

شاہ جہاں کے عہد سے خلقت کے بیچ میں

ہندوی تو نام مٹ گیا اردو لقب چلا

اسی طرح زبان کے معنی میں لکھنے میں لفظ اردو ۱۱۷۶ ہجری سے قبل استعمال کیا گیا ہے"۔

حواشی

۱- "آریائی زبانیں" ص ۱۲

۲- "مقالات حافظ محمود شیرانی" مرتبہ مظہر محمود شیرانی جلد دوم ص ۶)

۳- "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد دوئم ص ۱۸

اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب ص ۳۲۹، مصنفہ ڈاکٹر کامل قریشی، دہلی اردو اکیڈمی دہلی۔

"مقالات حافظ شیرانی" جلد دوئم ص ۳۳

۴- ایضاً ص ۷۰

۵- تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۱۶

۶- تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۱۶۔

۷- ڈاکٹر رام آسرا راز: اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ ص ۳۵۔

۸- ایضاً ص ۳۰۔

۹- اردو نے معلیٰ (قدیم اردو نمبر شمارہ ۹)۔

۱۰- بعض اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ ایک ہی سانس میں ہندی اور ریختہ کا لفظ استعمال کیا گیا جیسے عبدالغفور نساخ نے
رسالہ زبان ریختہ (تاریخی نام) ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۷ء عیسوی میں یہ لکھا۔ "غرض محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں نظم ہندی کا چ
رواج ہوا بیشتر اہل علم ریختہ کہنے لگے"

۱۱- امیر خسرو کا ہندوی کلام" مطبوعہ سہ ماہی غالب، کراچی، جنوری مارچ ۱۹۷۷ء۔

۱۲- ترجمہ محمد رفیق عابد ص: ۱۹۳-۱۹۵۔

۱۳- "ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ" ص ۱۵۔

۱۴- مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ص ۱۵۷

۱۵- "مضامین پریم چند" مرتبہ عتیق احمد۔ ص ۱۹۲-۱۹۳۔

۱۶- جعفر قائم:

اے گردش زمانہ تیری کج روی کے بیچ
یکسر رواج ہند سے شعر و سخن گیا

۱۷- جرأت نے قائم کے انتقال کی تاریخ میں کہا تھا:

جرأت نے سن رو کے یہ تاریخ وفات ---- یکتائی کے ساتھ
قائم بنیاد شعر ہندی نہ رہی ------ کہا کہ اب آہ

۱۸- بحوالہ: محمد نعیم اللہ خیالی، "اردو ایک ہمہ گیر کتاب" ص ۳۲ (۱۰۲۸ھ)

۱۹- "کربل کتھا" شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی ص ۲۵۔

۲۰- ایضاً ص ۲۸۔

۲۱- ایضاً ص ۳۳ کربل کتھا کی لسانی اہمیت کے لیے اردو معلیٰ (قدیم اردو نمبر شمارہ ۹) میں مطبوعہ ڈاکٹر
گوپی چند نارنگ کا مقالہ "کربل کتھا کی زبان" اور ڈاکٹر عتیق انجم کا مقالہ "کربل کتھا کا لسانی مطالعہ" ملاحظہ ہے۔

۲۲- "اردو کا روپ" ص ۹۸-۹۷۔

۲۳- لوئیس احمد ادیب، "تنقیدی مطالعے" ص ۲۳۸-

۲۴- خود ہارلے بھی "Colloquial Hindustni" (لندن ۱۹۳۳) کا مولف ہے نوٹ مختلف انگریز مصنفوں کا ہندوستانی کا رولا بھی قابل غور ہے۔

۲۵- مقالات حافظ محمود شیرانی جلد ۲ ص ۹، ۱۰-

۲۶- "ازبک اور اردو زبانوں میں مشترک الفاظ" مطبوعہ اردو معلی قدیم اردو نمبر ---- مقالہ نگار کے حواشی۔
الف- "ترکی زبان کو ہم موجودہ ازبک زبان کی پرانی شکل سمجھتے ہیں جس کو چغتائی بھی کہتے ہیں۔
ب- "بابر کو ازبکستان کے لوگ ایک بہت مشہور ازبک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں اس کی چغتائی میں غزلوں کو نہ صرف ازبک میں مقبولیت ملی بلکہ سوویت یونین کی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔"
یہ لفظ غالب "غزل نمبر ۲" میں استعمال کیا گیا ہے۔

۲۷- جعفل فرمان فتح پوری "۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں تکمیل کو پہنچا اور مطبع نول کشور لکھنؤ سے پہلے ۱۸۷۲ء میں اور بعد ازاں ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا یہ ایک مدت سے کم یاب اور نایاب تھا۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے مفید مقدمہ اور حواشی کے ساتھ اسے ۱۹۷۷ء میں علی گڑھ سے شائع کیا" نگار پاکستان کراچی جنوری ۱۹۸۸ء
نگار پاکستان حوالہ بالا

۲۸- اس کے برعکس میر نے یہ کہا:

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میر
یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

۲۹- تذکرہ نکات الشعراء مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ۱۵۷-

۳۰- تذکرہ مطبوعہ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء

۳۱- مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۳۲- مقالات حافظ محمود شیرانی جلد دوم ص ۴۷

۳۳- "تاریخ ادب اردو" جلد اول ص ۳۵-۳۶-

۳۴- آب حیات میں یہ مصرع یوں ہے:
گھٹا کر ذرہ ہو وے اس شہر کی یہ رت ہے

۳۵- حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" (ص: ۱۲۳) میں ایک بیاض سے خسرو سے منسوب ایک غزل درج کی ہے۔ اس میں بھی اس مفہوم کا ایک شعر ملتا ہے جو درج ہے۔
شیرانی اسے خسرو کی غزل تسلیم نہیں کرتے:

میرا جو من تو نے لیا تم نے اٹھا غم کوں دیا
غم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پہ

۳۶- ناسخ نے رسالہ "زبان ریختہ" میں یہ مصرع یوں درج کیا ہے:
تم یہ کیا ہم وہ کیا یہ ہی جگت کی رت ہے

۳۷- "مقالات حافظ محمود شیرانی" (جلد اول) میں مصرع ثانی یوں ہے۔
شیر و شکر ہم ریختہ ہم گیت ہے

۲۸۔ علی لطف میرزا، "تذکرہ گلشن ہند" ص

۲۹۔ "کلیات الشعرا"، لکھنؤ اترپردیش اردو اکادمی ص

۳۰۔ "پنجاب میں اردو" ص ۳۳۔

۳۱۔ اردوئے قدیم ص:

۳۲۔ "سویرا"، لاہور، شمارہ ۵۲-۵۰، مئی ۱۹۷۶ء۔

۳۳۔ "مقالات حافظ محمود شیرانی"، جلد اول ص

۳۴۔ "لفظ لسبان کی تحقیق"، مطبوعہ اخبار اردو، کراچی، فروری ۱۹۸۳۔

۳۵۔ Sir Geraro Clams on :Antimological Dictionary of Thirteenth century Turkish, Oxford, 1972, p. 203.

۳۶۔ مقالات حافظ محمود شیرانی جلد اول ص ۲۰۔

(حاشیہ مصنف)

۳۷۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: اردو نثر کا آغاز و ارتقا ص

۳۸۔ جبکہ باپ نے کہا تھا:

سارے عالم پہ بوں میں چھایا ہوا

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

۳۹۔ حوالہ سابق ص

تیسرا باب

اردو زبان کا آغاز

پوچھنا تاریخ سے پیدائش اردو کا حال
کسقدر ہے بزرگوں کی ولادت کا سوال
جس زبان کی آفرینش کا تجھے آئے خیال
اس کے اسباب و علل اور فلسفے کو دیکھ بھال
ملک میں اردو زبان افواج کی بھرتی نہ تھی
یک بیک الفاظ کی بارش ہوا کرتی نہ تھی

احاطق لکھنوی

اردو کے آغاز نشو نما اور ارتقا کی داستان بے حد طویل ہے۔ اس میں تاریخی انقلابات تہذیبی، تغیرات اور تمدنی کروٹوں کے لہر در لہر سلسلے شامل ہیں۔[1] اگرچہ اس کے آغاز کو مختلف خطوں (پنجاب دکن سندھ) سے مشروط کرنے کا رجحان خاصہ قوی نظر آتا ہے اور اپنے نظریے کی توثیق میں لسانی شواہد کی فراہمی میں ماہرین لسانیات نے جو محنت کی، اس کی اہمیت کتسلیم کی مگر لسانی موشگافیوں سے قطع نظر، اردو کا آغاز تو اسی روز ہو گیا تھا جب اس خطہ ارض پر انسانی حلق سے پہلا لفظ ادا ہوا تھا۔ وہ لفظ ادا کرنے والا کون تھا؟ اس کا تعلق کس قبیلے، نسل یا علاقے سے تھا؟ وہ لفظ بعد میں کس زبان سے وابستہ قرار پایا؟ یہ واقعہ کب رونما ہوا؟ یہ سب بعد کی باتیں، تاریخی تحقیقات اور لسانی دلائل ہیں۔ آج ہم جس شجر سایہ دار کو اردو زبان کا نام دیتے ہیں، اس کا بیج ہزاروں برس قبل اسی خطہ میں اس وقت بویا گیا جب تاریخ کا سورج ابھی طلوع نہ ہوا تھا۔ واضح رہے کہ جن ماہرین نے قدیم اور زمانہ قبل تاریخ کے بارے میں تحقیقات کی ہیں، وہ مختلف شواہد کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پہلا انسان موجودہ پنجاب کے علاقے میں آباد ہوا تھا۔ اس ضمن میں وادی سوان کا بطور خاص نام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ ویدک زمانے پر کام کرنے والے ایک مقالہ نگار پروفیسر سنکیلا کا بیان ہے کہ پہلا آدمی

تیسرا باب

اردو زبان کا آغاز

پوچھنا تاریخ سے پیدائش اردو کا حال
کمسنوں سے ہے بزرگوں کی ولادت کا سوال
جس زبان کی آمیزش کا تجھے آئے خیال
اس کے اسباب و علل اور فلسفے کو دیکھ بھال
ملک میں اردو زبان افواج کی بھرتی نہ تھی
یک بیک الفاظ کی بارش ہوا کرتی نہ تھی

اماطق لکھنوی

اردو کے آغاز نشو نما اور ارتقا کی داستان بے حد طویل ہے۔ اس میں تاریخی انقلابات تہذیبی، تغیرات اور تمدنی کروٹوں کے لہر در لہر سلسلے شامل ہیں۔[1] اگرچہ اس کے آغاز کو مختلف خطوں (پنجاب دکن سندھ) سے مشروط کرنے کا رجحان خاصہ قوی نظر آتا ہے اور اپنے نظریہ کی توثیق میں لسانی شواہد کی فراہمی میں ماہرین لسانیات نے جو محنت کی، اس کی اہمیت تسلیم کی مگر لسانی موشگافیوں سے قطع نظر، اردو کا آغاز تو اسی روز ہو گیا تھا جب اس خطہ ارض پر انسانی حلق سے پہلا لفظ ادا ہوا تھا۔ وہ لفظ ادا کرنے والا کون تھا؟ اس کا تعلق کس قبیلے، نسل یا علاقے سے تھا؟ وہ لفظ بعد میں کس زبان سے وابستہ قرار پایا؟ یہ واقعہ کب رونما ہوا؟ یہ سب بعد کی باتیں، تاریخی تحقیقات اور لسانی دلائل ہیں۔ آج ہم جس شجر سایہ دار کو اردو زبان کا نام دیتے ہیں، اس کا بیج ہزاروں برس قبل اسی خطہ میں اس وقت بویا گیا جب تاریخ کا سورج ابھی طلوع نہ ہوا تھا۔ واضح رہے کہ جن ماہرین نے قدیم اور زمانہ قبل تاریخ کے بارے میں تحقیقات کی ہیں، وہ مختلف شواہد کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پہلا انسان موجودہ پنجاب کے علاقے میں آباد ہوا تھا۔ اس ضمن میں وادی سوان کا بطور خاص نام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ ویدک زمانے پر کام کرنے والے ایک مقالہ نگار پروفیسر سنکیلا کا بیان ہے کہ پہلا آدمی

پنجاب کی سرزمین میں دور حجر اول کے پہلے حصے یا دوسرے برفانی عہد سے لے کر چوتھے برفانی عہد اور اس کے درمیان وقفوں میں گو متواتر اور مسلسل آباد رہا تھا لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ پہلا آدمی یا پنجاب کا پہلا آباد کار ایک ہی نسل سے تھا یا مختلف النسل تھا۔

آج یہ عہد ہم سے اتنا دور ہے کہ اس کا تصور بھی ممکن نہیں لیکن اتنا تو ہاور کیا جاسکتا ہے کہ خواہ وہ انسان ہمارے معیار کی رو سے جانوروں سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو لیکن وہ پھر بھی کسی نہ کسی انداز تکلم کا تو حامل ہوگا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ دو عورتیں بیٹھی ہوں اور وہ خاموش ہوں، خواہ وہ عہد حجر کی عورتیں ہی کیوں نہ ہوں۔

کسی بھی زبان کو لے لیں، وہ اپنی انفرادی حیثیت میں کبھی بھی دیگر لسانی اثرات سے آزاد اور تمدنی تغیرات سے محفوظ نہیں ملتی بلکہ ایک زندہ عضویت کی مانند متنوع بلکہ متضاد اور بعض اوقات تو متناقص عوامل کے اثرات قبول کرتی، مدارج ارتقا طے کرتی جاتی ہے۔ شاید زبان کو مکمل حالت میں کہنا درست نہ ہوگا، اس لیے کہ زبان ایک زندہ سماجی وقوعہ ہے جس کا زندہ انسانوں کے اعمال سے تعلق ہوتا ہے۔ یہ ان کے دکھ، درد، خوشی، مسرت، غور و فکر، جذبات، احساسات اور ان سے بھی بڑھ کر ان کی تخلیقی سرگرمیوں کی امین ہوتی ہے۔ اس سے انسانوں اور معاشرے کے ارتقا کے ساتھ ساتھ زبان بھی بڑھتی، پھلتی، پھولتی، مراحل ارتقا طے کرتی جاتی ہے۔ جس طرح کائنات میں دمادم صدائے کن فیکون کی گونج رہتی ہے اور انسانیت خوب سے خوب ترکی جستجو میں ہوتی ہے، اسی طرح زبان بھی وقت کے بہاؤ کے ساتھ بنتی سنورتی اور نکھرتی رہتی ہے، یہی نہیں بلکہ زمانے کے چلن اور عصری تقاضوں کی ہمنوائی میں انداز تزئین بھی بدلتی جاتی ہے۔ لہذا زبان کو مکمل ہونے کی بجائے نشو نما یافتہ یا ترقی یافتہ کہہ سکتے ہیں۔

آج یہ الفاظ ہماری روزمرہ کی گفتگو میں عام استعمال ہوتے ہیں۔ نانا، نانی، ماما، مامی، پھوپھا، پھوپھو، سالا، سالی، موسی، بر (بمعنی دولہا) پیڑھی (بمعنی نسل) نتھ، گھنا، آنچل، دھڑ، توڑا، کوس، ببول، بڑ، دھتورا، ککڑی، کریلا، نیم، پستہ، آولا، بھٹی، پھندا، آرا، ڈنڈا، برچھا، ڈھال، بوٹی، کھوری، جھونپڑی، دالان، پھاٹک، بھاڑا، بچھیا، چھتر، دھندا، ڈھیلا، ڈھارس، ڈھیٹ، گیرو، لاگ، مت، موڑ کھ، منڈلی، نانا، روڑا، اڑوس پڑوس، دھوم دھام، کھٹ پٹ[1]۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ اور ان جیسے لاتعداد الفاظ اس منڈوی زبان کے ہیں۔ جو ہمارے

علاقے میں آریاؤں بلکہ دراوڑوں سے بھی پہلے بولی جاتی تھی۔ یہ منڈا قبائل کی زبان تھی اور آج سے تقریباً چھ ہزار برس قبل رائج تھی۔ عین الحق زید کوئی، منڈا قبائل اور ان کی زبان کی قدامت کے بارے میں یہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں:

> عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ منڈا قبائل برصغیر کے قدیم ترین باشندے ہیں اور دراوڑوں کی آمد سے قبل یہاں آباد تھے۔ ماہرین منڈا قبائل کو قدیم آسٹریلوی نسل سے منسلک قرار دیتے ہیں جو کہ ایک وقت نیوزی لینڈ سے لے کر پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔ برصغیر کا منڈا گروہ کول، بھیل، سنتھال، منڈا، ساورا، ہو، کوروا جانگ اور کورکو وغیرہ قبائل پر مشتمل ہے۔۔۔۔ گو آمری نال تہذیب (یعنی منڈا قبائل کی تہذیب) کی ابتدا ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو جاتی ہے لیکن اس کی آخری منازل کے آثارات تقریباً دو ہزار دو سو ق۔م تک موجود ملتے ہیں جس کے بعد ہڑپائی تہذیب میں مدغم ہو جاتی ہے۔ اس کا ابتدائی دور حجری عہد سے تعلق رکھتا ہے لیکن آخری مراحل میں کانسی عہد کے اثرات بھی سامنے آتے ہیں جنھیں ہم غالباً ہڑپائی تہذیب سے تعلقات کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس دور میں ابھی تک فنِ تحریر نے جنم نہیں لیا تھا اور فنِ تعمیر میں بھی پختگی نہیں آئی تھی"[۲]۔

جبکہ رشید اختر ندوی نے مغربی محققین کی جدید تحقیقات کی روشنی میں لکھا ہے "ارض پاکستان کے سب سے پہلے آباد کار وہ سیاہ فام لوگ تھے جو برفانی عہد میں افریقہ اور ملیشیا سے یہاں پہنچے اور کسی ایک حصے میں نہیں بلکہ پورے ملک میں پھیل گئے تھے۔۔۔۔۔۔۔ ارض پاکستان کی سب سے پہلی آبادیاں ان لوگوں کی تھیں جو کوسیری یا منڈا زبانیں بولتے تھے اور جو انڈو چائنا نسل کے ایک گروہ مون کھمیر سے متعلق تھے"[۳]۔

محمد مجیب کے بموجب "ہندوستان کے وحشی قبیلے دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں، ایک تو وہ جو منڈا زبانیں بولتے ہیں چھوٹا ناگپور سنتھال پرگنوں، مہادیو پہاڑیوں اور صوبہ مدراس کے بعض شمالی ضلعوں میں ملتے ہیں جیسے کہ سنتھال گونڈ، بھیل، منڈا، ہو۔

دوسرے وہ ہیں جو سون خمیر زبانیں بولتے ہیں اور آسام میں کھاسی پہاڑیوں میں آباد ہیں جیسے کہ ناگ اور کھاسی(۴)۔

دیکھا آپ نے لفظ کا سفر کتنا طویل ہوتا ہے۔ متعدد الفاظ میں سے یہ چند منڈاوی الفاظ اس امر کا ثبوت ہیں کہ لفظ کی زندگی عوامی استعمال سے مشروط ہوتی ہے اور وہ اسی صورت ہی میں ہزاروں سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اگر وہ ہزاروں سال تک فعال رہ کر نوک زبان رہے۔ یوں اگر ایک طرف لفظ جذبات و احساسات کو زندگی بخشتا ہے تو دوسری طرف اس عمل سے وہ خود بھی زندگی پالیتا ہے۔ آبا اپنا ورثہ لفظ کی صورت میں بھی چھوڑتے ہیں اور الفاظ کے ذریعے سے ہی آنے والی نسلیں اس ورثے سے استفادے کے ساتھ ساتھ اس میں حتی المقدور اضافہ بھی کرتی ہیں (یا انہیں کرنا چاہیے)۔ یہ اضافہ جب تخلیقی سطح پر ہوتا ہے تو ثقافتی ورثہ اور تہذیبی روایات کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ لفظ اس ورثے کے تحفظ اور اگلی نسلوں کی منتقلی کے ضمن میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے، اس لیے کہ لفظ وہ محور ہے جس پر تہذیبی روایات، تمدنی اقدار اور تخلیقی صلاحیتوں کے سیارے گردش کناں ملتے ہیں۔

اقوام اور تہذیب و تمدن کی مانند زبان کی بھی اپنی مخصوص تاریخ ہوتی ہے، ایسی تاریخ جو بظاہر تو اقوام اور تہذیب و تمدن سے مربوط نظر آتی ہے (بلکہ بعض صورتوں میں تو ان ہی سے نام بھی پاتی ہے) لیکن درحقیقت وہی تہذیب و تمدن کے انداز بھی متعین کرتی ہے۔ یہ انداز تخلیقی سطح پر طے پاتے ہیں۔ جس طرح قوموں کو سونا نہیں، افراد امیر بناتے ہیں، اسی طرح زبان کو الفاظ (اپنی عام فہم اور سادہ صورت کے علاوہ) استعارات، علامات، تلمیحات اور صنائع لفظی و معنوی کی صورت میں تونگر بناتے ہیں۔۔۔ یوں دیکھیں تو اردو کے آغاز کی داستان لفظ کی حکایت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

لسانی تحقیق، تناظر:

جہاں تک اردو لسانیات میں اردو زبان کے آغاز کے بارے میں تحقیقات اور ان کی روشنی میں نظریہ سازی کا تعلق ہے تو آج یعنی ۱۹۹۳ء تک اس کی عمر صرف اکسٹھ برس بنتی ہے (حافظ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" ۱۹۲۸ء میں طبع ہوئی تھی)۔ اگرچہ "دکن میں اردو" ۱۹۲۳ء میں چھپی مگر لسانی اہمیت کے سوا "لسانیات کے سائنٹیفک تصور اور نظریہ

سازی کی بنا پر "پنجاب میں اردو" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ دیکھا جائے تو لسانی تحقیقات اور زبان کے تجزیاتی مطالعے کے لحاظ سے یہ عرصہ زیادہ نہیں لیکن جس زبان میں خود نثر کی عمر ۹۳ برس (میر امن کی "باغ و بہار" ۱۸۰۱ء) جس میں تنقید کی عمر سو برس (حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" ۱۸۹۳ء) ہو تو اس میں لسانی نظریہ سازی کی اتنی عمر بھی غنیمت ہے۔ البتہ انگریزوں اور دیگر مغربی مستشرقین کے کام سے قطع نظر کر کے صرف اردو مصنفین کو لیں تو انشا کی "دریائے لطافت" کو پہلی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے، ہر چند کہ یہ فارسی میں لکھی گئی۔

تحقیقی نقطہ نظر سے اردو لسانیات کا سرمایہ مخطوطات، قدیم مسودات اور قلمی بیاضوں کی صورت میں ملتا ہے اور ان ہی پر ماہرین لسانیات کی تحقیقات کی اساس استوار نظر آتی ہے۔ ان کے بعد کسی حد تک آثار قدیمہ کتب، سکے، فرامین اور اسی نوع کے دیگر تاریخی شواہد سے بھی کام لیا جاتا ہے لیکن اس نوع کے شواہد کی تفہیم اور ان سے وابستہ تاریخی کوائف کی چھان پھٹک کے لیے جس خصوصی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، ہمارے لسانی محققین میں سے حافظ محمود شیرانی کی استثنائی مثال سے قطع نظر شاید ہی اور کوئی محقق ان کی سوجھ بوجھ رکھتا ہو۔ البتہ مخطوطات، مسودات اور بیاضوں کے متن کی تحقیق میں ہمارے لسانی محققین نے خصوصی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور یقیناً یہ ان حضرات کی محنت (بلکہ مشقت) کا ثمر ہے جو آج اردو لسانیات میں تحقیقات کا دائرہ اتنا وسیع نظر آتا ہے۔ سر فہرست یقیناً حافظ محمد شیرانی ہیں، ان کے بعد نصیر الدین ہاشمی، مولوی عبدالحق، مسعود حسن رضوی، ادیب مسعود حسین خان، قاضی عبدالودود، محی الدین قادری زور، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر غلام مصطفی خان، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، رشید حسین خان، اکرام چغتائی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے محققین کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ ان کی کاوشوں کی بنا پر ایسے لاتعداد شعراء، نثر نگاروں اور کتب کی "دریافت نو" ہو گئی جو مخطوطوں اور بیاضوں میں گویا دفن ہو چکے تھے۔ اس سے تاریخ ادب کے آفاق میں وسعت کے ساتھ ساتھ لسانی اہمیت کا مواد بھی دستیاب ہو گیا، ایسا مواد جس سے ادبی مورخین، تاریخی مورخین اور لسانی ماہرین اب تک استفادہ کر رہے ہیں۔

اردو زبان کے آغاز اور ابتدائی نشو و نما سے وابستہ مباحث کے لحاظ سے بیشتر ماہرین

لسانیات میں اسے کسی خاص خطے سے مشروط کرنے کا رجحان قوی تر نظر آتا ہے چنانچہ پنجاب (حافظ محمود شیرانی: "پنجاب میں اردو") دکن (نصیرالدین ہاشمی "دکن میں اردو") سندھ (سید سلیمان ندوی: "نقوش سلیمانی") کو اردو کی جنم بھومی ثابت کرنے کے لیے جو نظریات پیش کیے گئے، انہیں خصوصی شہرت حاصل ہے بلکہ بیشتر لسانی مباحث بھی انہیں نظریات کی ضمنی پیداوار قرار پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کسی نظریہ میں بھی کلی صداقت نہیں ہو سکتی جبکہ ناکافی شواہد کے باوجود (یا پھر ان ہی کے باعث) جزوی صداقت سب میں نظر آ جاتی ہے۔

کسی خاص خطے یا مقام سے اردو زبان کو مخصوص کرنے کے پہلو بہ پہلو ان ماہرین کے لسانی نظریات بھی ملتے ہیں جنھوں نے اردو کا کسی خاص بولی یا زبان سے ناطہ جوڑا ہے۔ اس ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد (برج بھاشا) ڈاکٹر شوکت سبزواری (قدیم ویدک بولی) ڈاکٹر مسعود حسین خان (ہریانوی) ڈاکٹر سہیل بخاری (مرہٹی) اور عین الحق فرید کوٹی (دراوڑی) کے تصورات خصوصی تذکرہ چاہتے ہیں۔

پنجاب میں اردو:

بسکہ قصر ہند کا پہلا ہی در پنجاب تھا
اس لیے اردو کا اول مستقر پنجاب تھا
نقطہ مردم پئے اہل نظر پنجاب تھا
دائرہ تھا دور تک مرکز مگر پنجاب تھا
جیسے خط رخ کا بڑھے ابرو کی جدول چھوڑ کر
بڑھ چلا یوں نقش ثانی نقش اول چھوڑ کر
تخم جو الفاظ کے بوئے گئے پنجاب میں
ہر طرف بہتے پھرے وہ جنگ کے سیلاب میں

(حکیم ناطق لکھنوی)

اگرچہ حافظ شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" سے اس لسانی بحث کا آغاز ہوا کہ سب

سے پہلے اردو کے شجر کی تخم پاشی اور آبیاری اس خطے میں ہوئی لیکن اس لسانی بحث سے قطع نظر بھی پنجاب میں اردو کی روایت ملتی ہے، ایسی روایت جس کا مخطوطات اور قدیم قلمی بیاضوں میں دفن لسانی مواد سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ تخلیقی ادب کی زندہ روایت ہے۔

مسلم حکمرانوں کے عہد میں پہلے دہلی (اور کچھ عرصہ کے لیے لکھنؤ) کے دارالحکومت رہنے کی وجہ سے، یہ شہر تہذیب و تمدن اور ادب و شائستگی کا گہوارہ بنے رہے چنانچہ مغل سلطنت کے زوال کے باوجود دہلی کی مرکزی حیثیت قائم رہی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب بساط الٹی تو سب کچھ تلپٹ ہو کر رہ گیا۔ انگریزی اقتدار میں بدلے حالات کے تحت دہلی کے بجائے علی گڑھی سرسید کی احیاء علوم کی تحریک کا مرکز بنتا ہے۔ حالی پانی پت کے تھے، اس لیے وہ "مقدمہ شعروشاعری" میں لکھنوی شعرا پر اعتراضات کرنے کی جرأت کر گئے ان دو شہروں کے بعد جامعہ عثمانیہ کی صورت میں حیدرآباد دکن نثر کے فروغ اور تراجم اور سائنسی علوم کے مطالعات کا مرکز بنتا ہے۔ بالفاظ دیگر دہلی اور لکھنؤ کے باشندوں کے ہاتھوں سے ادب و لسانیات کی قیادت نکل چکی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ انھیں اس کا احساس تک نہ ہو سکا اور وہ تذکیروتانیث کی بحثوں میں ہی الجھے رہے۔

۱۸۵۷ کے بعد دہلی، لکھنؤ اور دیگر علاقوں کے تباہ حال شرفا اور تعلیم یافتہ مگر بے کار نوجوانوں کے لیے پنجاب نے ایک گوشہ عافیت کی صورت اختیار کر لی تھی کہ اس عہد کے بعض لٹے پٹے شرفا نے لاہور میں ملازمت اور عافیت پائی۔ محمد حسین آزاد کا تمام قابل ذکر کام لاہور میں ہوا، حالی نے پنجاب بکڈپو میں ملازمت سے انگریزی کی شُد بُد حاصل کی۔ ڈپٹی نذیر احمد بھی کنجاہ (گجرات) میں رہ چکے تھے اور سرسید نے نہ صرف اہل پنجاب کو زندہ دلانِ پنجاب کا خطاب دیا بلکہ مدد اور چندہ مانگنے کے لیے لاہور آئے۔ یہ تو صرف چند معروف شخصیات ہیں ورنہ نہ جانے کتنے ہی لوگ یہاں آئے ہوں گے۔ اگر ایسے اصحاب کا تذکرہ مرتب کیا جائے تو یہ بذات خود ایک تحقیقی موضوع بنتا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے تہذیبی سقوط کے بعد لاہور ہی میں جدید خیالات اور تصورات نو کے چراغ فروزاں ہوئے۔ ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کے منظوم مشاعرے اس انداز کی اولین مساعی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں مخزن کا اجرا، علامہ اقبال کی شاعری اور پھر فیض، راشد اور میراجی، جیسی شخصیات، الغرض برصغیر میں تخلیقی سطح پر فکر نو کی ہر تحریک کا بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق پنجاب ہی سے نظر آتا ہے۔ ایسے موضوع کے

حوالے سے صرف ادب کی بات ہو رہی ہے ورنہ سیاست، صحافت، فلم، موسیقی، مصوری، الغرض ہر معاملے میں پنجاب نے قائدانہ کردار ادا کیا۔

پرانا مسالہ

جب نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "کتاب "دکن میں اردو" علامہ اقبال کے خدمت میں پیش کی تو انھوں نے کتاب کے بارے میں رائے دیتے ہوئے اپنے خیال کا بھی اظہار کیا:

> "غالباً پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالہ موجود ہے۔ اگر اس کے جمع کرنے میں کسی کو کامیابی ہو گی، تو مورخ اردو کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے" (مرقومہ ۷ مئی ۱۹۲۵ء)

علامہ اقبال کو اس وقت تک یہ علم نہ ہو گا کہ ایک محقق "پرانا مسالہ" جمع کرنے میں لگا ہوا ہے جو اس خط کے تین برس بعد ایک اہم لسانی نظریہ کی صورت مدون ہوا، ایسا سدا بہار نظریہ ثابت ہوا کہ تائیدی اور تردیدی دلائل کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ "دکن میں اردو" سے نہ تو حافظ محمود شیرانی کی اہمیت کم ہوتی ہے اور نہ ہی ان کے کام کی۔ بلکہ آنے والے ماہرین نے تو ڈاکٹر شوکت سبزواری کی مانند کھل کر ان کی لسانی خدمات کا اعتراف کیا:

> "مولانا شیرانی مرحوم کا اردو داں طبقہ کو شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے غالباً اردو میں سب سے پہلے، اردو کے چہرہ سے نقاب اٹھا کر اس کے خط و خال کا گہرا ضمیناً مطالعہ کیا۔ پنجابی، ہریانی، برج بھاشا سے اس کا مقابلہ کر کے اردو داں طبقے کو تقابلی لسانیات کی ہلکی سی جھلک دکھائی"[5]۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری یہ تسلیم نہیں کرتے کہ "اردو نے پنجاب میں جنم لیا اور پنجابی کو بیٹی ہے"[6] لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی اس نظریہ کو غیر مشروط طور پر تسلیم کرتے ہیں:

> "پنجاب کا اردو سے وہی تعلق ہے جو ایک ماں کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے بیٹی بیاہ کر کہیں چلی جائے لیکن ماں اور بیٹی کا ازلی رشتہ اسی طرح

قائم رہتا ہے اور چونکہ ماں کبھی ڈائن نہیں بن سکتی اس لیے اردو اور
اہل پنجاب کا یہ رشتہ ناتا اسی طرح قائم ہے"(۷)۔

معلم اول:

ان آرا پر جب ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ رائے مستزاد کر لیں تو بطور لسانی محقق حافظ محمود شیرانی کا مرتبہ و مقام متعین ہو جاتا ہے ڈاکٹر خلیق انجم اپنے مقالے "ہندوستان میں اردو تحقیق و تدوین کا کام" میں لکھتے ہیں:

"اردو کے پہلے باقاعدہ محقق ہونے کا شرف حافظ محمود شیرانی کو حاصل ہے آپ اعلیٰ ترین محقق کے لیے کوئی بھی مغربی یا مشرقی معیار قائم کر لیں، حافظ محمود شیرانی اس پر پورے اتریں گے۔ ادبی تحقیق کی حافظ صاحب میں جو صلاحیتیں تھیں اور جو علم انھوں نے حاصل کیا تھا، وہ ان سے پہلے کسی کو نصیب ہوا اور نہ ان کے بعد"(۸)

مالک رام نے بھی "اردو میں تحقیق کا معیار" کے موضوع پر سمپوزیم میں اس رائے کا اظہار کیا:

"محمود شیرانی اور پرنسپل محمد شفیع وغیرہ کو بجا طور پر اس میدان میں ایک طرح سے اولیت کا فخر حاصل ہے"(۹)

جبکہ رشید حسن خان نے اپنے مقالہ "تدوین اور تحقیق کے رجحانات" میں حافظ صاحب کی اہمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

"اردو میں ادبی تحقیق کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے اور کسی تکلف کے بغیر شیرانی صاحب کو اردو میں تدوین و تحقیق کا معلم اول کہا جا سکتا ہے"(۱۰)۔

حافظ محمود شیرانی نے ایک سچے محقق کی مانند اس تصور کے خدوخال سنوارنے میں پیش رو ماہرین کی کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے پنڈت برجموہن دتا تریا کیفی اور شیر علی خان سرخوش کے تذکرہ "اعجاز سخن" کی اولیت کا اعتراف کیا جبکہ دیباچہ نگار عبدالمجید سالک نے

حافظ محمود شیرانی کے خاندان اور نجی کوائف کے بارے میں لکھتے ہوئے کتاب کے سلسلے میں اس رائے کا اظہار کیا:

"پنجاب میں اردو حضرت علامہ کے آفتاب تحقیق کی صرف ایک شعاع ہے لیکن اس ایک شعاع سے زبان اردو کے ماخذوں کا گوشہ گوشہ منور ہو گیا اور جو محققین اور طلبہ ایک صدی سے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے، ان کو ایسی روشنی مل گئی جو ہمیشہ ان کے لیے چراغ راہ بنی رہے گی"۔

عہد آفریں نظریہ:

حافظ شیرانی کا یہ نظریہ لسانی مباحث میں اب مستقل اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ ماہر لسانیات اس کی تائید کریں یا تردید اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ ہے کہ اب اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ بلاشبہ لسانیات میں یہ عہد آفریں نظریہ ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے دلائل کے سمندر کو مختصر ترین الفاظ کے کوزہ میں یوں بند کیا جاسکتا ہے:

"ہم اردو کے آغاز کو شاہجہان یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں لیکن یہ زبان اس زمانے سے بہت زیادہ قدیم ہے بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود انہی ایام سے ماننا ہو گا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں (ص ۱۰)۔ جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے، وہ نہ برج ہے نہ ہریانی نہ قنوجی ہے بلکہ وہ زبان جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی (ص ۳، ۲)۔ آج دیکھا جاتا ہے کہ دہلی کے قریب ہی تین زبانوں یعنی ہریانوی برج اور راجستھانی کا سنگم ہے۔۔۔ ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اردو یعنی وہی اردو ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بولی جاتی تھی، اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے۔ اگر اس کو اردو نہ مانیں تو اردو کی شاخ ماننے میں تو عذر نہیں ہونا چاہیے۔ بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان اسلامی دور، دہلی کے اثرات میں بنتی ہے"۔۔۔۔ (ص ۳) "اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان دہلی سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے اس نظریے کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں لیکن سیاسی واقعات اردو زبان کی

ساخت نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدے کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں" (ص ۴)۔۔۔۔۔ "چوتھی صدی کے اواخر سے محمودی حملوں کا آغاز ہوتا ہے اور تمام پنجاب آل ناصر کے زیر اقتدار آجاتا ہے" (ص ۶)۔۔۔۔ "اگر آل غزنہ سے پیشتر مسلمانوں کو کسی ہندی زبان کے اختیار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تو اس عہد میں جو خاصا دراز ہے، وہ پنجاب میں کوئی نہ کوئی زبان، سرکاری، تجارتی و معاشرتی اغراض سے اختیار کر لیتے ہیں جس کو غوریوں کے عہد میں جب دارالسلطنت لاہور سے دہلی جاتا ہے۔ اسلامی فوجیں اور دوسرے پیشہ ور اپنے ساتھ دہلی لے جاتے ہیں۔ دہلی میں جو زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے، پنجاب کا اردو کے ساتھ تعلق اسی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بعد کے زمانے میں بھی سیاسی اسباب اس تعلق میں تجدید پیدا کرتے رہتے ہیں۔ تغلق آٹھویں صدی میں، سید اور لودھی نویں صدی ہجری میں، ایسے خاندان ہیں جو خاص پنجاب سے نکل کر دہلی آتے ہیں۔ ان کے لشکر پنجاب اور پنجابیوں سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے کوئی تعجب نہیں۔ اگر ان نوواردوں نے دہلی کی زبان پر اثر ڈالا ہو" (ص ۷) اصل یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی ہے جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر توطن اختیار کر لیا ہے۔۔۔" (ص ۴۲) سندھ پنجاب میں ہندو مسلم اقوام سب سے پہلے ملتی جلتی ہیں، اس لیے انہیں اگر ایک عام زبان کی ضرورت ہوئی تو ان ممالک میں پیش آئی ہو گی اور اردو کو ان ممالک میں وجود میں آنا چاہیے۔۔۔۔ اگر سندھ میں نہیں تو پنجاب میں یقیناً انہیں کوئی نہ کوئی زبان اختیار کرنی پڑی ہو گی (۴۸)۔ جب ہم اردو اور پنجابی زبانوں کی صرف و نحو ان کے قواعد اور عام حیثیت کا مقابلہ کرتے ہیں، تو یہ اثر قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے اور دونوں زبانوں کی مماثلت کا راز صریح طور پر آشکارا ہو جاتا ہے (ص ۷۵)۔ پنجابی اور اردو اپنی صرف و نحو میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں (ص ۸۴)۔ اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر تیار ہوا ہے۔ اس کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تعریف کا اتحاد اسی نتیجے کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئی ہیں، تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے (ص ۱۰۳) اردو پر قدیم زمانوں میں پنجابی لہجہ غالب

تھا۔ اس کا ثبوت دینا موجودہ حالات میں بہت دشوار ہے، اس لیے کہ ان ابتدائی زمانوں کے جبکہ مسلمان لاہور سے ہجرت کر کے دہلی میں آباد ہوئے ہیں نیز اس کے بعد کی تین صدیوں تک کے کوئی کتابی نمونے ہم کو نہیں ملتے نہ ہم کو یہ علم ہے کہ اس عہد کے برج اور پنجابی میں کیا فرق تھا۔ الغرض برج پنجابی اور اردو کے نمونے کی عدم حاضری سے ہمارا کام بہت مشکل ہو گیا ہے (۱۳۷) "پنجاب میں اردو" زبان کی تعریف میں ایک نیا باب ہے جس کا اب تک کسی نے مطالعہ نہیں کیا ہے۔ خود اہل پنجاب بھی اس سے عموماً بے خبر ہیں۔۔۔۔۔ اردو کے لیے اہل پنجاب کی طبعی مناسبت اور قدیم اردو پر پنجاب کا اثر دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو پنجاب کے کسی خاص خطے یا ضلع کی زبان تھی۔ اس سوال کا قطعی جواب ہمارے پاس موجود نہیں" (ص ۲۹۴) حضرت مراد شاہ نامہ مراد ۱۲۰۳ ہجری:

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زبان ہے
کہ جس کا قائل اب سارا جہان ہے
(ص ۳۸۱)

اس موضوع پر مزید دلچسپی رکھنے والے اصحاب مندرجہ ذیل مقالات سے رجوع کر سکتے ہیں۔

۱۔ پنجابی اور اردو کے لسانی روابط از ڈاکٹر محمد ظفر خان مطبوعہ "صحیفہ" قسط اول جنوری مارچ ۱۹۸۶، قسط دوئم اپریل جون ۱۹۸۶ قسط سوئم جولائی ستمبر ۱۹۸۶، قسط چہارم اپریل جون ۱۹۸۹۔

۲۔ فارسی اور پنجابی کے لسانی روابط از ڈاکٹر محمد بشیر حسین ترجمہ اسلم انا مطبوعہ "مجلہ تحقیق" جامعہ پنجاب خصوصی شمارہ ۱۹۸۲۔

۳۔ اردو اور پنجابی کے لسانی رابطے از ڈاکٹر وحید قریشی مطبوعہ ماہ نو اکتوبر ۱۹۷۸

۴۔ "دکنی اور پنجابی کے لسانی رشتے" از ریاض قدیر مطبوعہ ماہ نو اکتوبر ۱۹۸۲

۵۔ "اردو اور پنجابی کے لسانی اور تہذیبی رابطے" مطبوعہ ماہ نو جنوری ۱۹۷۹

۶۔ "سرائیکی اور اردو کا باہمی رابطہ" از مسعود حسن شہاب دہلوی مطبوعہ ماہ نو جولائی ۱۹۸۱۔

دکن میں اردو:

نصیر الدین ہاشمی نے مولانا محمد حسین آزاد کے اسلوب "میں دکن میں اردو" کے مقدمہ کا آغاز کرتے ہوئے ایسے لسانی شواہد پیش کیے جن سے دکن میں اردو زبان اور اسے تخلیقی مراحل کا تعین ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دکن میں اردو کی نشوونما کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ایک نکتہ تو قابل توجہ ہے کہ سندھ میں محمد بن قاسم اور پنجاب پر محمود غزلوی کے حملوں سے کہیں پہلے دکن اور مسلمانوں بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ عربوں کے دکن سے تجارتی روابط استوار ہو چکے تھے۔

عرب ہند تعلقات

ان تجارتی تعلقات اور پھر ان سے جنم لینے والے تہذیبی و تمدنی اور لسانی اثرات پر مورخین اور لسانی محققین عرصے سے لکھتے آ رہے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر گستاولی زبان کی تالیف تمدن عرب (۱۸۸۴ء) ترجمہ شمس العلماء سید علی بلگرامی میں ان تجارتی تعلقات کی تفصیل موجود ہے۔

اس موضوع پر نصیر الدین ہاشمی نے بھی "دکنی کلچر" میں مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح سلیمان ندوی کی تالیف "عربوں کی جہاز رانی" (۱۹۳۵) میں بھی اس ضمن میں کار آمد معلومات جمع کی گئی ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے متذکرہ کتاب میں مولانا محمد مرتضی مرحوم کا ایک مقالہ: "سواحلِ ہندوستان پر مسلمانوں کا توطن" نقل کیا ہے۔ اس میں بھی دلچسپ تفصیلات جمع کی گئی ہیں۔

سید سلیمان ندوی کی تالیف "عرب ہند کے تعلقات" (۱۹۳۰) میں خاصا تحقیقی مواد فراہم کیا گیا ہے۔

عربوں کے ہندوستان سے تجارتی تعلقات کے نتیجے میں مولانا ندوی کے بموجب عربی میں ہندوستانی جہاز رانی کی بعض اصطلاحات شامل ہو گئیں جیسے بارجا (بیڑا) دونیج (ڈونگی) (ص ۷۸)۔ اسی طرح انھوں نے الانچی کو بھی ہندی الاصل بتایا ہے (ص ۸۱) مزید الفاظ کے لیے

صفحات (۸۳، ۸۵) ملاحظہ ہوں۔ مولانا سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق قرآن مجید میں تین ہندی لفظ مسک (مشک) زنجبیل (سونٹھ یا ادرک) اور کافور (کپور) موجود ہیں (ص ۸۵)۔ اسی طرح انھوں نے عربی میں سنسکرت کی بعض ان اصطلاحات کی نشاندہی بھی کی جو علم ہئیت سے متعلق ہیں (ص ۱۳۰)

عربوں کی بحری مہارت کا یہ عالم تھا کہ "بحیرہ روم سے ہندوستان کا دوسرا بحری راستہ عربوں نے دریافت کیا تھا" (ص ۱۰۰) واسا کوڈے گاما کو ہندوستان پہنچانے والا بھی ایک عرب تھا جس کا نام ابن ماجہ اور لقب اسد البحر تھا (ص ۱۰۱)

اس ضمن میں ڈاکٹر سید محمود نے بھی اپنی تحقیقات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ: "عربی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو ہندوستان سے میل جول کا پتہ دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں سنسکرت کا لفظ موجود ہے۔ عربی میں لفظ ہندی زبان کا مفرد قرار دیا گیا ہے۔ ایک سو لونٹ کے جھنڈ کو ہند یا ہندہ کہتے ہیں۔ ہند، ہندی یا ہندوانی اس تلوار کو کہتے ہیں جو بناوٹ میں مضبوط اور ہندوستان میں بنائی گئی ہو یا ہندوستانی لوہے سے بنی ہو۔ قرآن مجید میں ایسے کثیر الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو عربی میں داخل ہو گئے تھے بخاری، سیوطی وغیرہ جیسے محدثین اور ثعالبی جیسے ماہرین لغت نے ان کو یکجا کیا ہے۔ علما کی ان روایات کے مطابق جیسے کہ اور زبانوں کے الفاظ قرآن میں ہیں، ہندی یا سنسکرت کے الفاظ "ابلعی" اور "سندس" کا بھی استعمال موجود ہے۔۔۔۔۔ بلخ کا ایک محلہ تھا جس کو "ہندوان" کہا جاتا تھا۔ الجزری کی روایت ہے۔۔۔ وہاں ایک محلہ "ہندوان" تھا جہاں مقامات ہندوستان سے آنے والے لوگ ٹھہرا کرتے تھے[۱۲]۔

الجزری، ذہبی اور عسقلانی نے ہندوستان کے دو صحابیوں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک کا نام سرہانک یا سرمانک اور دوسرے کا نام رتن تھا۔ سرہانک کے متعلق الجزری کا بیان ہے کہ وہ قنوج کے راجہ تھے، دوسرے ہندوستانی صحابی رتن نے بہت شہرت حاصل کی۔ اسلامی دنیا میں رتن کی حدیثیں، الرتنیات کے نام سے متداول ہیں"[۱۳]

جب مسلمانوں نے جنوبی ہند کی تہذیبی اور تمدنی زندگی میں اپنا مقام مستحکم کر لیا، تو انھوں نے یقیناً تبلیغ دین کے مقدس فریضے کا آغاز بھی کر دیا ہوگا۔ تبلیغ دین کا دو پہلوؤں سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اول تو یہ کہ یہ تبلیغ مقامی نوعیت کی ہو گی یعنی مقامی آبادی سے

مسلمانوں کے سماجی روابط یا شادیوں کے باعث لوگ مسلمان ہوئے ہوں گے۔ اس ضمن میں دین کی سوجھ بوجھ رکھنے والے حضرات نے بھی فعال کردار ادا کیا ہو گا۔ تبلیغ کا دوسرا پہلو صوفیائے کرام کی کاوشوں سے متعلق ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں اسلام کا فروغ بادشاہوں کے مقابلے میں صوفیائے کرام کی شخصی جاذبیت، وسیع المشربی، دین سے محبت، فقر و غنا اور علم و فضل کی بدولت ہوا۔ چنانچہ ہندوستان کے دیگر علاقوں کی مانند صوفیائے کرام، دکن اور بنگال تک پہنچے اور اپنے حسنِ اخلاق کو اسلام کا عملی نمونہ بنا کر یوں پیش کیا کہ لوگ مسلمان ہوتے گئے۔ یہ بوریا نشین دلوں کے حکمران تھے اور ان کا عمل صحیح معنوں میں فاتح عالم کی تفسیر تھا۔ ان کا مسلک تھا: پر مجھے گفتگو عوام سے ہے" اسی لیے انھوں نے ہمیشہ مقامی لوگوں سے ان کی اپنی زبان میں بات کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ مخصوص صورت حال جنم لیتی ہے جس کے باعث صوفیائے کرام کی تحریروں، کتابوں، مکتوبات، منظومات اور ملفوظات میں آج کے ماہرین لسانیات کے لیے بیش بہا سرمایہ ملتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس موضوع پر جو رسالہ "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" (کراچی طبع سوم ۱۹۵۳) لکھا تھا، اگرچہ جدید لسانی تحقیقات اس ضمن میں مزید شواہد بہم پہنچا چکی ہے، تاہم یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ صوفیا کی شخصی مساعی نے زبان کے ابتدائی خدوخال کے نکھارنے اور سنوارنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا اور یقیناً دکن میں بھی یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ ان کی دینی زبان (عربی) تہذیبی زبان (فارسی) اور مقامی (بھاشائیں اور بولیاں) مل کر جو لسانی کھچڑی پکا رہی تھیں اس نے پک کر اردو کا نام پالیا۔

اس ضمن میں الفاظ کا تبادلہ یقینی تھا۔ جب جنوبی ہندوستان کی زندگی کے متعدد شعبے متاثر ہونے لگے تو مقامی زبانوں میں عربی اور فارسی الفاظ کی بازگشت بھی سنائی دی جانے لگی۔ چنانچہ ڈاکٹر خلیق انجم "ہندوستانی قومیت اور کلچر" میں لکھتے ہیں: "جنوبی ہند کی زبانوں اور خاص طور سے "ملیالم" اور "کونکنی" نے براہ راست عربی سے الفاظ مستعار لیے"[۳۰]۔

گلزار دکن:

یہ ہے وہ تاریخی سماجی اور دینی پس منظر جس میں جنوبی ہند کی دھرتی میں اردو کے بیج بوئے گئے۔ ایسے بیج جو بار آور ہو کر اعلیٰ تخلیقات کے ثمر لائے۔ شمالی ہند کے گلشن ادب

میں اردو ابھی تک سبزہ بیگانہ تھی۔ جنوبی ہند میں طرز احساس کی تبدیلی سے اردو، تہذیبی رویوں کو اقدار نو سے روشناس کروا رہی تھی۔ ملک کے دونوں حصے اس لسانی تفسیر سے ناآشنا رہے تو اس کا بنیادی سبب فاصلوں گھنے جنگلات اور کوہ بندھیاچل کی صورت میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ یہ فاصلہ محض جغرافیائی نوعیت ہی کا نہیں تھا بلکہ تہذیب و تمدن مذہبی، رسوم و عقائد، نسلی خصائص وغیرہ کئی طرح سے اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ آریاؤں یونانیوں اور پھر مسلمانوں کے باعث شمالی ہند کی تہذیبی فضا جنوبی ہند جیسی نہ تھی جو صدیوں سے دراوڑی اثرات کی حامل تھی بلکہ آج بھی تہذیبی اور تمدنی سطح پر شمالی اور جنوبی ہند میں خاص فرق ہے۔

شمالی اور جنوبی ہند میں تہذیبی ادغام کا عمل اس وقت تیز تر واضح صورت اختیار کر لیتا ہے جب علاؤالدین خلجی ۱۲۹۳ عیسوی میں دکن پر پہلی مرتبہ حملہ آور ہوتا ہے۔ خلجی کی دہلی واپسی کے بعد اسی کے سپہ سالار ملک کافور نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ دیوگری (۱۳۰۶ ہجری) ورنگل یا تلنگانہ (۱۳۰۹ عیسوی) دوار سمندر اور معبر (۱۱-۱۳۱۰ء) کی فتح کے دو سال بعد یعنی ۱۳۱۲ء تک تمام مہاراشٹر مسلمانوں کے زیر نگیں ہو چکا تھا۔ قیاس ہے کہ یہ جنگیں ختم ہونے کے بعد جہاں امور سلطنت کے سلسلے میں دہلی [illegible] سے متعدد [illegible] وزراء ارکین دولت اور لشکریوں کی کثیر تعداد نے دکن کا رخ کیا اور ان کے ساتھ عام افراد کے اہل خانہ اور ان کے ملازمین دکن میں آکر آباد ہوئے ہوں گے، اس امر کا قوی امکان ہے کہ لاتعداد فوجیوں نے بھی شمالی ہند واپسی کی بجائے وہیں سکونت کو ترجیح دی ہوگی۔ یقیناً آپس میں سماجی روابط بھی ہوتے ہوں گے اور شادی بیاہ بھی، گویا دو علاقائی تہذیبوں کے ادغام کا عمل شروع ہو گیا۔ اس عمل میں مزید تیزی اس وقت پیدا ہوئی جب محمد تغلق (۵۱-۱۳۲۵ عیسوی) نے ۱۳۲۶ء کی ایک سہانی صبح دہلی کی بجائے دکن کے شہر دیوی گری (دیو گیر۔ دیوگری۔ دیو گڑھ) کو دولت آباد (تقبتہ الاسلام) کے نام سے مشرف بہ اسلام کر کے اہل دہلی کو وہاں منتقلی کا حکم دیا، ایسا حکم جس نے دہلی کی سماجی زندگی میں ہلچل پیدا کر دی۔ سات سو میل طے کرنے اور تاریخ ہند کی اس عجیب و غریب لانگ مارچ میں متعدد افراد سفر کی صعوبتوں کی تاب نہ لا کر کھپ گئے۔ جو پہنچے ان میں سے بعض کا اس نئی دھرتی کی اجنبی زبان اور ناما نوس کلچر میں دل نہ لگا جب کہ بعض کے اس دھرتی نے یوں پاؤں پکڑے کہ جب

محمد تغلق نے واپسی کا ارادہ کیا تو لاتعداد لوگوں نے مراجعت نہ کی اور بقول حافظ محمود شیرانی "ان میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے نئے وطن کو ترجیح دی اور یہیں آباد ہو گیا۔ دلی کے یہ آباد کار اپنے ساتھ دلی کا تحفہ یعنی زبان اردو بھی ساتھ لائے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اردو زبان دکن میں مرہٹی اور تلنگی زبانوں کے درمیان گلیوں اور بازاروں میں بولی جانے لگی۔ بغاوت امیران صدہ کے واقعہ نے دکن کو بہت جلد خاندان تغلق کی اطاعت سے آزاد کر دیا اور عین وقت پر محمد تغلق کی وفات نے حسن بہمنی کو ممالک دکن کا مستقل تاجدار تسلیم کرا دیا۔ بہمنی دور جو ۷۴۸ ہجری سے شروع ہو کر ۹۳۲ ہجری پر ختم ہوتا ہے"(۱۴)۔

دکنی:

نصیر الدین ہاشمی کے بقول "یہ فاتح اپنے ساتھ جو زبان دکن میں لے کر آئے وہ یہاں آزادانہ نشو و نما حاصل کرنے لگی کیونکہ اس کے مقابل کوئی اور زبان جو اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرتی یہاں نہیں تھی۔ اس کے برخلاف شمال میں برج مروج تھی جو وہاں کے دیہی باشندوں کی عام زبان تھی۔ اس طرح یہ زبان مسلمانوں کے ساتھ دکن پہنچی۔ عام طور سے پردیسی اور دیسی دونوں نے استعمال کی(۱۵)۔

حافظ محمود شیرانی بھی اس استدلال سے متفق ہیں چنانچہ ان کے بقول اردو زبان دکن میں فروغ پاتی رہی۔ اگرچہ تحریری شہادت موجود نہیں تاہم قیاس میں آتا ہے کہ مسلمانوں کی اس نوی بستی کی عام زبان اردو تھی کیونکہ اس کو تعلیم یافتہ فرقہ بول سکتا تھا۔ فارسی صرف درباری زبان تھی اور کوئی تعجب نہیں کہ ضرور تا اگر اس عہد میں اردو تالیفات شروع ہو گئی ہوں"(۱۶)

جہاں تک اس تشکیل پانے والی زبان کے نام کا تعلق ہے تو نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے دکن میں یہ زبان ہندی اور دکنی سے موسوم رہی ہے۔ قدیم سے قدیم دکنی شعرا اور مصنفین نے بھی اس کو ہندی اور دکنی کے نام بھی دیے ہیں ۱۲۸۶ ہجری تک بھی دکنی اور ہندی کا نام رائج تھا(۱۷)۔

اس زبان کو دکھنی کہنے کے بارے میں ڈاکٹر جاوید وششٹ نے اپنے مقالہ " دکنی

شاعری میں ہندوستانیت" میں یہ دعوی کیا ہے:

"بھوگ بل کا مصنف قریشی پہلا شخص ہے جس نے اس زبان کو دکھنی کے نام سے پکارا ---- محمود شاہ بہمنی (۱۵۲۰ - ۱۴۸۲) کے عہد کا ایک شاعر قریشی تھا۔ اس کا منظوم رسالہ بھوگ بل (۱۶۱۴ عیسوی) جنس کے موضوع پر ہے یہ فارسی سے ترجمہ کیا گیا تھا اور اردو میں اس موضوع پر پہلا رسالہ ہے"(۱۸)۔

دکنی کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے:

(۱) نصیر الدین ہاشمی۔ "دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین" دہلی ۱۹۶۳

(۲) محی الدین قادری زور --- دکنی ادب کی تاریخ" کراچی ۱۹۶۹"

(۳) ڈاکٹر محمد علی اثر --- "دکنی و دکنیات (وضاحتی کتابیات)" اسلام آباد ۱۹۸۶ء

محمد تغلق کا یہ فیصلہ تاریخ ہند کے چند اہم ترین اور نزاعی فیصلوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس فیصلے کے دہلی کی سیاست پر جو اثرات مرتب ہوئے، ان کا مطالعہ ہمارے موضوع کی حدود سے خارج ہے۔ البتہ تہذیبی، تمدنی، لسانی اعتبارات سے یہ فیصلہ بے حد اہم اور دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا کہ شمالی اور جنوبی ہند کے مقفل دروازوں کے لیے یہ کھل جا سم سم کے مترادف تھا۔

بہمنی قطب شاہی اور دیگر بادشاہوں کے دور میں اردو زبان نے تخلیقی اعتبار سے جو ترقی کی، وہ تاریخ ادب اردو کا اہم ترین باب ہے اور نصیر الدین ہاشمی نے بڑی محنت سے دکن میں اردو میں دکنی تخلیقات کی جستجو کی ہے۔ وہ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں "اس امر کا ابھی کوئی قطعی ثبوت نہیں ملا کہ شمالی ہند میں اردو احاطہ تحریر میں کب آئی مگر بلا خوف تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دکن میں اس کی ابتدا پہلے ہوئی" (ص ۲۶)۔ انہوں نے "صاحب حال وقال درویشوں" کی سرپرستی اس کا باعث قرار دی ہے چنانچہ ان کے بموجب "جدید تحقیقات کی رو سے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسینی المتوفی ۸۲۵ ہجری وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اس کی ابتدا کی اور معراج العاشقین اور ہدایت نامہ مرتب فرمایا" (ص ۲۷) "دکنی زبان میں نظم کی ابتدا نثر کے بعد ہوئی" (ص ۲۸) نظامی پہلا شاعر ہے جو سلطان احمد شاہ بہمنی المعروف نظام شاہ (۶۷-۶۵ ہجری) کے دور حکمرانی میں موجود تھا"

(ص ۳۱) "دکنی زبان میں غیر مسلسل نظم کہنے کی بجائے مسلسل نظم ہی کا آغاز ہوا اور مثنوی کی پہلے بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد رباعی۔ غزل۔ قصیدہ کا آغاز ہوا (ص ۳۱) "اردو کی ترقی اور ارتقا کے لحاظ سے ہم حسب ذیل دور قرار دیتے ہیں۔

پہلا دور	بہمنی اردو ۷۴۳ ہجری یا ۹۰۰ ہجری
دوسرا دور	قطب شاہی اور عادل شاہی اردو ۹۰۱ ہجری تا ۱۱۰۰ ہجری
تیسرا دور	مغلیہ اردو ۱۱۰۱ تا ۱۱۳۶ ہجری
چوتھا دور	سلطنت آصفیہ اور اردو ۱۱۳۶ تا ۱۲۲۰ ہجری
پانچواں دور	سلطنت آصفیہ اور اردو ۱۲۲۰ تا ۱۳۰۱ ہجری
چھٹا دور	سلطنت آصفیہ اور اردو ۱۳۰۱ تا ۱۳۳۶ ہجری
ساتواں دور	سلطنت آصفیہ اور اردو ۱۳۳۶ ہجری

ہاشمی کی الجھن

سوال یہ ہے کہ کیا واقعی دکن اردو زبان کا مولد ہے۔ اس ضمن میں خود نصیر الدین ہاشمی کے ذہن میں بھی شکوک محسوس ہوتے ہیں۔ لسانی شواہد کی بنا پر جس وثوق انداز سے شیرانی نے پنجاب کو اردو کا مولد قرار دیا تھا، اس طرح ہاشمی نے دعویٰ نہیں کیا چنانچہ پہلے باب کے آغاز ہی میں اردو کے آغاز کے بارے میں معروف لسانی نظریات ---- پنجاب، سندھ، دکن، دوآبہ گنگا جمنا کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"جن اصحاب کا یہ دعویٰ کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہو سکتا"۔ (۱۹)

لیکن چند صفحات کے بعد ان دونوں مقامات پر اسلامی اثرات کے نفوذ اور ہندو مسلم آبادی کے ملاپ سے جنم لینے والی لسانی صورت حال کے تجزیہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

جو دعویٰ اردو کے دکن سے پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے، وہ بہت بڑی حد تک صحیح ہو سکتا ہے مگر جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے کے مانع ہیں، وہی امور یہاں بھی مانع آتے ہیں، اس لیے ہم دکن کو بھی اردو کا مولد قرار نہیں دے سکتے۔ (۲۰)

نصیر الدین ہاشمی جس الجھن کا شکار نظر آتے ہیں، اس کو سمجھنا اتنا مشکل نہیں۔ انھیں یہ احساس ہے کہ شمال یا دہلی سے آنے والے باشندے اپنے ساتھ ایک زبان (جو یقیناً اردو تھی) لے کر آئے تھے۔ وہ خود بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمان فاتحین، پنجاب سے لے کر دہلی تک آباد ہو گئے۔ اس زمانے میں یہاں جدید ہندو آریائی دور کی پراکرت زبان بولی جاتی تھی۔ اس دیسی زبان میں غیر ملکیوں کی زبان کی آمیزش ہونے لگی اور اس امتزاج سے اردو پیدا ہوئی" (ص ۲۰) اور یہی اردو محمد تغلق کی بدولت دکن میں پہنچی تو "اس جدید زبان کا یہاں خیر مقدم ہوا اور عام طور سے ہر شخص اس کو بولنے لگا اور کام کاج میں بھی آنے لگی" (ص ۲۱)۔ واضح رہے کہ نصیر الدین ہاشمی نے یہ نہیں کہا کہ دکن اردو کی جنم بھومی ہے بلکہ وہ تو لسانی صورت حال کا تجزیہ کر کے یہ لکھتے ہیں:

"ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے" (ص ۱۹)

عام طور سے یہ باور کیا جاتا ہے کہ نصیر الدین ہاشمی نے سب سے پہلے دکن میں اردو کی نشو و نما کی طرف توجہ دلائی لیکن ایسا نہیں کیوں کہ ان سے کہیں پہلے نصیر حسین خیال "داستان اردو" (مطبوعہ ۱۹۲۶ء) میں اس امر کی طرف توجہ دلا چکے تھے۔ انھوں نے یہ لکھتے ہوئے کہ "دکن اپنی زبان کا متلاشی تھا" دکن میں اردو کے حوالے سے وہی تاریخی شواہد پیش کیے جن کا حوالہ دیا جا چکا ہے اور اس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا:

> "اردو کی ہزار سالہ تاریخ اب آپ کے پیش نظر ہے اور اس کے ملاحظہ کے بعد خیال کیا جاتا ہو گا کہ جس زبان کو بابر نے منہ لگایا اور جو شاہ جہاں کی چہیتی کہلائی، اس کا جوڑا دہلی کے لال قلعہ میں قطعہ ہوا ہو گا۔ ہونا تو یہی چاہیے تھا لیکن ایسا ہوا نہیں اور اس کے برخلاف اس کا جامہ دکن اور وہاں کے معمولی گھر میں تیار ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ فارسی وہاں مٹ چکی تھی اور ملکی زبان (دکھنی) اس کی جگہ لے چکی تھی۔ اظہار جذبات کی ضرورت جس وقت عام اور ناگزیر ہوئی، اس وقت اسی نئی اعلیٰ دکنی اردو سے وہ ضرورت پوری کی گئی اور اس طرح اس ابھاو نے جنوب کو شمال پر فوقیت دے کر افضلیت کا تاج دکھنی اور دکھن کے سر پر رکھ دیا"۔ (۲۱)

اور آخر میں مسعود حسین ... ی ادیب کے "دکن میں اردو" پر تبصرہ سے ایک

اقتباس:

"یہ خوبی روشن ہو جاتا ہے کہ مولف نے اس کی تالیف میں کس قدر محنت کی ہے اور کس قدر مفید معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ اب میں چند نقائص کی طرف قابل مولف کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ موجود نہ ہوتے تو کتاب کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی۔ سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ مولف نے بعض نہایت اہم مباحث پر مطلق بحث نہیں کی۔ اردو زبان کی تاریخ میں یہ بات نہایت تعجب خیز ہے کہ جو زبان دہلی اور نواح دہلی میں بولی جاتی تھی، وہ بندھیاچل کے پہاڑی سلسلے کو پار کر کے دکن کے دور دراز سلسلے میں کیوں کر رائج ہو گئی۔ مولف نے مقدمہ کی ابتدا میں صرف اتنا لکھا۔۔۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مسلمان فاتحوں نے شمال اور مغرب کی طرف سے آکر شمالی ہند میں اردو کی بنا قائم کی تھی، انھی نے دکن میں بھی اردو کی بنیاد ڈالی مگر تاریخ اس بیان کی تصدیق نہیں کرتی۔ زبان اور انشا پردازی کے تدریجی ارتقا سے بھی بحث نہیں کی گئی"۔ (۲۳)

اس اقتباس کا مطلب نصیر الدین ہاشمی کی سعی کو نامشکور بنانا نہیں بلکہ صرف اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ شیرانی کی مانند ہاشمی نظریہ ساز نہیں ہے۔ انھوں نے ایک بے محقق کی مانند شواہد کی عدم دستیابی کی بنا پر کوئی غلط دعویٰ نہیں کیا لیکن وظیفہ یہ ہے کہ لسانیات کی سبھی کتب میں "دکن میں اردو" کا اس انداز سے تذکرہ کیا جاتا ہے گویا ہاشمی نے قطعی طور پر دکن کے اردو کا مولد ہونے کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود بھی کتاب کی اہمیت ہرگز کم نہیں ہوتی کیوں کہ حافظ محمود شیرانی سے بھی پہلے نصیر الدین ہاشمی نے ایک مخصوص علاقہ سے متعلق لسانی مواد یکجا کر دیا بلکہ اس پیش رو کتاب کے نتیجے میں پھر ایسی کتابیں سامنے آنے لگیں جن میں اردو زبان کا تعلق کسی خاص علاقے سے ظاہر کیا گیا تھا۔

ریگستان میں نخلستان

جہاں تک سندھ کا تعلق ہے تو ڈاکٹر مہر عبدالحق کے بموجب "وادی سندھ ہند سے الگ ملک تھا" وہ اس ضمن میں مزید رقم طراز ہیں کہ "سندھ کے حدود مختلف زمانوں میں مختلف رہے ہیں یعنی سندھ کے حاکموں کا قبضہ جہاں تک رہا، سب سندھ کہا جاتا تھا۔ راجہ داہر جو سندھ کا آخری ہندو راجہ تھا، اس کے عہد میں جب عربوں نے حملہ کیا تو سندھ کی حدیں یہ تھیں۔ شمال میں دریائے جہلم کا منبع جس میں کشمیر کے نشیبی اضلاع شامل تھے اور کوہ کابل کا سلسلہ اس کی حد بندی کرتا تھا، پھر شمال مغرب تک دریائے ہلمند پر جا کر وہ ختم ہوتا اور جنوب مغرب میں ایران اور سندھ کی سرحد اس مقام پر بھی جہاں ساحل کے سامنے مکران کا جزیرہ مشہور واقع ہے۔ جنوب کی طرف بحیرہ عرب اور جنوب مشرق میں خلیج کچھ۔ مشرق میں راجپوتانہ اور جیلسیر کی سرحدیں آ کر ملتی ہیں۔ غرض اس وقت تمام شمال مغربی صوبہ پنجاب کا علاقہ، افغانستان کا وہ علاقہ جو دریائے ہلمند تک ہے، سارا بلوچستان موجودہ سندھ مع کچھ یودھ پور کی سرحد تک کا نام صوبہ سندھ تھا۔ ۳۷۵ہجری کے جغرافیہ لکھنے والوں نے سندھ اور اس کے ملحقہ ممالک کو ایک اقلیم قرار دیا ہے اور اس کا نام اقلیم سندھ رکھا ہے"[۲۲]

سندھ کی اپنی تہذیبی اور لسانی اہمیت ہے۔ اس میں منجودارو کی صورت میں سمیریوں اور دراوڑوں کی تہذیب و تمدن کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس خطے کے بابل نینوا وغیرہ کے ساتھ تجارتی روابط بھی تھے۔ جب دراوڑوں نے آریاؤں سے شکست کھائی تو ان کے بعض گروہ سندھ میں آباد ہو گئے، بستیاں بسائیں اور تمدن کی بنیاد رکھی۔ مکرانی لوگ اور براہوی زبان ان ہی کی باقیات ہیں۔

عرب سندھ تعلقات

عرب سندھ تعلقات خاصے قدیم عرصہ سے استوار نظر آتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کے بموجب:

"ایران کے بادشاہوں کا بلوچستان اور سندھ پر تسلط رہا لہذا سندھ کے بعض جنگجو

قبیلوں میں سے دو کا ذکر عربوں نے کیا ہے اور وہ جاٹ یا جٹ (زط) اور میدھیں۔ یہ دونوں سندھ کی مشہور قومیں تھیں" وہ مزید لکھتے ہیں "عبداللہ بن مسعود صحابی نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک خاص شکل و صورت کے لوگوں کو دیکھا تھا جن کی نسبت انھوں نے بتایا کہ ان کا چہرہ جاٹوں کی طرح تھا۔ ایران کی شکست کے بعد یہ جاٹ عربوں کے ساتھ مل گئے۔ حضرت علیؓ نے جنگ جمل کے موقع پر بصرہ کا خزانہ انہی جاٹوں کی نگرانی میں چھوڑا تھا۔ امیر معاویہ نے ان کو رومیوں کے مقابلے کے لیے شام کے ساحلی شہروں میں لے جا کر بسایا۔ ولید بن عبدالملک نے اپنے زمانے میں ان کو انطاکیہ میں لے جا کر آباد کیا" مولانا ندوی نے تو یہاں تک بھی لکھا" مہابھارت میں جب کوروؤں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈروں کو اس کے اندر لا کر پھونک دینا چاہا تو ودرجی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹر جی نے اسی عربی زبان میں ان کو جواب دیا۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو عربوں اور ہندوؤں کا رشتہ کتنا پرانا ثابت ہوتا ہے "(۲۳)۔

ہندوستان سے عربوں کی دلچسپی کے بارے میں ہیں گزشتہ سطور میں مفصل لکھا گیا لیکن وہ جنوب کے حوالے سے تھا۔ جہاں تک شمال کا تعلق ہے تو یہ مسلم ہے کہ درہ خیبر کے مقابلے میں سندھ کہیں پہلے باب اسلام ثابت ہوا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

> "حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں ہندوستان کے خشکی کے راستوں کی تحقیق و دریافت کی گئی اور بہت سی معلومات حاصل کی گئیں جن سے بالآخر آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ میں رہنمائی ہوئی"۔

جب کہ نصیر حسین خان خیال کے الفاظ میں "عرب ایران سے فرصت پا کر اپنے ہمسایہ ملکوں کی طرف بڑھے۔ فتح نہاوند (۵۲۱) سے اٹھارہ برس بعد، ہوائے باغ ہند سر میں سمائی قلعہ ہرات۔ (۳۸ھ خلافت علی مرتضیٰ) یعنی دروازہ ہند کھولا گیا اور پھر کابل (۴۳ھ/۶۶۱) پہنچ کر وہ ملتان اتر آئے اور وہاں ڈیرے ڈال دیے۔ شمال و مغرب کے پہاڑ اس ہلچل سے گونج رہے تھے، ادھر ان کی ایک جماعت دریائے سندھ عبور کر کے راجپوتانہ کے ریگستان میں گھس آئی کہ علاقی ایک عرب زادہ بھی اسی زمانے میں اپنے جیش سے علیحدہ ہو کر اپنے رفقا سمیت ادھر آیا اور ہندی بن کر اس نے راجہ داہر (آخری فرمانروائے سندھ

جس نے قاسم کے ہاتھ سے شکست پائی) سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے۔ ان دو پرانی قوموں اور زبانوں (ہندی و عربی) کا ملاپ قدرتاً قائم ہو رہا تھا کہ محمد بن قاسم (۹۱ھ/۷۱۱ء) کی کمک نے اس رشتے کو مضبوط و مستحکم کر دیا"۔ (۲۵)

محمد بن قاسم سندھ میں تین برس رہا۔ معاصر شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر متعصب اور روادار حکمران ثابت ہوا۔ مقامی آبادی اس سے کس قدر متاثر تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی رخصت اور المناک موت کے بعد اہل سندھ نے اسے اوتار مان کر اس کا بت بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔ مولف "داستان اردو" نے چچ نامہ و تاریخ میر معصوم کے حوالے سے مندرجہ بالا کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ "راجہ داہر کی رانی لاڈی، محمد بن قاسم کے عقد نکاح میں آئی۔ حاکم دیبل کی بیٹیاں حجاج (امیر وقت) کے پاس بھیجی گئیں اور قلعہ داور (الور) کے سر ہونے پر علاوہ تیس ہزار لشکری قیدیوں کے تین ہندی شہزادیاں اور راجہ داہر کی سگی بھانجی حبیبیہ بھی عراق لائی گئیں اور حبیبیہ کا نکاح عبداللہ بن عباس سے ہوا اور پھر اسی راجہ کی دو اور شہزادیاں (سوریا دیبی و پرمل دیبی) خلیفہ وقت کے محل میں داخل ہوئیں"۔ (۲۶)

عربوں کی کثیر تعداد سندھ میں آباد ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے ایک ایسا وقت بھی آگیا ہو گا جب اپنوں میں مزید شادیوں کی گنجائش نہ رہی ہو گی اور یوں مقامی آبادی سے مناکحت کا سلسلہ شروع ہوا ہو گا۔ ادھر روزمرہ کے روابط تجارت، کاروبار اور تبلیغ، ان سب امور نے جہاں عربوں اور سندھیوں کے تعلقات کے فروغ سے تمدن تبدیل کیا ہو گا وہاں مقامی بولی عربی کے ملاپ سے لسانی صورت حال بھی متغیر ہوئی ہو گی۔ مزید بر آں جو تیس ہزار قیدی لشکری اور شہزادیاں بھیجی گئیں، ان کی زبان نے بھی تو عربی پر کچھ نہ کچھ اثرات ڈالے ہوں گے۔

یورپین حکمرانوں کے برعکس مسلمان فاتحین کی یہ خوبی رہی ہے کہ وہ جس خطے میں بھی بطور فاتح داخل ہوئے، وہاں کی تہذیب و تمدن اور زبان و مذہب کو نابود کرنے کے برعکس نہ صرف یہ کہ انھیں فروغ دینے کے طریقے بہم پہنچاتے رہے بلکہ ان میں اپنی تہذیب و تمدن کے بہترین عناصر کے امتزاج اور عربی زبان کی آمیزش سے مشترک تہذیب و تمدن اور زبان کی اساس استوار کر دیتے جس میں دونوں کے بہترین حقائق نمایاں

نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں ایران، مصر، اندلس اور ہندوستان میں جنم لینے والے تہذیبی اور لسانی امتزاج کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سندھ میں بھی مسلمانوں کے زیر اثر امتزاجی عمل کا آغاز ہو جاتا ہے۔ محمد بن قاسم نے مذہبی رواداری تحمل اور غیر متعصبانہ لائحہ عمل کی جو بنیاد رکھی وہ اس کے بعد بھی جاری رہی، اس حد تک کہ جب "ابن حوقل اس کے بعد یہاں کی سیر کو آتا ہے اور ہندو مسلمانو کے رشتہ اتحاد کو خوشی مگر حیرت کے ساتھ دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ ان دو قوموں (ہندو مسلمان) کے لباس تمدن و معاشرت اور ان کی رفتار گفتار میں فرق لتیاز مشکل ہے۔ دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ سندھ اور دیگر اضلاع میں عربی اور ہندی بولی جاتی اور ملتان میں ملتانی و فارسی عام ہے"۔[۲۷]

سندھ: اردو کا پہلا گہوارہ

یہی وہ شواہد ہیں جن کی بنا پر سید سلیمان ندوی نے "نقوش سلیمانی" میں یہ دعویٰ کیا:

"سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ تھی"۔[۲۸]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے وقت سندھ میں جو زبان مقامی طور پر بولی جارہی تھی، وہ کیا تھی؟ اس کا جواب ڈاکٹر مہر عبدالحق کے بموجب ایسی اپ بھرنش ہے جو پساچا کی یا تو شاخ ہے یا اس سے متاثر ہوئی ہے۔ کشمیری، سندھی اور کوہستانی سب دردئی زبانیں ہیں۔ ملتانی اور سندھی (جسے لسندہ لکھا جاتا ہے دردئی بنیادوں پر استوار ہیں۔[۲۹]

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے بھی "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ "براچڈاپ بھرنش سندھ میں رائج تھی۔ موجودہ سندھی اسی سے نکلی ہے۔[۳۰] کیوں کہ ان کے بقول "سندھ کو پرانے زمانے میں براچڈ دیس کہا جاتا تھا۔[۳۱]

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے نبی بخش خان بلوچ کے حوالے سے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سندھ کا تاریخی رشتہ سنسکرت سے پہلے کی کسی مقبول عام بھوتو پراکرت سے ملتا ہے"۔[۳۲]

سید شبیر علی کاظمی نے بھی اپنی کتاب "پراچین اردو" میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر ممتاز حسین پٹھان (مولف "تاریخ سندھ") کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"عربوں کی آمد سے قبل سندھ میں بولی جانے والی زبان پراکرت کی اپ بھرنش تھی اور اس کی اپنی صوتی خصوصیات تھیں۔---- یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ابھیروں (اہیروں) کی زبان تھی۔ اس کو سندھیا بھاشا کہتے تھے لیکن ایف ایڈگرٹن نے اس کو سندھا بھاشا کہا ہے اور سندھا کے معنی علامتی یا مقصدی بتاتے ہیں مگر اس وقت کے شاعر اس زبان کو عام طور پر دیش بھاشا بھی کہتے تھے" (ص ۶) شبیر علی کاظمی نے مزید لکھا ہے: "سنسکرت زبان میں سیاند، سندھیا اور سندھا الفاظ ملتے ہیں۔ سیاند کے معنی رقیق شے، پگھلنے اور بہنے والی شے، ٹپکنے والا رس وغیرہ کے آتے ہیں۔ سندھیا کے معنی جوڑنا، یکجا کرنا اور متحدہ کرنا بیان کیے گئے ہیں۔ سندھا صوتیات میں الفاظ کے میل کو کہتے ہیں۔ ایک لفظ انہی الفاظ سے ملتا جلتا سندھیا اور بھی ہے جس کے معنی میں سندھا کے معنی بھی پوشیدہ ہیں اور پوچھنے سے بھی مراد لی جاتی ہے۔ اب یہ امر فیصلہ طلب ہے کہ ان قدیم زبانوں کے لیے یہ نام، آیا صوتیات کی بنا پر رکھے گئے تھے یا جغرافیائی نسبت کا خیال تھا یا شاعرانہ پیرایہ بیان اختیار کیا گیا تھا۔" (ص ۶-۷)

مولانا سید سلیمان ندوی نے عرب ہندو ملاپ کی وجوہات گنواتے ہوئے ان تاریخی شواہد کو جمع کیا ہے جن سے دونوں کے لسانی روابط اور پھر عربی فارسی اور سندھ کی زبان کے امتزاج کا آغاز ہوا اور یہ نتیجہ اخذ کیا:

> "مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں، اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا"۔

انھوں نے اپنے ایک اور مقالہ بعنوان "اردو کیوں کر پیدا ہوئی" میں بھی انہی شواہد کو دہراتے ہوئے یہی نتیجہ اخذ کیا:

> "ہر صوبے کی مقامی بولیوں میں مسلمانوں کی زبان کے الفاظ کا میل ہو کر ایک نئی بولی پیدا ہونے لگی مسلمانوں اور ہندوؤں کا یہ میل جول۔ --- سب سے پہلے ملتان سے لے کر ٹھٹھہ تک سندھ میں اور پھر -----" (ص ۲۵۹)

اس ضمن میں پیر حسام الدین راشدی کے ایک مقالہ بعنوان "اردو زبان کا اصلی مولد

سندھ" (مطبوعہ اردو، کراچی اپریل ۱۹۵۱ء) کا مطالعہ بھی سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔
نظریہ چونکہ شیرانی کی مانند مستحکم لسانی شواہد کی اساس پر استوار نہ تھا، اس لیے اسے درست تسلیم کرنے میں بیشتر ماہرین کو تامل رہا ہے جب کہ پنڈت کیفی نے تو اسے "سندھ کا قضیہ" قرار دیتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں اس کی تردید کر دی:

"اگرچہ مسلمانوں کا دخل و عمل پنجاب اور اٹک پار سے داخلے سے پہلے سندھ میں ہوا لیکن سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوئی"۔ (۳۳)

دائرہ کی تکمیل:

یہ ہیں وہ تین اہم نظریے جن کی رو سے اردو کا آغاز کسی خاص علاقے سے مشروط قرار پاتا ہے۔ ان تینوں نظریات کا تقابلی مطالعہ کرنے پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ صرف حافظ محمود شیرانی ہی صحیح معنوں میں ایک ایسا نظریہ پیش کرنے میں کامیاب رہے جو ابتدا میں متنازعہ ہونے کے باوجود بھی آنے والے ماہرین کے لیے مرکز توجہ بنا رہا۔ نصیر الدین ہاشمی نے جیسا کہ واضح کیا گیا، خود اپنے ہی نظریے کو دو ٹوک الفاظ میں تسلیم نہیں کیا۔ اسی طرح سید سلیمان ندوی پر بھی متعدد اعتراضات کیے گئے ہیں بلکہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کے بقول تو اس کی تغلیط خود سید صاحب کے اپنے ایک مضمون سے ہوئی ہے"(۳۴) (یہ مضمون ہے "اردو کیوں کر پیدا ہوئی"؟)
ادھر ڈاکٹر مسعود حسین خان نے بھی مختلف زبانوں کے لسانی ڈھانچوں کے تجزیہ کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا:

ہند اور سندھی دونوں دو آبہ کی زبانوں سے بالکل مختلف ہیں، اس لیے اردو کے آغاز کا سلسلہ ان زبانوں سے نہیں ملایا جا سکتا، گو مسلمان اول اول انہی زبانوں کے علاقوں میں داخل ہوئے"۔ (۳۵)

لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کے برعکس یہ لکھا ہے:

"جیسے سندھ کے عمر کوٹ میں پیدا ہونے والا بچہ آگے چل کر شہنشاہ ہند، اکبر اعظم کے نام سے مشہور ہوا، اسی طرح سندھ و ملتان میں

پروان چڑھنے والی یہ زبان، پنجاب اور ترک افغانوں کی توانائی کو جذب کر کے صدیوں بعد دہلی پہنچی اور وہاں کی بولیوں سے نیا رنگ و نور لے کر جلد ہی مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ سارے برِ اعظم کی مشترک زبانوں بن گئی اور اب بارہ سو سال بعد پھر اپنے وطن مالوف واپس آ کر دائرے کو مکمل کرتی ہے جو محمد بن قاسم کی فتح سندھ (۹۳ھ/۷۱۲ء) کے فوراً بعد سے بننا شروع ہوا تھا"۔ (۳۶)

مختلف تہذیبوں کی باہم اثر پذیری متنوع تمدنی اقدار کی آمیزش اور مختلف لسانی دھاروں کا ملاپ اور پھر ان سے جنم لینے والی نئی صورت حال کا تجزیہ آسان نہیں ہوتا یعنی دو ٹوک انداز میں کسی فرد کی تاریخ پیدائش اور موت کی مانند درست تاریخ دے دی جائے۔ یہ گریز پا اثرات، غیر مرئی طریقوں سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان اثرات کی قبولیت اور پھر ان سے نتائج کی ظہور پذیری طویل زمانے پر محیط ہوتی ہے۔

اردو کہاں کہاں؟

شیرانی اور ہاشمی کی تحقیقات کے اثرات ہمہ گیر ثابت ہوئے اور اب اردو کو کسی خاص صوبے، خطے بلکہ شہر تک سے منسوب کرنے کا جو رجحان ملتا ہے، وہ انہی بزرگوں کے تتبع میں ہے، یہی نہیں بلکہ اب تو یہ رجحان اصناف ادب پر بھی حاوی نظر آتا ہے۔ مندرجہ ذیل کتابوں سے کسی حد تک یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کا ناطہ کن کن علاقوں سے جوڑا گیا ہے:

مدارس میں اردو: نصیر الدین ہاشمی حیدر آباد دکن ۱۹۳۸ء
مشرقی بنگال میں اردو: اقبال عظیم ڈھاکہ ۱۹۵۴ء
بنگال میں اردو: وفا راشدی حیدر آباد ۱۹۵۵ء
بلوچستان میں اردو: ڈاکٹر انعام الحق کوثر لاہور ۱۹۶۸ء، طبع دوم اسلام آباد ۱۹۸۶ء
سندھ میں اردو شاعری: ڈاکٹر نبی بخش بلوچ حیدر آباد ۱۹۷۰ء
سندھ میں اردو شاعری کا ارتقا: سید معراج نیر لاہور ۱۹۷۳ء

ملتان میں اردو شاعری: ڈاکٹر طاہر تونسوی لاہور ۱۹۷۲ء طبع دوم ۱۹۸۵ء
کشمیر میں اردو: حبیب کیفوی لاہور ۱۹۷۹ء
سندھ میں اردو: ڈاکٹر شاہدہ بیگم کراچی ۱۹۸۰ء
سلہٹ میں اردو: عبدالجلیل بسمل کراچی ۱۹۸۱ء
اردو سندھی کے لسانی روابط: شرف الدین اصلاحی طبع دوم اسلام آباد ۱۹۸۷ء
ریاست میسور میں اردو: ڈاکٹر آمنہ خاتون احمد خان ۱۹۸۷ء

یہ تو صرف چند معروف کتابیں ہیں اگر اس ضمن میں سید فرحت حسین کے مقالے "ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق" کا مطالعہ کیا جائے تو پی۔ایچ۔ڈی کے لیے قلم بند کیے گئے متعدد ایسے مقالات مل جاتے ہیں جن میں کسی خاص خطے کے حوالے سے اردو زبان اور ادب کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔(ان میں سے بعض مقالات مکمل ہو کر مطبوعہ یا غیر مطبوعہ صورت میں ملتے ہیں جبکہ بعض زیر تکمیل ہیں):

دکنی اردو اور اس کی نشوونما: عزیز اللہ بیگ علی گڑھ یونیورسٹی
میسور میں اردو کی نشوونما: ڈاکٹر حبیب النسا بیگم دہلی یونیورسٹی
اودھ میں اردو: ڈاکٹر محمد حسین لکھنؤ یونیورسٹی
رام پور کی ادبی خدمات: وقار احمد لکھنؤ یونیورسٹی
اودھ میں اردو ادب کے ارتقا (۱۸۳۰ تا ۱۹۳۰): سید عبدالباری لکھنؤ یونیورسٹی
کا سماجی اور تہذیبی پس منظر: (۱۷۶۰ء تا ۱۸۵۶ء)
بہار میں اردو زبان کا ارتقا ۱۸۵۷ء تک: ڈاکٹر اختر اورینوی ڈی لٹ پٹنہ یونیورسٹی
اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ: ڈاکٹر سلیم احمد رضوی آگرہ یونیورسٹی
بمبئی میں اردو: ڈاکٹر میمونہ دلوی بمبئی یونیورسٹی
اردو اور فارسی ادب میں برہان پور کا حصہ: شیخ فرید ناگپور یونیورسٹی

گزشتہ صدی میں راجستھان میں اردو کی ترقی میں غیر مسلموں کا حصہ: ڈاکٹر اے ایف عثمانی راجستھان یونیورسٹی

راجستھان کے اردو ادب کی تاریخ: ڈاکٹر سید ثاقب رضوی اودے پور یونیورسٹی

اودھ میں اردو شاعری کے ارتقا میں حکومت کا اثر: ڈاکٹر زہرہ یاسمین لکھنؤ یونیورسٹی

انیسویں صدی عیسوی میں لکھنؤ میں طنز و مزاح کا ارتقا: نزہت پاشا لکھنؤ یونیورسٹی

پنجاب میں اردو شاعری کا ارتقا: ڈاکٹر امرت لال عشرت بنارس ہندو یونیورسٹی

الہ آباد میں اردو شاعری کا ارتقاء ۱۸۵۷ء تک: رضیہ نقوی الہ آباد یونیورسٹی

بہار میں اردو شاعری کا ارتقاء (۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک): ڈاکٹر کلیم احمد عاجز پٹنہ یونیورسٹی

کرناٹک میں اردو ادب کا ارتقاء: خالد سعید گلبرگ یونیورسٹی

ریاست ٹونک میں شعری و ادبی روایات: ڈاکٹر مس فیروز راجستھان یونیورسٹی

دربھنگاہ میں اردو کا ارتقا: عبدالظہیر ناشاد ایل این متھلا یونیورسٹی

پوربند میں اردو ادب کا ارتقاء: فاران شکوہ یزدانی ایل این متھلا یونیورسٹی

تامل ناڈو میں اردو زبان کا ادب کا ارتقاء: مظہر قلندر مدارس یونیورسٹی

تامل ناڈو میں اردو زبان میں ادب کا ارتقاء: شوکت جہاں مدارس یونیورسٹی[۳۷]۔

اس سلسلے میں ان کتابوں کا نام بھی لیا جا سکتا ہے:

میسور میں اردو "محمد سعید عبدالخالق؟

دبستان گولکنڈہ ادب کلچر : ڈاکٹر محمد علی اثر حیدر آباد ۱۹۸۱ء
دکن میں ریختی کا ارتقا : بدیع حسینی حیدر آباد ------- ؟
مدارس میں اردو ادب کی نشوونما : ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال
حیدر آباد ۱۹۷۹ء

آغاز: (زبانوں سے تعلق کے نظریات)

اردو زبان کے آغاز اور ابتدائی نشوونما کے ضمن میں ان تین اہم محققین کے علاوہ کچھ ایسے ماہرین لسانیات بھی ہیں جنھوں نے کسی خاص خطے کو اردو کا مولد قرار دینے کے برعکس صرفی اصولوں اور نحوی قواعد کو اساس بنا کر دیگر زبانوں کے ساتھ اردو کی لسانی مشابہت تلاش کرتے ہوئے اس کے آغاز کا سراغ لگانے کی سعی کی۔ لہذا ان لسانی محققین کے نظریات کو اردو کے کسی خاص خطے سے منسوب قرار دینے کے خلاف ردعمل کے نظریات قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان ماہرین میں ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر سہیل بخاری کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ یہ نظریات درست ہیں یا غلط، ان کا تعین لسانی محققین کا کام ہے تاہم اتنا ہے کہ انھوں نے جدید ترین تحقیقات اور لسانی تصورات سے خصوصی استفادہ کیا، یہی نہیں بلکہ زبان کے آغاز اور نشوونما کے سلسلے میں بھی قابل قدر لسانی مواد جمع کر لیا۔ لہذا نظریات کی بنا پر نہیں تو کم از کم فراہمی مواد کے باعث، ان کا کام قابل توجہ قرار پاتا ہے۔

ویسے ایک بات ہے کہ جدید لسانی محققین سے بھی کہیں پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں زبان کے آغاز کے بارے میں جو تصور پیش کیا تھا، وہ زبان کو کسی خاص علاقے سے منسوب کرنے کے برعکس کسی دوسری زبان سے تعلق قائم کرنے کی اولین کوشش قرار پاتا ہے۔ یوں دیکھیں تو نظریہ کی تردید کے باوجود بھی لسانی نظریہ سازوں میں مولانا محمد حسین آزاد کو پیش رو جیسی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

برج بھاشا

مولانا آزاد نے آب حیات میں "زبان اردو کی تاریخ" کا آغاز اس پر تیقین اسلوب میں

کیا:

"اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان، برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے"[28]۔

اگرچہ ماہرین لسانیات کی اکثریت نے مولانا آزاد کے اس نظریے کو درست تسلیم نہیں کیا تاہم حکیم سید شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اردو کا منبع اور مخرج برج بھاشا ہے وہ اس ضمن میں رقم طراز ہیں: "زمانہ حال کی تاریخی اور لسانی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ زبان اردو کا منبع و مخرج، برج بھاشا ہے اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ تیرہ، چودہ، پندرہ اور اسی قبیل کے الفاظ جو اردو میں مستعمل ہیں۔ ڈاوسن نے انھیں اپنی گرامر میں بجنسہٖ بیان کیا ہے"[29]۔ مسلمان فاتحوں سے جب ہندوؤں کا میل جول ہوا تو برج بھاشا میں تغیر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصہ کے بعد زبان کی اصل ہیئت بدل گئی جس کے باعث ایک جدید زبان کا ظہور ہوا اور یہ جدید زبان، سلاطین مغلیہ کے دور میں زبان اردو کے نام سے موسوم ہوئی"[30]۔

لسانی مباحث میں برج اور برج بھاشا کا اکثر ذکر آتا رہتا ہے۔ آخر یہ برج اور برج بھاشا کیا چیز ہے۔ اس ضمن میں قدر بلگرامی کی تالیف "قواعد العروض" سے یہ معلومات ملتی ہیں: "برج بھاشا بہ کسر اول و سکون رائے مہملہ و جیم تازی سنسکرت میں اس کی اصل ورج بھاشا ہے۔ ورج بکسر واو بہ معنی انبوہ و خلط و شمول بھاشا بہ فتح موحدہ مع ہائے مخلوط و شین معجمہ و الف کشیدہ بمعنی آواز گفتگو۔ برج اصطلاحاً ہندوستان میں ایک مغربی احاطہ کا نام جو چوراسی کوس کے گرد میں ہے۔ اس میں کئی بند شامل ہیں جیسے برندابن متھرا۔ گوکل وغیرہ اسی برج کو برج بھاشا کہتے ہیں۔ ایک کوس دو میل سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اور چوراسی کوس کے گرد میں صحیح نہیں ہے بلکہ چاروں طرف چوراسی چوراسی کوس ہے۔ اس طرح تقریباً ایک سو ستر میل ہوئے"[31]۔

جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے، رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں اس خیال کا

اظہار کیا:

زبان اردو کی صرف و نحو محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اس میں استعمال ہونا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبان عام بن گئی"۔ (۲۲)

سکسینہ نے آزاد کی تردید کرتے ہوئے یہ لکھا:

"برج بھاشا کو اردو کا ماخذ قرار دینا جو کہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے اور جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے، صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے کہ برج بھاشا جو متھرا اور اس کے جوانب میں بولی جاتی تھی، وہ اس بھاشا سے جو اطراف دہلی میں بولی جاتی تھی، بہت مشابہت رکھتی تھی مگر پراکرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ یعنی دہلی بھاشا ہمارے خیال میں اردو کی اصل سمجھی جا سکتی ہے۔۔۔ اردو کا اصل ماخذ وہ زبان ہے جو دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کو مغربی ہندی کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے اور مغربی ہندی اپنی جگہ پر شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی (۲۳)۔

دلی، میرٹھ اور متھرا میں زیادہ فاصلہ نہیں لیکن دیکھ لیجیے یہاں کی زبانیں اپنے اپنے طور پر اردو کا ماخذ قرار دی جا رہی ہیں۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے بھی "اردو کا روپ" میں مولانا آزاد کی تردید کی ہے (ص ۶۱ تا ۶۵)

ہریانی:

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں اردو کے برج بھاشا "پنجاب" دکن اور سندھ سے تعلق کو مسترد کر دیا۔ انھوں نے مختلف زبانوں اور بولیوں کے تقابلی مطالعے کے بعد اردو کا تعلق ہریانی کے ساتھ جوڑا۔ ان کے استدلال کی اساس یہ ہے:

"شہر دہلی کے جغرافیائی محل وقوع پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ شہر برج بھاشا، ہریانی، کھڑی بولی اور میواتی (راجستھانی کی ایک

شاخ کے سنگم پر واقع ہے۔ راجپوتوں کی دلی ڈلی یا اپ بھرنش لوبیات کی "ڈھلی" ہریانہ کے علاقے میں تھی جس سے کھڑی بولی کی بہ نسبت میواتی زیادہ قریب تھی۔ شاہجہان کی دہلی (خسرو کا انڈپٹ اندر پرست) کئی میل ہٹ کر شمال میں بسائی گئی تھی جس کی آبادی آگرہ کے نووارد برج بولنے والوں کی تھی۔ پنجابی مغربی ہندی کی بولیوں میں چونکہ ہریانی سے قدیم تر ہے، اس لیے اردو اور دکنی سے مماثلت رکھتی ہے۔ بعد کو مغلوں کے عہد میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات اس پر غالب آجاتے ہیں اور اردو کا پنجابی پن زائل ہونا شروع ہوتا ہے۔ لب و لہجہ بدلتا ہے" (ص ۹۲) "دہلی میں بولیوں کی آنکھ مچولی کی داستان تفصیل سے بیان کرنا ناممکن ہے، اس لیے کہ اس عہد کا تحریری مواد تقریباً مفقود ہے۔ ---- اردو کی ابتدا کے سلسلے میں نئے نظریے کی تشکیل اس طور پر کی جاسکتی ہے کہ ہم نواح دہلی کی تمام بولیوں کا تقابلی مطالعہ کریں اور دکنی زبان کی خصوصیات کو پنجابی کی بجائے ان میں پہچاننے کی کوشش کریں۔ ایسا کرتے وقت ان بولیوں کے جدید روپ ہی پیش نظر نہ رہیں بلکہ ان قدیم نمونوں کا بھی جائزہ لیں جو دستیاب ہیں۔ مذکورہ بالا تقابلی مطالعے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قدیم اردو کی تشکیل براہ راست ہریانی کے زیر اثر ہوئی ہے۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں اور جب پندرھویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام مقبول ہو جاتی ہے تو سلاطین دہلی کے عہد کے تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعے درست ہوتی ہے"۔ (ص ۱۸۳)۔

قدیم ویدک بولی

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھے گئے تحقیقی مقالے "اردو

زبان کی تاریخ" میں اردو کے آغاز کے بارے میں جو نظریہ تشکیل دیا، اس کی اساس یہ خیال ہے:

"کسی زبان کے متعلق یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ اس کا ماخذ کیا ہے، ضروری ہے کہ اس زبان کا لسانی تجزیہ کیا جائے اور اس کے صرفی اصول اور صوتی تبدیلیوں کی ارتقائی و تقابلی تاریخ پر نظر ہے۔ اس سلسلے میں صرفی و نحوی قاعدوں اور صوتی تبدیلیوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ہندو پاکستان کی زبانوں کے رشتے، ان کی امتیازی اور ان کی خصوصیات کا علم انہی چیزوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے اس مقالے میں گرامر اور صرفی تبدیلیوں سے بحث کی ہے اور اردو کے صوتی نظام کو نظر انداز کر دیا ہے۔ (ص ۸۵،۸۶) چنانچہ اسی انداز پر انھوں نے ہندوستان کی زبانوں اور بولیوں کا صرفی نحوی مطالعہ کیا اور اپنے نتائج کی روشنی میں ماضی کے ماہرین سے یوں اختلاف کیا۔

"ایک زمانے تک اردو کو برج ہی کی ایک شاخ بتایا گیا یہ غلط فہمی دور ہو جانے پر برج کی بہن بتایا جا رہا ہے اور شور سینی اپ بھرنش اور پراکرت سے اس کا رشتہ جوڑا جا رہا ہے۔ اردو کی صرفی و نحوی خصوصیات پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کا ماخذ شور سینی پراکرت یا اپ بھرنش نہیں" (ص ۸۳-۸۴)

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا اپنا تصور یہ ہے:

" اردو ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیے کہ اولتے بدلتے، پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ ان سے لیتے، اس حالت کی پہنچی جسے ہم آج دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی"۔ (۴۴)

ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنا استدلال جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "پالی اس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے اور اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔ پالی ادب، فن اور فلسفے

کی زبان ہے اور ہندوستانی روزانہ بول چال، لین دین اور کاروبار کی۔ پالی اعلیٰ درجہ کو پا کر شہر گئی لیکن ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے اور بازار ہاٹ میں بولے جانے کے باعث برابر ترشتی ترشاتی اور چلتی چھلاتی رہی۔ (۸۷)

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی ایک اور کتاب "اردو لسانیات" میں بھی اسی خیال کا اعادہ کیا:

> بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں اردو، دہلی اور اس کے نواحی علاقے میرٹھ میں بولی جا رہی تھی۔ محمد غوری کے انتقال کے بعد ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ میرا خیال ہے اس سے پہلے اردو ابھر کر برج، قنوجی، بندیلی وغیرہ بولیوں سے امتیاز حاصل کر کے پختہ اور آزاد بول چال کی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اس امتیاز کے بعد اردو کو اہل علم نے کھڑی بولی کے نام سے یاد کیا، اس کی ہمسر بولیاں پڑی کہلائیں۔ (ص ۲۸)

مہاراشٹری

ڈاکٹر سہیل بخاری نے مولانا محمد حسین آزاد، حافظ محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے تصورات مسترد کرنے کے بعد اپنا جو تصور پیش کیا، اس کی رو سے اردو "مہاراشٹری جتھے کی بولی" ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے "اردو کی کہانی"، "اردو کا روپ" اور بعض دیگر مقالات میں جو طرز استدلال روا رکھا، اس کی رو سے نہ تو اردو کا مخصوص خطوں سے تعلق بنتا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کی آمد سے نئی زبان کا کینڈا تیار ہوتا ہے۔ ان کی دانست میں اردو کے آغاز اور تشکیل کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے بقول "اردو کی بولی کے جنم پر، جس جس نے جو کچھ کہا ہے، اس کی جانچ پرکھ اور چھان پھٹک کر کے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اردو ہی نہیں ہندوستان کی سبھی بولیاں جو آج کل بولی جا رہی ہیں، آریوں کے ہندوستان آنے سے پہلے ہی بولی جاتی تھیں۔ آریوں کے آتے وقت بھی اور جب سے اب تک برابر بولی جا رہی ہیں۔ ان میں سے کوئی سی بھی بولی کبھی گھڑی دو گھڑی کے لیے بھی نہیں رکی ہے، نہ جب سے اب تک ان کی آوازوں اصولوں اور ڈھانچوں

میں کوئی بل آیا ہے۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی لپیاں بدلتی رہی ہوں یا لپیوں کی ریت میں فرق پڑ گیا ہو اور یہ بات ان کا کھوج لگانے سے کھل سکتی ہے۔ میں اردو بولی کے لیے ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ بولی بھی اتنی پرانی ہے جتنی ہندوستان کی دوسری بولیاں۔ یہ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے دیوناگری (دیوناگری) لپی میں لکھی جاتی تھی اور ان کے آنے پیچھے ان کی لائی ہوئی فارسی یا (عربی) لپی میں لکھی جانے لگی جس سے ہمارے عالموں کو یہ دھوکہ ہو گیا کہ اردو ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے پر جنمی ہے"[۳۰]۔

ڈاکٹر سہیل بخاری اپنے استدلال کو اس کی منطقی انتہا تک لے جاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رگ وید ہندوستان کی قدیم ترین اور آریوں کی وہ پہلی کتاب ہے جو ہم تک پہنچی ہے چنانچہ اس میں اردو الفاظ کی موجودگی یہ ثابت کر رہی ہے کہ ہماری زبان، ویدک کال سے بھی پہلے سے اس علاقے میں بھاشا کے طور پر کام آ رہی ہے۔ ان الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہماری بول چال کی آوازوں سے ہزاروں سال سے آج تک زیر و زبر، پیش کا بھی فرق نہیں آیا ہے اور اسی طرح کے ماخذ اور اشتقاق سے متعلق اب تک کی تمام غلط فہمیاں اور تمام نظریات ازخود باطل ہو جاتے ہیں"[۳۱]۔

اسی استدلال کی بنا پر انھوں نے مروج لسانی نظریات مسترد کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا:

"اردو کی جنم بھومی مشرق میں اڑیسہ اور جنوب میں تلنگانہ سے محدود ہے۔ میرے نزدیک اصل میں اردو کا گھر یہی ہے"۔

انھوں نے "اردو کا روپ" میں لکھا:

"اردو بولی نہ پنجابی جتھے میں گنی جا سکتی ہے، نہ شور سینی، نہ ماگھری میں، نہ اودھ ماگھری میں۔ یہ مہاراشٹری جتھے کی بولی ہے"۔ ص ۷۸

اور پھر انھوں نے لسانی شواہد پیش کر کے (۷۸۔۸۰) اپنے موقف کو ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

اسی طرح اپنے ایک اور مقالے "مسئلہ آغاز اردو" میں بھی انھوں نے یہی کچھ لکھا اور اپنے دلائل سے یہ نتیجہ اخذ کیا:

"اردو زبان نہ شور سینی سے نکلی ہے، نہ پالی سے بلکہ اس کا ماخذ مہاراشٹری پراکرت ہے۔ اس پراکرت کے نقوش، میں نے رگ

> وید میں بھی دیکھے ہیں۔ اردو کی اصل مرزبوم کے متعلق اب تک جو کچھ سمجھا گیا ہے، وہ بھی یکسر غلط ہے۔ مہاراشٹری پراکرت ملک مہاراشٹر میں بولی جاتی تھی اور اسی ملک مہاراشٹر کے مشرقی علاقے میں پیدا ہوئی اور مرہٹی کی سگی بہن ہے۔[47]

دراوڑی:

آخری نظریہ عین الحق فرید کوٹی کا بھی قابل توجہ ہے جس کے بموجب اردو کا ماخذ دراوڑی[48] اور منڈا زبانیں ہیں۔ اب ہمارے ہاں اور یورپ میں برصغیر کی تہذیبی اور لسانی میراث میں دراوڑیوں اور منڈا قبائل کے اثرات کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ رشید اختر ندوی لکھتے ہیں: "مسٹر راولنسن نے مشہور پروفیسر وان اکسڈٹ کا یہ خیال بڑے وثوق کے ساتھ نقل کیا کہ ارض پاکستان کے سب سے پہلے آباد کار وہ سیاہ فام لوگ تھے جو برفانی عہد میں افریقہ ملنشیا سے یہاں پہنچے اور پاکستان کی سب سے پہلے آبادیاں ان لوگوں کی تھیں جو کول سیری یا منڈا زبانیں بولتے تھے۔[49]

ماہرین لسانیات کا اس پر اتفاق ہے کہ بلوچستان کے ایک حصے میں بولی جانے والی براہوی زبان، دراصل دروازمی زبان کی باقیات میں سے ہے بلکہ رشید اختر ندوی کی بموجب تو سندھ میں بولی جانے والی موجودہ سندھی اور اس سے ملحقہ پنجابی زبان بھی، ڈراویڈین یا تورانی الاصل ہے اور وہ زبان ہے جو ہنٹر نے موہنجوڈرو، وادی ژوب اور بعض دوسرے مقامات سے برآمد ہونے والی مہروں پر کندہ پائی ہے، ان سب کی اصل الاصل تھی۔ یہ ساری زبانیں بھی اس زبان سے نکلی ہیں جسے بولنے والے تورانی الاصل یا ڈراویڈین کم سے کم پانچ ہزار سال قبل مسیح میں، راوی، سندھ اور بلوچستان میں داخل ہوئے اور جنہیں بعد میں آنے والے آریوں نے اپنا رقیب بنا لیا تھا"۔[50]

دراوڑی سے براہوی کے تعلق پر لغوی تحقیق ہوئی چنانچہ انور رومان کے مضمون بعنوان "براہوی کا ایک گیت" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "۱۸۴۴ء میں ایک جرمن عالم لیسن نے اس نظریہ کا اظہار کیا تھا کہ براہوی دراوڑی السنہ سے مشابہت رکھتی ہے۔ لیسن کے بعد کم و بیش بیس یورپی فضلا اسی زبان پر کام کر چکے ہیں جن میں سے آٹھ علما نے تو اس زبان کی

ماہیت اور ساخت کو بھی موضوع مطالعہ بنایا ہے۔ یہ علما ریورنڈ رابرٹ کالڈویل، ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ، ڈاکٹر تھیوڈور ڈوکا، پروفیسر جان الیوری، ڈاکٹر جی اے گریرسن، مرڈینر برے، ڈاکٹر ایم بی ریمی نیور اور ڈاکٹر عبدالرحمن بار کر ہیں۔ ان آٹھ علما کی تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ براہوی دراوڈالسنہ سے مشابہت ہی نہیں رکھتی بلکہ یہ ان کے ہم اصل بھی ہے اس لیے کہ بلحاظ گرامر و روزمرہ براہوی زبان کم و بیش دو تہائی دخیل لغت کے باوجود خالص دراوڑی زبان ہے"۔ (۱۱)

یہ وہ تناظر ہے جس میں عین الحق فرید کوٹی نے متعدد غیر ملکی ماہرین سے لسانی شواہد حاصل کر کے پنجابی سنڈاری دراوڑی اور اردو کے مشترک الفاظ کی فہرست مرتب کی اور "اردو زبان کی قدیم تاریخ" میں اس خیال کا اظہار کیا:

> "جب ہم اردو زبان کی صرف و نحو کا پنجابی اور برج بھاشا کی صرف نحو سے موازنہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ جہاں اردو اور پنجابی کے درمیان گہرا رشتہ موجود ہے، وہاں اس کے برج بھاشا کے ساتھ اختلافات کی خلیج وسیع ہے"۔ (ص ۸۰)۔ واضح رہے کہ اردو زبان کا صرف و نحو کے لحاظ سے فارسی اور سنسکرت سے نہ صرف فروعی بلکہ اصولی اور بنیادی طور پر اختلاف ہے، یہ بات کسی طرح ذہن میں نہیں آتی کہ ایک زبان کی شاخ اس سے اتنی مختلف ہو۔ دنیا کی زبانوں کی طرح تذ ہ سخوں میں ہمیں ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی" (ص ۹۱)۔

اردو اور سنسکرت میں کافی حد تک لغوی اشتراک موجود ہے لیکن اس سے یہ یکطرفہ فیصلہ دے دینا کسی طرح جائز نہیں کہ یہ تمام کا تمام سرمایہ الفاظ سنسکرت ہی نے اردو کو دیا ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے یعنی خود سنسکرت نے یہ الفاظ اردو ہی کی پیش رو زبانوں سے اخذ کیے ہوں (ص ۲۳۲)" جب یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ اردو زبان کا سرچشمہ نہ تو سنسکرت ہے نہ فارسی، تو صدیوں پرانے مفروضے کا فلک بوس محل آن واحد میں زمین پر آ رہتا ہے" (ص ۹۳) جب ہم اردو زبان کے لغوی سرمائے اور صرف و نحو کا موازنہ برصغیر کی موجودہ زبانوں سے کرتے ہیں تو جو زبان اس کے سب سے زیادہ

نزدیک نظر آتی ہے وہ پنجابی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ صرف و نحو کے لحاظ سے پنجابی کے علاوہ کوئی دوسری زبان اردو سے گہری مطابقت نہیں رکھتی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیادیں وادی سندھ میں ہی استوار ہوئیں اور اس کا سلسلہ نسب پنجابی اپ بھرنش اور مقامی پراکرت سے ہوتا ہوا قدیم ہڑپائی عہد کی زبان سے جا ملتا ہے جو کہ آریاؤں کی آمد سے قبل وادی سندھ میں مروج تھی" (ص ۹۳)۔ آریاؤں کی آمد کے وقت وادی سندھ میں دراوڑی قبائل کو بالادستی حاصل تھی۔۔۔ منڈا قبائل برصغیر کے قدیم ترین باشندے ہیں اور دراوڑوں کی آمد سے قبل یہاں آباد تھے" (ص ۹۶)۔ وادی سندھ کی ہڑپائی تہذیب کی پیش رو آسٹری نال تہذیب منڈا قبائل کی مرہون منت تھی اور آج سے کوئی چھ ہزار قبل یا اس سے بھی پہلے یہاں منڈا گروہ کی زبانوں کا چلن تھا" (ص ۱۲۵)۔ "آریاؤں کی آمد سے قبل وادی سندھ میں دراوڑ اور منڈا اقوام کا دور دورہ تھا اور ہڑپا و موہنجوداڑو کی گلیوں اور بازاروں میں انھی گروہوں سے تعلق رکھنے والی زبانیں بولی جاتی تھیں" (ص ۱۷۱)۔ "عین الحق فرید کوٹی کے استدلال کی رو سے دراوڑی زبان ہی اردو اور اس کے ساتھ پنجابی کی بھی ماخذ ہے۔ محمد مجیب نے بھی سنسکرت پر دراوڑی کے اثرات تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے "سنسکرت ابجد کے دندانی حروف (ت ٹ وغیرہ) اور کسی ہندو جرمانی زبان میں نہیں ملتے۔ دراوڑی زبانوں میں البتہ پائے جاتے ہیں اور یہ سنسکرت میں دراوڑی اثرات کی بدولت شامل کیے گئے ہوں۔ سنسکرت کے بہت سے الفاظ کا مادہ آریائی نہیں معلوم ہوتا، ان کا ماخذ دراوڑی زبانیں ہوں گی"۔[۱۶۱]

عین الحق فرید کوٹی نے اپنے ایک مقالے "پالی --- ٹیکسلا یونیورسٹی میں تعلیم کی زبان" میں یہ لکھا ہے: "پالی اور پنجابی میں گہرا لسانی اشتراک موجود ہے"[۱۶۲]۔ انھوں نے اپنے استدلال کی توثیق میں سنسکرت کے مقابلے میں پنجابی اور پالی کے مشترک الفاظ بھی پیش کیے ہیں جن سے میں چند درج ذیل ہیں:

سنسکرت	پنجابی	پالی
نرت	ناچ	ناچ
ستیہ	سچ	سچ

چوتھا باب

اصلاح زبان کی تحریکیں

اصلاح زبان کی کوششوں کے مطالعے سے پیشتر یہ امر واضح رہے کہ اصلاح کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب زبان صورت پذیری کے ابتدائی دور سے نکل کر ترقی کے ایک خاص معیار تک پہنچ چکی ہو۔ یہ معیار کیا ہوگا، اس کی پیمائش مقداری یا عددی صورت میں ممکن نہیں کیونکہ اس کا تعلق زبان بولنے والی قوم کے تخلیقی اور جمالیاتی معیاروں سے ہوتا ہے۔

زبان جب بن رہی ہو تو شاید اس عہد کی آبادی کو یہ شعور بھی نہ ہو کہ اس وقت کوئی زبان بننے کے عمل سے گزر رہی ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ کیا محمود غزنوی اور اکبر کے عہد کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ احساس ہوگا کہ ہماری باہمی ضروریات لین دین اور میل ملاپ کے نتیجے میں ایک ایسی زبان صورت پذیر ہو رہی ہے جو مستقبل میں اس خطے کی تخلیقی وراثت کی امین ثابت ہوگی اور دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہوگی؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اصلاح زبان کے لیے زبان میں اتنی نشوونما اور ترقی لازم ہے کہ وہ تخلیقی مقاصد کے لیے بروئے کار لائی جا سکے۔ جب تخلیقات کا عمل شروع ہو جائے تو پھر صاحب ذوق تخلیق کاروں پر اس امر کا انحصار ہوتا ہے کہ وہ کب اور کیسے اصلاحی عمل کا آغاز کرتے ہیں اور یہ بھی کہ یہ عمل انفرادی نوعیت کا ہو یا اجتماعی روپ میں اظہار پائے۔ اصلاح زبان کے سلسلے میں ہمیں شاعری میں تلمذ کی روایت کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کیونکہ زبان و بیان کی اصلاح کی یہی واحد صورت تھی۔ یہ اصلاح بھی دو پہلو اختیار کر سکتی تھی، ایک تو یہ کہ شاعر خود اپنے ذوق جمال اور معیار لسان کی روشنی میں کچھ الفاظ کو غیر فصیح، غیر شاعرانہ اور تخلیقی ابلاغ میں بدنمائی کا باعث سمجھ کر ان کا استعمال پسند نہیں کرتا اور اپنے تلامذہ کے لیے انھیں متروک قرار دے دیتا تھا۔ چنانچہ اگر ایک طرف کی اصلاح سے ایسے الفاظ خارج از کلام قرار پائے تو دوسری طرف تلامذہ خود ان سے احتراز کرنے کی تلقین بھی کی جاتی تھی۔ اردو میں معروف شعرا کے تلامذہ کے ذریعے اسے اصلاح زبان کا عمل زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ویسے ایک بات ہے کہ

ہمارے ہاں شاعرانہ تلمذ کی جو روایت ملتی ہے، وہ ایران سے قطع نظر شاید اور کہیں نہ ملے گی۔ مشرق میں استاد یا گرو کا مرتبہ ماں باپ سے بھی افضل سمجھا جاتا رہا ہے اور شاعری میں تلمذ کی روایت اور اس کی اہمیت اسی سے متعین ہوتی ہے، اس حد تک کہ استاد شاعر کی مقبولیت کا تعین بعض اوقات اس سے بھی کیا جاتا ہے کہ اس کے تلامذہ کی تعداد کتنی تھی اور پھر ان میں سے خود کتنے شاگرد استاد ثابت ہوئے۔ یوں تو اردو کے ہر بڑے شاعر کے شاگرد ہوئے ہیں لیکن جن اساتذہ کی شہرت میں ان کے شاگردوں کی ناموری بھی شامل ہے، اس میں مظہر جان جاناں، حاتم، سودا، مصحفی، ناسخ، آتش، غالب، داغ وغیرہ خصوصی شہرت کے حامل ہیں۔

انسانی طبع بلکہ انا، استاد شاگرد کے تعلقات میں بھی اپنے رنگ دکھاتی رہی ہے اسی لیے بعض شاگرد تمام عمر استاد کے تابعدار رہے جبکہ بعض اڑنے کے قابل ہوئے تو پر پرزے نکال کر باغی ہو جاتے۔ بعض اوقات انا پسند شاگرد یہ سمجھتا (کبھی درست اور کبھی غلط) کہ استاد کی یہ اصلاح غلط ہے اور اس سے شعر خراب ہو گیا۔ وہ اس اصلاح کو تسلیم نہ کرتا، استاد کے خلاف ہو جاتا۔ کبھی یہ بھی ہوا کہ شاگرد کی شہرت، استاد کو کھٹکتی اور یوں وہ مارے حسد کے شاگرد کے خلاف ہو جاتا۔ الغرض تخلیق کاروں کی نفسیات کے مطالعے کے لحاظ سے اردو شاعری میں تلمذ کی روایات کا مطالعہ خاصا دلچسپ ہے۔ سعادت خان ناصر لکھنوی کا تذکرہ خوش معرکہ زیبا (ترتیب و مقدمہ مشفق خواجہ) تو صرف استادی شاگردی کے نقطہ نظر سے ہی لکھا گیا ہے۔

جو الفاظ غیر فصیح قرار دے کر ٹکسال باہر کیے گئے، تخلیقی مقاصد کے لیے استعمال نہ کیے جانے والے ان الفاظ کو اصطلاح میں متروک الفاظ کہتے ہیں۔ یہ کیا ہیں؟

آرزو لکھنوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے "نظام اردو"۔ اس میں انھوں نے متروکات کی تین صورتیں بتائی ہیں (۱) لفظ غلط ہو (۲) غیر مانوس (۳) زاید ہو ان کے بموجب

"ان میں سے بعض کا ترک ضروری ہے اور بعض کا ترک اولیٰ ہے"(۱)۔

حسرت موہانی کی "نکات سخن" میں بھی متروکات پر مفصل بحث (ص ۹ تا ۶۴) کی گئی ہے۔ انھوں نے متروکات سے وابستہ تمام مباحث کو یوں سمیٹا ہے "متروکات قدیم

(ص ۹) "متروکات معروف" یعنی وہ متروکات جو شعرائے عہد متوسط کے کلام میں پائے جاتے ہیں" (ص ۲۲) "متروکات جائز یعنی شعرائے دور آخر وہ عہد حاضر کے وہ متروکات جن کے ترک کو راقم جائز سمجھتا ہے" (ص ۳۱) متروکات بے جا یعنی شعرائے دور آخر و عہد حاضر کے وہ متروکات جن کے ترک کرنے کی راقم حروف کے نزدیک کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی" (ص ۴۴) "قابل ترک یعنی وہ الفاظ جو اس وقت تک مستعمل ہیں اور جائز سمجھے جاتے ہیں لیکن راقم حروف کے نزدیک جن کا ترک اولیٰ ہے" (ص ۵۰) حسرت نے اپنے موقف کی تائید میں اساتذہ اور معروف شعرا کے برمحل اشعار پیش کیے ہیں اور اس موضوع کا بہت ہی عمدہ تجزیاتی مطالعہ کیا ہے:

خورشید لکھنوی نے "رسالہ افادات" (اشاعت اول نمبر ۱۸۹۰ء) میں اس موضوع پہ بحث کرتے ہوئے یوں کہا ہے۔

> "مخفی نہ رہے کہ متروکات کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کا ترک میرے نزدیک ضروری، دوسرے وہ جن کا ترک ضروری نہیں، ہاں بہتر ہے ترک اون کا الا ایک شرط کے ساتھ اور وہ شرط یہ ہے کہ زبان بگڑ نہ جائے یعنی اگر اون کے ترک کے سبب سے زبان بگڑ جائے اور وہ مزا کلام میں نہ رہے جو بغیر ترک رہتا ہے، تو وہ ترک نہ کرے کیونکہ بہت دیکھا ہے ایسا کہ بعض اساتذہ نے پابندی جو کی تو رنگ ہی اون کے کلام کا اوس کی پابندی سے بدل گیا اور مذاق ہی دوسرا ہو گیا پس جو خوف اون کے ترک میں ایسا ہو تو پھر بہتر ہے کہ ترک نہ کرے اس لیے کہ جس قدر متروکات ہیں وہ غلط تو یقینی نہیں خصوصاً وہ متروکات کہ جو اکثر اساتذہ حال کے کلام میں بھی ہیں"[۲۰]۔

خورشید لکھنوی کی آخری بات قابل توجہ ہے کہ شعر میں کسی لفظ کے ترک کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس لفظ کی گردن ماردی گئی اور اسے زبان کی قلم رو سے جلاوطن کر دیا۔ متروک ذاتی چیز ہے، اس لیے داخلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک شاعر جو لفظ ترک کرتا ہے، دوسرے اس کے استعمال میں قباحت محسوس نہیں کرتے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ متروکات کے باعث کچھ الفاظ کا گویا حقہ پانی بند کر دیا جاتا ہے لیکن صرف شعرا کے لیے

عوام انھیں استعمال کر سکتے ہیں بلکہ کرتے رہتے ہیں۔ عوام زبان کا استعمال غیر تخلیقی مقاصد کے لیے کرتے ہیں، اس لیے یہ ذوق اور جمالیاتی حس کا معاملہ نہیں ہوتا لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ تخلیقی زبان کے معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے تعلیم یافتہ اور صاحب ذوق حضرات عام بول چال میں بھی اگر ان الفاظ کا استعمال بند کر دیں تو پھر یہ لفظ گویا متروک ہو جاتا ہے جیسے میر سودا کے زمانے میں تک، کبھو، کسو، ایدھر، اودھر، آتیاں، جاتیاں وغیرہ شاعرانہ ٹکسال میں تھے لیکن جب غزل میں یہ متروک قرار پائے تو بعد میں عام زبان سے بھی خارج ہو گئے اور اب صرف زبان کے آثار قدیمہ میں شمار ہوتے ہیں۔

تلقین ترک:

سوال یہ ہے کہ کیا اساتذہ فن کے ذوق اور لفظ کی جمالیات سے ہٹ کر بھی کوئی ایسا معیار ہے جس سے متروکات کا جواز مل سکے۔

اس سوال کے جواب کے لیے ۱۱۱۲ ہجری تک پیچھے جانا ہوگا جب سعد اللہ گلشن کو ولی نے تو یہ تلقین کی:

> "زبان دکھنی را گذاشتہ و ریختہ را موافق اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد موضوع بکند"۔

دیکھا جائے تو یہ تلقین ترک تھی۔

ولی دو مرتبہ دہلی آئے تھے۔ پہلی مرتبہ ۱۷۰۰ء میں، دوسری مرتبہ ۱۷۲۰ء میں [۲۱]۔ اس مرتبہ ان کا دیوان ساتھ تھا اور غزلوں نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ ولی سے متاثر ہو کر اس عہد کے بزرگ فارسی گو شعرا مرزا مظہر جان جاناں، شاہ مبارک، غلام مصطفیٰ یکرنگ، اشرف الدین مضمون۔ آبرو۔ ناجی نے بھی اردو کے اسلوب میں غزل کہنی شروع کی۔ آج ولی کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ وہ دکنی اور شمالی ہند میں غزل کی سطح پر تخلیقی رابطے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ واضح رہے کہ خود ولی کے پیچھے بھی ایک صدی پر محیط دکنی کی تخلیقی روایات تھیں۔ دکنی میں مقامی بولیوں کے الفاظ بکثرت موجود تھے جب کہ دربارداری کی بنا پر دہلی میں فارسی کا چلن عام تھا، اس لیے اس عہد کے شعرا جب ولی کی طرف دیکھتے تو دکنی کی صورت میں انھیں متعدد نامانوس الفاظ محاورات اور تراکیب نظر آتیں لیکن ان کے ذوق کو دیکھتے تو وہ

فارسی کی شعری اور لسانی روایات سے تشکیل پاتا تھا۔ عوام کی زبان چونکہ سادہ اور عام فہم ہوتی ہے اور تخلیقی زبان کے برعکس اس کا لہجہ عام بول چال پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے اس عہد کی زبان خاصی ہندی آمیز تھی اور ظاہر ہے کہ جب فارسی کا معیار فصاحت شعری پیمانہ ہے گا، تو پہلی زد ہندی پر ہی پڑتی تھی۔ اور یہی ہوا، جوں جوں غزل اردوئے معلی، شاہجہان آباد کے سانچے میں ڈھلتی گئی، اس میں سے ہندی الفاظ بھی خارج ہوتے گئے۔ کمال تو یہ ہے کہ ان متروک الفاظ میں سے بیشتر آج بھی زندہ ہیں بلکہ گوشوں کی کوملتا کے ضامن بھی ہیں۔ وحید الدین سلیم کے الفاظ میں "شاعری کے پہلے اور دوسرے دور میں ہندی الفاظ کثرت سے مستعمل تھے۔ تیسرے دورے میں ان کی جگہ فارسی عربی الفاظ رواج پا گئے تھے لیکن اس دور میں بھی بہت سے ہندی الفاظ رائج تھے جو چوتھے دور میں متروک ہوئے اور رفتہ رفتہ زبان فارسی، عربی آمیز ہوتی گئی مثلاً تیسرے دور میں شام کی جگہ سانجھ، محبوب کی جگہ سجن، شہر کی جگہ نگر، جدائی کی جگہ برہا، ذرا کی جگہ ٹک، چہرہ کی جگہ مکھ، خوشبو کی جگہ باس، قول کی جگہ بچن، دنیا کی جگہ جگ، ہوا کی جگہ باد، بادیوں وغیرہ الفاظ مستعمل تھے۔ اس دور میں بہت سے الفاظ زبانوں پر جاری تھے جن کی شکل چوتھے دور میں بدل گئی مثلاً اس زمانے میں مٹی کی جگہ ماٹی، کلائی کی جگہ لاٹا، پشتنا کی جگہ پاشتا، کیچڑ کی جگہ کیچ، جگر کی جگہ جاتھ، لہو کی جگہ لوہو، گھسنا کی جگہ پالکسر کی جگہ گھسنا (بالتحریک) ڈبیا کی جگہ ڈوبایا وغیرہ بولتے تھے۔"[71]

اس ضمن میں ایک اور امر بھی توجہ طلب ہے کہ خود دہلی کے گلی کوچوں میں معلی اردو کے برعکس وہ زبان بولی جاتی تھی جس کا نمونہ اب "باغ و بہار" کی نثر کی صورت میں محفوظ رہ گیا ہے اور جسے شعوری کاوش سے انشاء نے "رانی کیتکی کی کہانی" میں اپنایا یعنی عربی فارسی سے پاک بھاشا۔ مولانا وحید الدین سلیم نے اپنے مقالے "عہد میر کی زبان میں" میر کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ "لکھنئو میں ایک موقع پر انھوں نے لوگوں سے کہا تھا کہ خاقانی، سعدی اور حافظ کا کلام سمجھنے کے لیے فارسی زبان کی فرہنگیں درکار ہیں مگر میر کا کلام کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ اس زبان سے واقف نہ ہو جو دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر سنی جاتی ہے۔ فی الحقیقت میر صاحب نے محاورے کے سامنے اس کی مطلق پرواہ نہیں کی کہ جن زبانوں سے الفاظ اردو زبان میں آئے۔ ان میں اصلی شکل ایسے الفاظ کی کیا تھی مثلاً وہ مسجد کو مسیت، پلید کو پلیت، دستخط کو دسخط، شتاب کو شتابی، اضطراب کو

اضطرابی، قرآن کو قران، اسیری کو اسرانی، خیالی کو خالی (بروزن حالی) نزدیک کو نزیک باندھ گئے ہیں"۔ (۵)

جہاں تک اصلاح زبان میں اولیت کا تعلق ہے تو بلاشبہ خان آرزو اساسی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ ان کی لغت "نوادر الالفاظ" کا تذکرہ مناسب موقع پر کیا جائے گا۔ خان آرزو لسانیات کا بہت گہرا شعور رکھتے تھے۔ انھیں اشتقاقیات سے بھی دلچسپی تھی اور وہ لفظ کی بدلتی صورتوں اور معنی میں تدریجی تبدیلیوں کے عمل سے بھی آگاہ تھے جس کا ثبوت "مثمر" سے بھی مل جاتا ہے۔

اس گہرے لسانی شعور کو مد نظر رکھ کر جب اصلاح زبان کے بارے میں خان آرزو کی سعی کا مطالعہ کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کام ان ہی کو زیب دیتا تھا کیونکہ وہ زبان کی باریکیوں کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ جہاں تک اصلاح زبان کے بارے میں ان کی سعی کا تعلق ہے تو ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول: "دہلی کے عوام ایک مخلوط قسم کی زبان بولتے تھے جس کو ہانگڑو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں ہریانی الفاظ اور قصباتی محاورے کی خاص آمیزش تھی۔ خان آرزو نے اصلاح زبان کے سلسلے میں سب سے پہلے انھی الفاظ کی فصاحت اور عدم فصاحت کی طرف توجہ کی اور یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اردو کے ابتدائی لہجے اور تلفظ کو متعین کرنے اور ٹکسالی اردو کو مشتہر کرنے میں انھوں نے ایک موسس اور واضع اول کا کام کیا۔ اصلاح زبان کی باقی سب کوششیں اس کے بعد کی ہیں"۔ (۶)

اصلاح زبان کے نقطۂ نظر سے جب قدیم دور کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس عہد کے شعرا کے سامنے بحیثیت مجموعی تین اسالیب تھے۔ غزل کا دکنی اسلوب، نستعلیق فارسی کا انداز اور دہلی کی گلیوں کی عوامی زبان کا لب و لہجہ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ زبان کو فصیح بنانے کے لیے نہ دکنی اسلوب کام آسکتا تھا، نہ عوامی لب و لہجہ، اس لیے فارسی کا معیار فصاحت ہی سند بن سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا جب قائم یوں طعنہ زن ہوئے:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

تو یہ اس لسانی طرز احساس کی بنا پر تھا جس کی آبیاری فارسی کی شعری روایات نے کی تھی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک دکنی غزل بلکہ تمام دکنی شاعری کا تعلق ہے، تو وہ ولی میں

مروج شاعری سے بلحاظ خیال و طرز ادا بہتر بھی ہے اور پر لطف بھی۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ متروکات کا عمل، ترک لفظ سے عبارت ہے، نہ کہ ترک خیال سے۔ لہذا جب دہلی کے شعرا کو یہ احساس ہوا کہ اب غزل کی زبان صاف کرنی چاہیے، تو وہی الفاظ متروک قرار پائے جن کی جڑیں ہندی یا دکنی میں پیوست تھیں اور ان ہی کو متروک قرار دیا گیا کہ معیار، فصاحت فارسی تھا۔ اس ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: "ان کی اصلاح نے بہت سے الفاظ ولی کے عہد کے نکال ڈالے مگر پھر بھی "بھلارے" اور "گھیرے گھیرے" اور "مرے ہے" بجائے مرتا ہے اور "دوانہ" بجائے دیوانہ اور "سیاں" اور "جان" کا لفظ بجائے معشوق موجود ہے۔ متاخرین اس کی جگہ جان جاں یا جاناں یا یار یا دوست یا دلبر وغیرہ وغیرہ بولنے لگے مگر موہن اور دام میں نہ رہا بن رہا اور بل گیا یعنی جل گیا یعنی صدقے گیا اور سی بجائے دل بھی ہے:(۷)

یہ انھوں نے "دوسرا دور" کی تمہید میں لکھا تھا جب کہ "تیسرا دور" کی تمہید میں وہ یوں رقم طراز ہیں: "ہمارے زبان دانوں کا قول ہے کہ ساٹھ برس کے بعد ہر زبان میں ایک واضح فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ طبقہ سوم کے انتخابی جو حقیقت میں عمارت اردو کے معمار ہیں، انھوں نے بہت سے الفاظ پرانے سمجھ کر چھوڑ دیے اور بہت سی فارسی کی ترکیبیں جو مصری کی ڈلیوں کی طرح دودھ کے ساتھ منہ میں آتی تھیں، انھیں گھلایا پھر بھی بہ نسبت حال کے بہت سی باتیں ان کے کلام میں ایسی تھیں کہ اب متروک ہیں"۔(۸)

----- یہ بات وہ میر سودا کے دور کے بارے میں کر رہے ہیں:

"بات وہی رہی کہ معیار فصاحت فارسی کی شعری روایات ہیں، اب یہ الگ بات ہے کہ فارسی میں یہ لوگ خود اہل زبان کے، پایہ کی زبان نہ لکھ سکتے تھے اور نہ ہی فارسی والوں نے اہل ہند کو استثنائی مثالوں سے قطع نظر اس معاملہ میں کبھی تسلیم کیا۔ اردو شعرا کا نصاب تعلیم فارسی تھا۔ لہذا ان کے شعری مذاق اور تنقیدی حس کی تکمیل میں شعوری یا غیر شعوری طور پر فارسی بنیادی کردار ادا کرتی تھی۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر سید مبارک بھی نقش بندی نے مرزا مظہر جان جاناں کی اصلاح زبان کے سلسلے میں کی گئی کوششوں میں سرفہرست یہ امر رکھا کہ انھوں نے ہندی الفاظ پر فارسی الفاظ کو ترجیح دی گئی لہذا ولی کے زمانے کے بہت سے الفاظ اور بندشوں سے زبان پاک کی گئی (۲) فارسی الفاظ اور (۳) محاورات سے زبان اردو کو مالا مال کیا"۔(۹)

اصلاح زبان کے سلسلے میں یہ امر ملحوظ رہے کہ اگرچہ اردو عوام پسند ہو چکی تھی لیکن تخلیقی اسلوب میں ابھی کچا پن تھا، اسی لیے اصلاح زبان کا عمل طویل عرصہ پر پھیلا نظر آتا ہے۔ چنانچہ مرزا مظہر جان جاناں اور حاتم (۱۰) سے لے کر ناسخ تک عہد بہ عہد اصلاح زبان کی کاوشوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور صرف متروکات سے بھی زبان کے بارے میں بدلتے تخلیقی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس عہد کے شعرا کے لیے زبان اور اصلاح زبان کی کتنی اہمیت تھی اس کا عشرت لکھنوی کے اس بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"میر تقی میر کا جب انتقال ہونے لگا تو انھوں نے اپنے صاحبزادے میر کلو عرش کو بلا کر کہا کہ تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس دولت دنیا میں سے تو کوئی چیز نہیں ہے جس پر ہمیں فخر و ناز ہو، اگر ہوتی بھی تو قابل فخر نہ ہوتی ہاں کچھ زبان اردو کے متعلق علم سینہ میں ہے جو ہمیں ہاشمودہ ماموں سراج الدین خان آرزو کے خدا نے عطا کیا ہے اور اسی کے بھروسے پر ہم کو ہمیشہ ناز و استغنا رہا۔ میں نے ان کو تمہارے واسطے ایک کتاب کی صورت میں لکھ دیا ہے۔ اس کتاب کا نام "اصول اردو" ہے۔ زبان کی حفاظت کے لیے یہ قواعد کافی ہیں۔ ان اصولوں پر گامزن رہو گے تو اردو ایک دن بام ترقی پر پہنچے گی اور وصیت کرتا ہوں کہ اس کتاب کو بہت حفاظت سے رکھنا۔ مجھے تمنا تھی کہ خدا مجھے پوتا عطا کرتا، وہ اب تک پوری نہیں ہوئی۔ شاید میرے بعد خدا تم کو بیٹا مرحمت کرے تو اسے تعلیم دینا اور یہی کتاب یاد کرا دینا اور اس کے مطالب سمجھا دینا اور اگر کوئی اولاد نرینہ نہ ہو تو کسی اہل شاگرد کو یہ امانت تفویض کر دینا (۱۱)۔ عرش کے بیٹا نہ ہوا۔ انھوں نے یہ کتاب شیخ محمد جان شاد پیرو میر کو دے دی، نہ جانے اس کتاب کا کیا بنا" (۱۲)۔

جب دہلی کے بعد محفل شعر لکھنؤ میں آراستہ ہوئی تو وہاں کے نفاست پسند افراد نے زبان کی طرف بھی توجہ کی ویسے بھی لکھنؤ کے نفاست پسند افراد کھانے پینے، لباس اور آداب محفل میں جدتیں اور لطافتیں پیدا کر رہے تھے، وہ زبان کی طرف کیوں نہ متوجہ ہوتے۔ مصحفی

اور آتش کی انفرادی کوششوں کے ساتھ ساتھ تلامذہ ناسخ کی صورت میں متروکات کا عمل ایک لسانی رجحان صورت اختیار کر جاتا ہے۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک چلتا رہا۔

سقوط دہلی کے بعد زندگی نے جو چلن اختیار کیا اس میں متروکات سے اصلاح زبان کی ضرورت نہ رہی۔ اب فارسی مثالی نمونہ نہیں تھی بلکہ اردو کے مقابل انگریزی تھی جس کے الفاظ سر سید اور ان کے رفقا نثر میں اور اکبر الہ آبادی شاعری میں استعمال کر رہے تھے اور طنز وِمزاح والی "گلابی اردو" عام ہو رہی تھی، حتیٰ کہ قیام پاکستان کے بعد شاہ جہاں آباد کی اردوئے معلیٰ، پنجابی نثر نار تھیوں کی بنا پر دہلی اور لکھنؤ میں اردوئے محلہ ہو کر رہ گئی۔ اساسی صورت میں متروکات منفی عمل تھا یعنی ایک خاص لفظ کا استعمال ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اجتماعی رویہ یا عوامی ناپسند کی بنا پر ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک استاد سخن کی ذاتی ناپسندیدگی کی بات ہوتی تھی جس کی نتیجے میں زبان سے الفاظ تو خارج ہو جاتے لیکن ان کی جگہ لینے والے نئے الفاظ وضع نہ کیے جاتے۔

متروکات کے منفی رویہ کے باعث الفاظ تو زبان سے خارج کر دیے جاتے ہیں لیکن ان کے عوض زبان کو کیا ملتا ہے، کچھ نہیں۔ ناسخ نے سینکڑوں الفاظ متروک قرار دیے تاکہ زبان فصیح رہے لیکن خارج کردہ الفاظ کے عوض ناسخ زبان میں ایک بھی نئے لفظ کا اضافہ نہ کر سکا، اس سے بہتر تو انشا ہی رہا کہ جدت پسندی ہی کی خاطر سہی بعض انگریزی اور بھاشا الفاظ غزلوں میں استعمال کر گیا۔

متروکات کا عمل یکطرفہ تھا یعنی اس کے مباحث صرف شاعری تک محدود رہے، نثر کے بارے میں کبھی یہ بحث نہ چھڑی۔ بقول پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی:

> "شروع شروع میں جو لفظ یا ترکیبیں متروک قرار دی گئیں، ان کی بنیاد اس اصول پر ہو گی کہ ریختہ یا اردو زبان کا ذاتی تشخص اور اپنی جگہ اس کی ایک مستقل ہستی قائم کی جائے۔ پھر لطافت اور نفریت، ترنم اور سلاست کا نظریہ ترک کا معیار ٹھہرا ہو گا۔ متقدمین اور متوسطین غالباً اسی اصول پر کاربند رہے ہوں گے۔ ہاں کہیں یہ بھی ہوا کہ اردو کی دنیا میں اپنی ایک خود مختار حیثیت تسلیم کرانے کی غرض سے زبان کی گردن پر ترک کی کند چھری رت کر ایک امر ما بہ الامتیاز قائم کیا گیا،

بس یہیں سے اردو میں بدعت کی بنیاد بنی۔ (۴۳)

متروکات سے وابستہ تمام تخلیقی مضمرات اور لسانی امکانات ملحوظ رکھنے پر اصلاح زبان کا یہ طریقہ خاصہ مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ لفظ کی زندگی عوامی استعمال سے مشروط ہے۔ اگر عوام کی زبان کسی لفظ کو متروکات کی افادیت یا عدم افادیت کے بارے میں اختلاف رائے درست ہے کیونکہ بعض الفاظ کے بارے میں واقعی یہ سمجھا نہیں جاسکتا کہ آخر انھیں ترک کرنے کی کیا وجہ تھی؟

تخلیقی الجھن:

پنڈت کیفی لکھتے ہیں:

"مرزا غالب کا دیوان تیسری بار ۷۸ ۱۲ھ میں چھپا" اس کے خاتمے کی عبارت میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:

"ایک لفظ سو بار چھاپا گیا ہے، کہاں تک بدلتا ناچار جا بجا یوں ہی چھوڑ دیا گیا یعنی "کسو" میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں ہے البتہ فصیح نہیں ہے قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں ورنہ فصیح بلکہ افصح ہے"۔ (۴۴)

اگرچہ قطعی طور سے اس امر کا تعین ممکن نہیں کہ میر سودا اور ان کے معاصرین کے ہاں "کسو" کب تک استعمال ہوتا رہا لیکن لکھنؤ میں اس کا متروک ہونا ثابت ہے۔ حسرت موہانی نے "نکات سخن" میں اس ضمن میں یہ لکھا ہے "یہ دونوں لفظ یعنی (کسو اور کبھو) لکھنؤ میں ناسخ کے عہد سے متروک ہیں۔ دہلی میں غالب و ذوق و مومن تک ان کا استعمال جائز سمجھا جاتا تھا، اب وہاں بھی متروک ہیں۔ حضرت طباطبائی کے نزدیک اب یہ طے ہے کہ قافیہ کی ضرورت سے بھی ان لفظوں کا باندھنا صحیح نہیں ہے۔ راقم حروف کے خیال میں شعرا اردو کو عام طور پر حضرت نظم کے قول پر عمل کرنا چاہیے البتہ شاذ مواقع پر کہنہ مشق اساتذہ کے لیے مرزا غالب کی پیروی بھی قابل اعتراض نہیں"۔ (۴۵)

جہاں تک "کسو" کے نثر میں استعمال کا تعلق ہے تو میر امن کے ہاں اس کا استعمال

بتا ہے جنھوں نے "گنج خوبی" کے دیباچے میں یہ لکھا:

"اگرچہ فکر سخن کرنے کی ساری عمر نہیں کی، ہاں مگر خود بخود جو مضمون دل میں آیا تو اسے باندھ ڈالا نہ کسو کا استاد نہ کسی کا شاگرد ہے۔

نہ شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی
فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی"

متروکات کے ضمن میں فصاحت کی اصطلاح متعدد مرتبہ استعمال ہوئی ہے فصاحت کی تعریف کیفی نے یوں کی ہے:

"فصاحت کلام کا وہ وصف ہے جو قاری یا سامع کے ذہن کو منشی یا متکلم کے ذہن کے قریب ترین کر دیتا ہے"۔

یہ مختصر ترین تعریف خاصی جامع ہے۔ علم بیان کی کتابوں میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کے خصائص اور معنی بیان کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا گیا مگر یہ سب ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمیں صرف یہ ذہن نشین کرنا ہوگا کہ صدیوں سے فصاحت معیار شعر رہی ہے۔ واضح رہے کہ فصاحت کوئی ٹھوس چیز نہیں، نہ ہی اس میں ریاضی جیسی قطعیت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اساتذہ نے اس کے امر و نہی گنوائے لیکن اپنی اصل میں جمالیاتی حس کی مانند یہ بھی ذوقی اور وجدانی ہے۔ اسی لیے اساسی طور پر باطنی فصاحت کے معیار کی برقراری کے لیے ہی درحقیقت متروکات کے عمل کا آغاز ہوا جو اپنی اساس میں مستحسن سہی مگر اساتذۂ شعر کے لیے اس بنا پر ضروری تھا کہ فصاحت کے تقاضے ہر صورت میں پورے ہونے چاہئیں اور اس میں متروکات کا جواز مضمر ہے لیکن صرف اس حد تک کہ متروکات تخلیقی مقاصد کے تابع ہوں۔ جب یہ حصول مقصد کی بجائے بذات خود ہی مقصد قرار پا جائیں اور صنم خانۂ الفاظ میں ان کا بت مسکنی کر دیا جائے تو پھر نتیجہ ظاہر ہے اور اسی سے تخلیق کار کی اس الجھن کا آغاز ہوتا ہے جس کا اشارہ غالب کے خط میں ملتا ہے کہ کیا درست لفظ کو محض اس لیے استعمال نہ کیا جائے کہ یہ اب متروک ہے۔

شاعری میں کمال فن یا قادرالکلامی کا اظہار اس سے نہیں ہوتا کہ شاعر نے کون کون سے الفاظ نہیں استعمال کیے بلکہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے زیادہ سے زیادہ تعداد میں نئے الفاظ باندھے (نظیر اور انیس کی مثال)۔ اس نے مروج اسلوب سے انحراف کر کے اپنے لیے

نیا انداز سخن پیدا کیا (ولی)۔ اس نے نئی نئی تراکیب واضع کیں (اقبال اور غالب) اور تشبیہات واستعارات میں کیا کیا جدتیں پیدا کیں (میر انیس اور غالب) یا پھر قدیم الفاظ سے نئے تلازمات وابستہ کر کے معنی کی نئی جہت پیدا کی (فیض) شاعر کا ایک کمال اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے عام مفہوم میں غیر شاعرانہ غیر فصیح غریب یا شعری لغت سے خارج الفاظ کو کس خوبصورتی سے استعمال کیا جیسے تحقیق جیسے لفظ کو رنگین نے استعمال کیا:

ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو

یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

------ خود ناسخ نے آلات جیسا لفظ یوں استعمال کیا ہے:

خدا کے کام کچھ آلات پر نہیں موقوف

ابوالبشر ہوئے بے مادر و پدر پیدا

انشا نے جارج سوئم کے غسل صحت کی تقریب کے موقع پر تقریباً پونے دو سو اشعار کا جو قصیدہ کہا، اس میں انھوں نے انگریزی کے متعدد الفاظ استعمال کیے ہیں اس مشہور قصیدہ کا مطلع درج ہے:

بگھیاں نور کی تیار کر آئے ہوئے سی

کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانان چمن

انھوں نے جو انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں، ان میں سے کچھ درج ہیں: پوڈر، کونچ، بوتل، گلاس (گیلاس) پلٹن، آرگن، الیکٹرسٹی، لندن، لارڈ ڈنر، جرنل، فائر (فیر)

اسم بامسمیٰ: ناسخ:

اگرچہ ہر عہد کے اساتذہ سخن اپنے لسانی شعور کے مطابق مختلف الفاظ کو متروک قرار دیتے رہے ہیں مگر اس ضمن میں اساتذہ لکھنئو مصحفی، آتش اور ان کے بعد ناسخ نے خصوصی شہرت حاصل کی۔ لکھنئو اس عہد میں مرکز تہذیب و تمدن تھا اور دہلی کی اشتائی مثال سے قطع نظر نامور شعرا لکھنئو آ چکے تھے۔ میر سودا اور مصحفی نے لکھنئو کی بزم سخن کو نیا رنگ دیا۔ لکھنئو کے جدت پسندوں نے بھی ہر معاملے میں حسن، لطافت اور نزاکت کو ملحوظ رکھا، تو شاعری کیسے متاثر نہ ہوتی۔ دہلی کے شعرا دل کی بات کرتے اور انداز بیان میں سادگی ملحوظ

رکھتے۔ تزئینِ اسلوب کے لیے تشبیہ اور استعارہ تھا مگر یہ صرف طرز ادا کی آرائش کو تھا مقصود بالذات نہ بنا تھا جب کہ لکھنؤ میں اس کے برعکس خیال پر لفظ کو اور جذبے پر طرز ادا کو ترجیح دی گئی جس کے باعث شاعری لفظ پرستی میں تبدیل ہو گئی۔

میر اور درد کے ہاں سادہ بیانی سے جادو جگایا جاتا۔ سادہ تشبیہ اور سامنے کے استعارے اسلوب کا وصف خاص تھے، بالعموم طویل ردیفوں سے پرہیز کرتے اور چھوٹی بحروں کو ترجیح دیتے۔ میر نے اگر طویل بحر استعمال کی تو ترنم اس میں نیا مزہ پیدا کر دیتا ہے لیکن لکھنؤ میں اس کے برعکس ہوا۔ پر شکوہ الفاظ اور زیادہ سے قوافی بلکہ کوشش کرتے کہ ہر لفظ کا قافیہ بندھ جائے، گویا صورت حاصل نواب سید محمد خان رند کے بقول یہ تھی:

ع: کہہ لیے رند نے سب قافیے کوئی نہ چھٹا

اظہار فن یا قادر الکلامی کے لیے مشکل بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں غزل دو غزلہ اور سہ غزلہ کہا جاتا تھا جیسے ناسخ نے ایک غزل کے مقطع میں گریز کے طور پر سہ غزلہ پیوست کرنے کے لیے مقطعوں میں یہ انداز اختیار کیا:

اور لکھتا ہوں شب تاریک فرقت میں غزل
ہے مری آتش زبانی ہیر خلوت خانہ شمع

اس شاعرانہ رویے کی تشکیل میں تہذیبی اور تمدنی امور بھی کار فرما تھے۔ دہلی، آگرہ اور شاہجہان آباد میں جس تمدن نے مغلوں کے زیر اثر فروغ پایا تھا۔ وہ لکھنؤ میں چراغ کی آخری ٹمٹماہٹ تھا۔ اہل لکھنؤ کو یہ احساس نہ تھا کہ مستقبل نے انھیں کیا کچھ دکھانا ہے۔ وہاں تو امن، خوشحالی اور قدر دانی کی فضا میں اہل لکھنؤ شاعری کے ساتھ ساتھ دیگر امور زیست میں بھی جدت اختراع سے اپنی نفاست پسندی کا ثبوت دینے کے لیے سعی کناں تھے۔ لکھنؤ مرکز علم و ادب تھا تو مشاعرہ تخلیقی سرگرمیوں کا مرکز۔ مقبول اساتذہ اپنے شاگردوں کے جھرمٹ میں یوں بیٹھتے جیسے ستاروں کی محفل میں چاند ادبی چپقلش بزبان غزل اظہار پاتیں، اعتراضات ہوتے، سند دی جاتی اور اچھے شعر پر باذوق سامعین داد دینے میں بخل سے کام نہ لیتے۔ یہی وہ فضا تھی جس میں ناسخ نے متروکات کی صورت میں اصلاح زبان کی تحریک شروع کی۔ اہل لکھنؤ کو اپنے باکمال ہونے کا احساس تھا لہٰذا انھوں نے جہاں اپنے ہنر کا اظہار کیا، وہاں ہر معاملے میں دہلی سے خود کو برتر اور افضل ثابت کرنا بھی قرار پایا۔ ان کی اجتماعی نرگسیت کا

یہ تقاضا تھا کہ شعر و فن کے آئینہ میں اپنے تخلیقی خد و خال کے نظارہ سے خوش ہوں۔ ادھر دہلی کی قدیم اور عظیم روایات ان میں جس طرح کا احساس کمتری پیدا کرتی ہوں گی، اس سے عہدہ براہی کے لیے وہ خود کو اہل دہلی سے ہر معاملے میں برتر و منفرد اور ممتاز سمجھنے پر مجبور تھے۔ یوں دیکھیں تو اہل لکھنؤ کی تخلیقی مساعی، ایک طویل تعلی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ واضح رہے کہ تعلی بالعموم مقطع ہی میں کی جاتی ہے۔ "دلی کا دبستانِ شاعری" (از ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی)، لکھنؤ کا دبستان شاعری (از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرح لکھنؤ میں دہلی کے لاتعداد برمحل الفاظ، محض اس لیے متروک قرار پا۔ ئے کہ وہ اساتذہ دہلی کے ہاں عام تھے۔ اسی طرح میر امن کا خود کو "دلی کا روڑا" لکھنا" رجب علی بیگ سرور کو کیوں برا لگا، اتنا کہ اس کے جواب میں "فسانۂ عجائب" لکھ کر دیباچہ میں "قصیدہ در مدح لکھنؤ" قسم کی تحریر لکھنا پڑی تو اس کا محرک بھی یہی احساس برتری تھا حالانکہ وقار عظیم کے الفاظ میں تو یہ میر امن کی "بے ضرر سی تعلی" تھی۔

تو یہ ہے وہ ذہنی فضا اور تخلیقی ماحول جس میں شیخ امام ناسخ (وفات ۱۵ اگست ۱۸۳۸ء) نے متروکات کے عمل کا آغاز کیا اور اس مقصد کے لیے اپنی بہترین صلاحتیں وقف کر کے اردو زبان کو صاف کیا، محاوروں کی نوک پلک سنواری اور یوں "لکھنویت" کا اثبات کیا۔ اگرچہ بعض جدید محققین (جیسے مولوی عبدالحق، پنڈت کیفی) نے متروکات کے ضمن میں ناسخ کے بے لچک رویہ کو پسند نہیں کیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں اس کام کو بہت اہمیت دی گئی اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

ناسخ نے اصلاح زبان کے لیے جو سعی کی، آج ہم اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر کوئی باضابطہ کتاب تحریر نہیں کی۔ اگر حاتم کی مانند ناسخ نے بھی کسی دیوان کے مقدمے یا دیباچے میں اپنے لسانی شعور کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی روشنی میں فصاحت الفاظ اور متروکات کی بحث کی ہوتی تو اس سے جہاں ناسخ کی تنقیدی حس کا اندازہ ہو سکتا تھا، وہاں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ کس وجہ سے وہ لفظ کو متروک قرار دے دیتے تھے۔ ان کا سارا انحصار اصلاح شعر پر تھا اور ظاہر ہے کہ تمام تلامذہ کے تمام اشعار کی اصلاح اور ان سے وابستہ جملہ امور کا اب سراغ لگانا مشکل نہیں ویسے بھی یہ سلسلہ زبانی ہوتا تھا۔ اگر غالب کی مانند ناسخ کے بھی تمام خطوط دستیاب ہوتے تو ان سے ہی

متروکات تذکیر و تانیث واحد، جمع اور اسی نوع کی دیگر معلومات حاصل ہونے کا امکان تھا۔
بس یہی وہ اشعار ہیں جن سے ناسخ کی "تنقیدی حس" اور "لسانی شعور" کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ متروکات کے نقطۂ نظر سے مواد کی عدم فراہمی کے باعث اب اس امر کا تعین وثوق سے نہیں ہو سکتا کہ ناسخ نے متروکات سے واقعی زبان کی خدمت کی یا الفاظ کے معاملے میں آمریت کا ثبوت دیتے رہے اور اصلاح شعر سے معرض وجود میں آنے والا ان کا لسانی رویہ صحت مند تھا یا برعکس۔ تاہم اتنا ہے کہ ان کے شاگردوں کی فہرست خاصی طویل تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان کے شاگردوں کے شاگرد یعنی پوتے اور پڑپوتے شاگردوں تک کے ذریعے سے ان کی اصلاحات کے مثبت (یا منفی) اثرات نظر آتے رہے۔
متروکات کے بارے میں ہمارے ناقدین اور محققین میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے جس کا اندازہ "نقد متروکات" مطبوعہ نقوش ادبی معرکے نمبر ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء کی بحث کے شرکاء کے خیالات سے لگایا جا سکتا ہے۔ شرکاء پنڈت برجموہن دتاتریا کیفی، احسن مارہروی اور منوہر لال زشتی ہیں۔ جو کوئی شے بغیر ارادہ و اختیار کے خود بخود دل کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ "پرے"[۱۷] کا لفظ بھی متروک ہے مگر جب عرض کیا جاتا ہے کہ اس کی بجائے کیا استعمال کیا جائے تو ارشاد ہوتا ہے کہ "ادھر" مگر پرے اور "ادھر" کے معنی میں بہت فرق ہے۔ "ادھر" صفت کو بتاتا ہے اور پرے بات کا اظہار کرتا ہے۔ "مت" بھی متروک سمجھا گیا ہے حالانکہ اس کے معنی خاص ہیں، "نہ" یہ کام نہیں دے سکتا، "نہ" افعال کی عام نفی کے لیے ہے اور "مت" نہیں کے واسطے مخصوص ہے اسی طرح بہت سے لفظ مثلاً خاطر، سو، تو، ناؤ، منہ جانا، بھلا (بمعنی اچھا)، کا نشہ وغیرہ وغیرہ متروک قرار دیے گئے ہیں۔ ان الفاظ کے متروک ہونے کی کوئی اور وجہ معلوم نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ لکھنو کے بعض شعرا نے ان کا لکھنا ترک کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی"۔[۱۸]
پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی نے بھی اس طرز عمل پر شدید احتجاج کرتے ہوئے لکھا۔
"جتنی قیدیں نظم لکھنے والوں پر عائد کی گئی ہیں، وہ سراسر جابرانہ اور ناجائز ہیں۔۔۔
۔۔۔ نہ اس سے زبان کی ترقی ہوگی اور نہ تخیل شاعرانہ کی توسیع۔ ایسی کا جو بھوجو زبان جو ہمارے نقاد اور غیر منصف ادیب بنانا چاہتے ہیں، سرسبز نہیں ہو سکتی۔ ہمارا دستور العمل یہ ہونا چاہیے۔

"مصلحت بین و کار آسان گیر"

ورنہ خوف ہے کہ اگر اس طرح ہرج اور ترک متروک کی لے یوں ہی بڑھتی گئی تو مرزا غالب کا یہ قول ہمارے حال کے مصداق نہ ہو جائے "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں"۔ (۸۸)

شاید ابتدا میں متروکات کی ضرورت ہوگی کہ زبان تخلیقی اظہار سے نشوونما پا رہی تھی لیکن جب زبان ہر طرح کے اظہار مقاصد پر قادر ہو جائے اور قد آور شخصیات تخلیقی امکانات سنوار چکی ہوں، تو متروکات کا عمل زبان کو دیوبانی بنانے کے مترادف ہوتا ہے جس کی تہ میں یہ نرگسی رویہ ملتا ہے کہ یہ ہماری زبان ہے اور ہم اس کی حرمت کے رکھوالے ہیں لیکن زندہ زبان کو قواعد و ضوابط کے تالوں میں یوں مقید نہیں کیا جاسکتا۔ زبان تو ہوا کی مانند آزاد ہے جس میں الفاظ پھولوں کی خوشبو کی مانند ہوتے ہیں پھولوں پر گیت گانے والی بلبل کو تو قفس میں ڈالا جاسکتا ہے مگر پھولوں اور ہوا کو نہیں۔

ایہام: دام الفاظ:

ڈاکٹر ملک حسن اختر نے اپنی کتاب "اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک" میں متعدد لغات اور کتب کے حوالے سے ایہام کی یہ تعریفیں کی ہیں:

"ایہام عربی کا لفظ ہے اور اس کا مطلب نور اللغات میں وہم میں ڈالنا، المنجد میں وہم میں پڑنا یا وہم میں ڈالنا اور فرہنگ آنند راج میں در غلطی انداختن و در شک افگندن بتایا گیا ہے کہ اس صنعت کے استعمال سے پڑھنے والا وہم میں پڑ جاتا ہے یا مفہوم کے سمجھنے میں غلطی میں پڑنے کا احتمال ہے، اس لیے اس کا نام ایہام رکھا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے اصطلاحی معنی کیا ہیں۔ جامع اللغات میں لکھا ہے "علم عروض کی ایک صنعت شاعر شعر میں ایسا لفظ لاتا ہے جس کے دو معنی ہوں مگر یہ تعریف ناقص ہے کیونکہ اس طرح بعض اور صنعتیں صنعت ایہام کے ساتھ شامل ہو جاتی ہیں مثلاً صنعت ایہام تناسب یا صنعت استخدام وغیرہ۔ خواجہ دل محمد نے گلزار معنی میں اس کی تعریف یوں کی ہے: "شعر میں ایسا لفظ لانا جس کے دو معنی ہوں، ایک معنی اس مقام کے قریب ہو، دوسرے بعید لیکن شاعر معنی بعید مراد لے"۔

نکات الشعرا میر تقی میر (ص ۱۸۰) طبقات الشعرا ص ۳۴ اور تذکرہ ریختہ گویاں از

گردیزی (ص ۳۸۹) میں بھی یہی تعریف دی گئی ہے۔ حدائق السحر چھٹی صدی ہجری میں لکھی گئی۔ یہ قدیم ترین کتاب ہے جس میں ایہام کی مستند تاریخ ملتی ہے اور جو آج تک رائج ہے۔ اس تاریخ میں لفظ بعید کی بجائے غریب استعمال ہوا ہے اور صنعت ایہام کا ایک اور نام صنعت تخییل بتایا گیا ہے۔

> "این صنعت، تخییل نیز خوانند و چناں بود کہ دبیر یا شاعر در نثر یا در نظم الفاظے بکار برد کہ آں لفظ را دو معنی باشند۔ یکے قریب و دیگرے غریب و چوں سامع آں الفاظ را بشنود حالی خاطرش بمعنی قریب رود و مراد از آں لفظ خود معنی غریب بود"۔

اس کے بعد ساتویں صدی ہجری میں لکھی جانے والی کتاب "المعجم فی معاییر اشعار العجم میں اس کا مطلب برہان الکندان ہے اور تعریف و طواط سے ملتی جلتی دی گئی ہے۔

> "لفظے ذو معنی بکار دارد و یکے قریب و یک غریب تا خاطر سامع نخست بمعنی قریب رود و مراد قائل معنی غریب باشد"۔ [۳۸]

"حدائق البلاغت" میں ایہام کے لیے توریہ کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے" جس کے لغوی معنی جدا کرنے کے ہیں [۴۰]، جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ میں: "ایہام کی نوعیت یہ ہے کہ شاعر پورے شعر یا اس کے جزو سے دو معنی پیدا کرتا ہے یا پھر ایک ذو معنی لفظ کے استعمال سے دو مطلب بہم پہنچاتا ہے، یہ دونوں صورتیں صنائع میں داخل ہیں۔ اول الذکر کو ادماج اور آخر الذکر کو ایہام کہتے ہیں۔ ایہام کے معنی یہ ہیں کہ وہ لفظ ذو معنی ہو جس پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے اور ان دونوں معنی میں سے ایک معنی قریب ہوں، دوسرے بعید۔ اپنے شعر میں شاعر کی مراد معنی بعید سے ہو، قریب سے نہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ ایہام میں شعر کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے، دو نہیں ہوتے۔ وہ لوگ جو ایہام کا رشتہ سنسکرت کے سلیش سے جوڑتے ہیں، بھول جاتے ہیں کہ سلیش اور ایہام میں بنیادی فرق یہی ہے کہ سلیش میں ایک شعر کے تین تین چار چار معنی ہوتے ہیں جبکہ ایہام میں صرف ایک معنی ہوتا ہے۔ ضرور ہے کہ ایہام کا شعر پڑھ کر ذہن دونوں معنوں کی طرف جاتا ہے لیکن جلد ہی ایک معنی کو تلاش کر لیتا ہے اور اس تلاش کے عمل سے وہ شعر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس دور کے ایہام گویوں نے عام طور پر لفظوں سے ہی ایہام پیدا کیا ہے۔ دو بے میں جو اپ بھرنش

کی قدیم ترین صنف شاعری ہے عام طور پر یہی صورت ملتی ہے، اس کا اثر بھی اس دور کی شاعری نے قبول کیا"۔(۳)

جہاں تک سنسکرت کی صنعت سلیش کا تعلق ہے تو مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مقالے "اردو شاعری میں ایہام گوئی" مطبوعہ "ہم قلم" کراچی جون ۱۹۶۱ء میں اس کے بارے میں یہ لکھا۔

"سلیش سنسکرت کا لفظ ہے۔ سنسکرت میں اس صنعت کی کئی قسمیں ہیں مگر ان میں سے خاص دو ہیں، بھنگ اور ابھنگ۔ بھنگ میں لفظ سالم رہتا ہے، ابھنگ میں لفظ کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے یہ صنعت پیدا ہو جاتی ہے، ہندی میں یہ سنسکرت سے آئی ہے"۔

مندرجہ بالا سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایہام میں شعر کے دو معنی ہوتے ہیں۔ شعر سنتے ہی سامع کے ذہن میں قریبی معنی آتے ہیں لیکن ذرا غور کرنے پر ایک اور معنی بھی برآمد ہوتے ہیں جو اس لحاظ سے تو معنی بعید بھی ہوتے ہیں کہ ان تک رسائی کے لیے ذہن پر زور ڈالنا پڑتا ہے تاہم یہ معنی بعید شعر کے الفاظ میں پنہاں ہوتے ہیں اور معنی قریب سے معنی بعید تک رسائی کے لیے شعر کے الفاظ ہی میں اشارہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ مومن کا یہ مشہور شعر ملاحظہ کیجیے:

شب جو مسجد میں جا پھنسے مومن
رات کاٹی خدا خدا کرکے

شعر پڑھتے ہی فوراً یہ معنی ذہن میں آتے ہیں کہ مومن نے تمام رات مسجد میں عبادت کی لیکن "جا پھنسے" پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ مسجد میں جانا بخوشی نہ تھا بلکہ کسی جبر کے تحت مسجد میں جا پھنسے۔ دوسرے مصرع میں ہر قرینہ ملتا ہے۔ خدا خدا کرنا محاورہ ہے جس کا مطلب تکلیف میں خدا کو یاد کرنا، نہ کہ عبادت میں خدا کی یاد۔ لہذا معنی بعید معنی قریب کے برعکس ثابت ہوئے اور اسی میں ایہام کا سارا مزہ پوشیدہ ہے۔ ایہامی شعر کی ذومعنویت شعوری ہوتی ہے، اسے اظہار عجز نہ سمجھا جائے، نہ ہی اسلوب کی خامی۔ شاعر معنی قریب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ شعر میں ایسا قرینہ بھی رکھتا ہے کہ ذہن قاری کا ذہن معنی بعید تک پہنچ جاتا ہے۔ ایہام، اسلوب پر استوار ہوتا ہے اور یہ لفظوں کا کھیل ہے بلکہ اپنی اساسی صورت میں تو ایہام ایک خاص ذہنی مشق کی صورت اختیار کر جاتا ہے قادر الکلام شاعر

ذہین قاری کے لیے لفظوں کا دام بچھاتا ہے جو اپنے ذہن رسا سے معنی قریب کے پٹ کھول کر معنی بعید تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

معنی قریب اور معنی بعید کی مختلف صورتوں کے بارے میں ملک ڈاکٹر حسن اختر نے یوں لکھا ہے۔

۱۔ معنی قریب لفظ کے وہ معنی ہوں گے جو عوام میں عام طور پر مشہور ہوں اور معنی بعید وہ لغوی معنی ہوسکتے ہیں جو کم مشہور ہوں۔

۲۔ اگر کسی لفظ کے حقیقی اور مجازی معنی مراد ہوں تو لغوی یا حقیقی معنی قریب اور مجازی معنی بعید ہوں گے۔

۳۔ اگر معنی اس مقام کے مناسب ہوں تو وہ قریب کے معنی کہلائیں گے لیکن اگر وہ اس مقام کے مناسب نہ ہوں تو وہ معنی بعید ہوں گے (۲۲)۔

ذو معنی الفاظ سے تفنن کا پہلو پیدا کرنا مزاح کے اساسی عناصر میں سے ہے اور یہ عام گفتگو میں اتنا عام ہے کہ بطور خاص کبھی اس کی طرف توجہ ہی نہیں جاتی۔ لطیفوں اور چٹکلوں اور پھبتیوں میں اس سے بطور خاص کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ڈرامے کے مزاحیہ مکالمات میں بھی یہ انداز اپنایا جاتا ہے۔ ذو معنی سے پہلے مغالطہ پیدا کرنا پھر نیا اور انوکھا مفہوم دینا اس "کھیل" کا متنوع طور پر عام گفتگو میں یہ مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ انگریزی میں (PUN) پن اس کی بہت اچھی مثال ہے جو تخلیقی سطح پر "ہیرک" کی اساس بنتا ہے۔ اردو میں ذو معنی کا تخلیقی استعمال، ایہام کے فن کی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ ہر چند کہ ہر ایہامی شعر کا پر مزاح ہونا ضروری نہیں لیکن یہ بھی طے ہے کہ اس کی سنجیدگی بھی باعث تفریح ہو سکتی ہے بقول قائم:

بطور ہزل آ ہے قائم یہ گفتگو ورنہ
تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

ولی کے زیر اثر جب دہلی کے فارسی گو اساتذہ نے منہ کا ذائقہ بدلنے یا تفنن طبع کو اردو غزل کہی تو ان کے سامنے ولی کی غزل کا نمونہ تھا لہذا انھوں نے وہی انداز اپنایا۔ ولی کو اگرچہ بطور خاص ایہام گو شاعر نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کی غزل میں ایہام بھی موجود تھا۔ ولی کا اصل کمال فن ایہام میں نہیں بلکہ جمال پرستی اور اس سے جنم لینے والے پر جمال اسلوب میں ہے۔ مزید برآں ولی کے تخلیقی شعور کے پس منظر میں طویل شعری روایات تھیں۔ دکنی غزل

کا سارا اجمال ولی کی صورت میں آ کر ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتا ہے، اسی لیے عابد علی عابد نے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے کلاسیک کے معیار کو اساس بنا کر صرف ولی کو اردو غزل کا کلاسیک قرار دیا تھا۔

دہلی کے دور اول کے اردو غزل گو شعرا کے لیے تو ایہام نے ایک کھلونے کی صورت اختیار کر لی۔ اس کی ذو معنویت میں تفنن کا جو پہلو تھا، وہ مشاعروں میں یقیناً باعث داد ہوگا۔ یوں قلیل عرصہ میں شعرا کی پوری نسل ہی ایہام گو بن گئی۔ لطیفہ یہ ہے کہ خود دکنی غزل گو شعرا نے ایہام سے اتنی رغبت ظاہر نہ کی۔ وہاں جن شعرا کے ہاں ایہام ملتا ہے، وہ محض آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ بعض دیگر صنعتوں کی مانند ایہام کا بھی بطور ایک صنعت استعمال اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ دکن میں غزل کی قدامت کے باوجود ایہام سے وہ خصوصی شغف نظر نہیں آتا جس کا اظہار دہلی کے شعرا نے کیا۔ اس حد تک کہ اس نے تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے برعکس دکن میں تحریک تو کیا دکن میں یہ لغوی رجحان بھی نہ تھا جبکہ دہلی میں ایہام گوئی کا آغاز غزل گوئی کے آغاز سے منسلک نظر آتا ہے۔

تاریخی لحاظ سے سراج الدین علی خان آرزو (۱۶۸۷۔۱۷۵۶ عیسوی) سے ایہام کا آغاز سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ نجم الدین شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون اور غلام مصطفیٰ یک رنگ کے استاد تھے۔ ویسے استادی شاگردی تو ایک تکلف تھا کیونکہ یہ تینوں اپنے طور پر خود اہم شعرا میں شمار ہوتے تھے اور صاحب تلامذہ بھی تھے۔ اگرچہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول "آرزو نے اردو میں تقریباً ۲۷ اشعار کہے ہیں"[۲۳] مگر اس کے باوجود ان کی اہمیت مسلم ہے کہ ایک تو "آرزو نے اردو شعرا میں اعتماد پیدا کر کے انھیں ریختہ میں بطرز فارسی شعر کہنے پر مائل کیا"[۲۴]، "دوسرے آرزو نے ایہام گویوں کی بھی رہنمائی کی اور اس دور کے پسندیدہ رنگ سخن میں شعر کہہ کر ان میں بھی اعتماد پیدا کیا"۔[۲۵]

اس زمانے میں سید محمد شاکر ناجی، محمد احسن بھی تھے اور ان کے ساتھ ہی شیخ ظہور الدین حاتم کا نام بھی آتا ہے اور یہی وہ شعرا ہیں جنھوں نے دہلی میں بزم شعر جمائی اور اردو غزل کی اساس استوار کر کے ایہام سے خصوصی شغف کا اظہار کیا بقول مضمون:

ہوا ہے جگ میں مضموں شہرہ تیرا
طرح ایہام کی جب سیں نکالی

جبکہ ناجی نے یہ دعویٰ کیا:

ریختہ ناصر کا ہے محکم اساس
بات میری بانیٔ ایہام ہے

ان اساتذہ کے شاگردوں نے بھی یہی انداز اپنایا اور تھوڑے ہی عرصے میں دہلی کے مشاعرے ایہام سے گونجنے لگے۔ دیگر صنعتوں کی مانند ایہام بھی مصنوعی ہے۔ بنیادی طور پر محض لفظی گلابازی ہے لہذا لفظی اچھل کود میں شاعر کے لیے جذبات اور حقیقی احساسات کے اظہار کی گنجائش نہیں رہتی۔ صنعت کبھی کبھار اور ازخود موزوں ہو جائے تو شعر کے مزے میں اضافے کا موجب بنتی ہے لیکن جب صنعت برائے صنعت ہو تو اس سے جو مصنوعی اسلوب اور سطحی طرز اظہار جنم لیتا ہے، وہ شعر کو شعر نہیں رہنے دیتا ہے، اسی لیے ایہام کے خلاف ردعمل شروع ہو گیا۔

صاف گوئی:

اس ردعمل کو حاتم کے الفاظ میں "صاف گوئی" (دیوان زادہ) کہا جا سکتا ہے لیکن "مصحفی کے الفاظ میں "تازہ گوئی" (عقد ثریا ص ۲۳)۔ اس کے آغاز کا سہرا مرزا مظہر جان جاناں کے سر باندھا جاتا ہے۔ اگرچہ ابتدا میں انھوں نے بھی ایہامی اشعار کہے لیکن جلد ہی بیزار ہو گئے۔ ڈاکٹر سید تبارک علی نقشبندی نے ان کی اصلاحی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "حقیقت بیانی اور سادہ گوئی پر اردو شاعری کا سنگ بنیاد رکھا، اس لیے آپ نقاش اول ریختہ کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ آپ کی اس مساعی جمیلہ کا اعتراف زیادہ و بیشتر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے"۔ (۲۷) انھوں نے اس ضمن میں قدرت اللہ شوق کے تذکرہ طبقات الشعراء سے یہ رائے بھی نقل کی ہے:

> "سیر گویند اول کسے کہ طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد کہ الحال پسندیدہ خاطر عوام و خواص وقت گردیدہ، مروج ساختہ، زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقف رموز جناب اکبر، کاشف کنوز طریقہ پیغمبر، جان جاناں مرزا مظہر تخلص بہ مظہر، مردے ست فرشتہ صفت"۔ (۲۸)

مرزا مظہر جان جاناں نے دیوان فارسی میں جو دیباچہ لکھا، اس سے شعر کے بارے میں ذاتی رویہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

"عہد جوانی میں شعور عشق کی تحریک پر کہ جو جوانی کے خمیر کا نمک ہے، نالہ ہائے موزوں کہے تھے اس لیے شاعری میں میرا نام آ گیا"[۲۰] ۔

مرزا مظہر کا بہت تھوڑا کلام دستیاب ہے اور جو گنتی کے اردو اشعار ملتے ہیں، ان میں یہ زندہ شعر بھی شامل ہے۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

ایہام کے خلاف اگر کوئی شاعر ذہنی ذات میں تحریک ثابت ہوا تو یہ شیخ ظہور الدین حاتم (وفات ۱۱۹۷ ہجری) ہے۔

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بس کہ ہے تلاش
حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

بقول سید محی الدین قادری زور، "حاتم نے ۱۱۲۸ ہجری میں شاعری شروع کی"[۲۰۱]۔ یہ فرخ سیر کا دور تھا۔ حاتم کے تاریخی نام ظہور کے مطابق تاریخ پیدائش ۱۱۱۱ ہجری بنتی ہے۔ شاہجہاں آباد میں ولادت ہوئی۔ اگرچہ زمانے کی روش کے مطابق حاتم نے بھی ایہام کے اشعار کہے اور ویسے بھی پر گو تھے۔ ۱۱۴۴ ہجری کے لگ بھگ دیوان مرتب ہو گیا۔ اپنے وقت کے مقبول شعرا اور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے نامور شاگردوں میں سودا سر فہرست ہے۔ اس عہد کے لحاظ سے دیکھیں تو معاصرین کے مقابلے میں حاتم کی تنقیدی حس خاصی تیز تھی اور ان کا لسانی شعور صحت مند بنیادوں پر استوار تھا۔ جبھی تو یہ کہا:

کئی دیوان کہہ چکا حاتم،
اب تلک پر زبان نہیں ہے درست

۱۱۴۴ ہجری میں یہ قطعہ کہا:

کوئی سخن کو مرے لاتا ہی نہیں خاطر میں
واقعہ یہ ہے کہ سب ہیں میرے اشعار غلط

سرِ دیوان پہ حاتم کے بجا ہے کہ لکھو
نسخۂ معتبر و خوشخط و بسیار غلط

حاتم کو معاصرین کے مقابلے میں کہیں پہلے، اصطلاح زبان کی ضرورت اور اہمیت اور ایہام کے نقصانات کا احساس ہو گیا تھا۔ ۱۱۴۰ ہجری سے قبل پہلا دیوان، ۱۱۶۰ ہجری میں دوسرا دیوان مکمل کیا۔ ۷۵ سال کی پختہ عمر میں بہت کچھ کہہ چکنے کے بعد انھوں نے اردو شاعری کی تاریخ میں ایسی نوعیت کا واحد کام کیا جس کی نظیر صرف غالب کے ہاں ملتی ہے یعنی اپنے کلام میں سے کمزور اشعار خارج کر کے منتخب اشعار پر مبنی انتخاب مرتب کیا۔ بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: "حاتم" نے ۱۱۶۸ ہجری میں (عہد عزیزالدین عالمگیر ثانی) میں دیوان زادہ کی ترتیب کا بیڑہ اٹھایا۔ دیوان قدیم سے غزلیات کا انتخاب کیا۔ زبان و بیان میں بہت سی تبدیلیاں کیں اور مذاق جدید کی غزلیات کو اس میں شامل کر کے نو مرتب مجموعے کا نام دیوان زادہ رکھا۔ دیوان زادہ میں اوزان و بحور کے علاوہ ہر غزل کی سرخی میں سنہ تخلیق مع قسم (طرحی، فرمائشی، جوابی) کا اندراج کر کے حاتم نے اپنی جدت طبع کا ثبوت دیا۔ ادبی اور لسانی نقطہ نظر سے ان کی یہ جدت قابل داد ہے۔ آج اس کے ذریعے ہم اس دور کے ادبی رجحانات اور لسانی تغیرات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ خود شاہ حاتم نے بھی دیوان زادہ کا دیباچہ لکھ کر ان رجحانات اور تغیرات کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا ہے۔ تنقیدی، تحقیقی، لسانی اعتبار سے یہ نثری دیباچہ بھی حاتم کی تصنیفات میں بہت اہم ہے۔ دیوان زادہ کی تدوین ۱۱۶۹ ہجری میں مکمل ہوئی"۔ [۳۱]

شاہ حاتم نے ۱۲۰۷ ہجری میں وفات پائی۔ حاتم نے خود بھی ایہام ترک کیا اور شاگردوں کو بھی باز رکھا۔ یوں معاصر شاعرانہ رویہ میں تبدیلی لانے کا باعث بنے۔ حاتم نے کہا تھا: "ریختہ کے فن میں ہیں شاگرد حاتم کے بہت" ۔۔۔ لیکن ان شاگردوں میں سے یہ بہت نامور ہوئے: مرزا رفیع سودا، عبدالحی تاباں، مرزا سلیمان شکوہ، سعادت یار خان رنگین اور مرزا عظیم بیگ عظیم۔ ان شعرا نے نہ صرف یہ کہ حاتم کی صاف گوئی کو شعار شعر جانا، بلکہ ایہام کے خلاف اپنے رد عمل کا اظہار بھی کیا۔ بقول سودا:

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دورنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

اگرچہ درد حاتم کے شاگرد نہ تھے لیکن وہ بھی یہ کہتے ہیں:

از بسکہ ہم نے حرف دوئی کا مٹا دیا
اے درد اپنے وقت میں ایہام رہ گیا

اور بقول میر تقی میر:

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

ہمارے بیشتر ناقدین نے کسی نہ کسی صورت میں ایہام کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اسے "اردو شاعری کی اولی تحریک" قرار دیتے ہیں (۳۳) تو ڈاکٹر ملک حسن اختر نے اپنی کتاب کا نام ہی "اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک" رکھا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن اور بعض دیگر ناقدین نے ایہام کے لسانی فوائد بھی گنوائے ہیں۔ کوئی تحریک خواہ کتنی ہی توانا یا مقبول کیوں نہ ہو، ایک وقت آتا ہے کہ جب وہ عصری تقاضوں کے تحت بدلتے تخلیقی معیار کا ساتھ نہیں دے پاتی چنانچہ اس کے خلاف رد عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جو ایہام کے ساتھ ہوا بلکہ رد عمل کا آغاز کرنے والے بھی وہی حضرات تھے جو ابتدا میں خود ہی حامی تھے۔ آرزو، مظہر اور حاتم ان میں سے اول الذکر دونوں کا اردو کلام تو خیر تبرک ہے لیکن حاتم نے بھرپور رد عمل کا اظہار کیا۔ اگرچہ کسی انداز سخن کے بارے میں قطعی طور سے یہ کہنا ممکن نہیں ہوتا کہ یہ کب ختم ہوا اور ایہام کا بھی یہی حال ہے تاہم حاتم کے ۱۷۳۶ء عیسوی میں لکھے گئے اس شعر:

کہتا ہے صاف و شستہ از بسکہ ہے تلاش
حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پہ نگاہ

اور ۱۷۳۸ء کے اس شعر:

ان دنوں سب کو ہوا ہے صاف گوئی کا تلاش
نام کو چرچا نہیں حاتم کہیں ایہام کا

سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ ان برسوں سے ہی رد عمل کا آغاز ہوا ہوگا۔ یہ اتفاق ہے حاتم کی غزلوں پر سن تخلیق درج ہوتا ہے، اس لیے صرف حاتم کی حد تک تو قطعیت سے بات کی جا سکتی ہے لیکن دیگر شعرا کے معاملہ میں ایسا نہیں۔ اب یہ اکیڈمک سی بات ہے

رد عمل کس سن میں شروع ہوا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب ردِ عمل شروع ہوا تو بھرپور ثابت ہوا۔ ادھر دہلی کے ادبی افق پر میر، سودا اور درد جیسے قد آور شعرا کے ظہور نے اس ردِ عمل میں مزید شدت پیدا کر دی اور یوں ایہام بطور تحریک ختم ہو گیا، بطور ایک شعری صفت اب بھی موجود ہے۔

دخیل الفاظ: غریب رشتے دار:

رئیس کے غریب رشتے دار گھر آئیں تو انھیں گھر سے نکالا نہیں جاتا، کھانا وانا بھی پوچھا جاتا ہے تاہم بحیثیت مجموعی ان سے جو سلوک ہوتا ہے، اس کو کم از کم حسنِ سلوک تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کچھ ایسا ہی سلوک زبان کے طہارت پسند مصلحین ان الفاظ سے روا رکھتے ہیں جنھیں، کبھی "غریب الفاظ" سمجھا جاتا ہے۔ تو کبھی دخیل ــــــــ یعنی دوسری زبانوں کے ایسے الفاظ جو شاملِ زبان ہونے کے باوجود زبان کا حصہ نہیں بن پاتے۔ بنیادی وجہ یہی ہوتی ہے کہ عوام سند قبول نہیں دیتے اور دوسری یہ کہ تخلیقی اظہار کے لیے پسندیدہ نہیں سمجھے جاتے۔

جب کبھی بھی اصلاحِ زبان کی بات ہوتی ہے تو یہ مسئلہ چھڑ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ مسئلہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ شمالی ہند میں اردو زبان کی تخلیقی عمر۔ دراصل جب فارسی گو بزرگوں نے اردو غزل سے تخلیقی دلچسپی کا اظہار کیا تو دو رجحانات نمایاں ہو گئے۔ ایک فارسی محاورات ضرب الامثال کے تراجم اور دوسرے ہندی زبان کے دکھنی آہنگ کو ختم کرنے کے لیے ہندی الفاظ کا اخراج۔ اس مقصد کے لیے اردو کو مفرس اور معرب بنانا اور اس عمل کو اصلاحِ زبان، زبان کی صفائی اور زبان کا مانجنا وغیرہ جیسے الفاظ سے موسوم کرنا۔ دیکھا جائے تو یہی رویہ شدید صورت اختیار کر کے متروکات کا محرک بنا گویا معیارِ فصاحت زبان سے ہندی الفاظ یا اسی نوع کے مقامی الفاظ کا اخراج اور اردو کو مفرس بنانا قرار پایا۔

اصلاحِ زبان کے سلسلے میں خان آرزو کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ دیکھیے آج سے تین صدیاں قبل انھوں نے کیا پتہ کی بات کہی تھی۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

"دخیل الفاظ کے تلفظ اور املا کے سلسلے میں آرزو کی رائے یہ ہے کہ اس معاملے میں لفظ کی وہ صورت (مکتوبی یا ملفوظی) اختیار کی جائے جو اہلِ زبان (عوام اور خواص دونوں) میں

رواج پذیر ہو چکی ہے۔ ایسے لفظوں کے لیے اصل زبان کی پیروی ضروری نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ نئی زبان میں اس کی وہ صورت سامنے رہنی چاہیے جو صرف عوام ہی میں مروج نہ ہو بلکہ عام و خاص سب کے نزدیک مسلم ہو چکی ہو"۔(۳۳)

آج جب ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری جیسے لسانی ماہرین کی کتابیں دیکھتے ہیں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ جسے اردو کہتے ہیں، اس نام کی کوئی زبان اپنی انفرادی غیر آمیز اور خالص حالت میں نہیں ملتی۔ اس کا ابتدائی ذخیرہ الفاظ منڈا۔ آریائی۔ سنسکرت۔ ہندی اور مقامی زبانوں پر مشتمل تھا۔ مسلمان آئے تو اسلام کی بنا پر عربی اور ثقافت کی بنا فارسی اور ترکی الفاظ کا اضافہ ہو گیا۔ مغربی اقوام کی آمد پر انگریزی، پرتگالی اور فرانسیسی الفاظ کی شمولیت کا آغاز ہوا۔ انگریز حکمران تھا لہذا انگریزی کا اثر ہونا لازم تھا۔ اب ہم سیاسی اور اقتصادی طور پر امریکہ کے زیر اثر ہیں۔ لہذا اب اردو میں امریکن سلینگ کی شمولیت ہو رہی ہے تو خالص اردو کہاں ہے؟

گزشتہ چالیس برس میں پاکستان کی دوسری زبانوں یعنی پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی کے متعدد الفاظ بھی شامل زبان ہو چکے ہیں اور اس عمل میں مزید تیز رفتاری کا امکان ہے تو پھر اصل اردو زبان کہاں ہے؟ یوں دیکھیں تو اردو کا سارا ذخیرہ الفاظ ہی دخیل یا غریب اور پنڈت کیفی کے بموجب "نیم الفاظ" پر مشتمل ہے۔ دراصل اردو کا یہ مسئلہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان میں کون سا لفظ دخیل ہے، کون سا غریب اور کون سا اجنبی۔ یہ بحث اس زبان کے بارے میں کی جاتی ہے جس کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ اس میں ہر زبان کے الفاظ کھپا کر انھیں ان کے لہجے میں ادا کرنے اور املا میں لکھنے کی صلاحیت حاصل ہے۔

اصلاح زبان کے نام پر اردو کو مفرس اور معرب بنانا دہلی اور لکھنؤ کے اہل زبان کی ثقافتی مجبوری تھی، اس لیے پہلے دہلی والوں نے خود کو دکن سے ممتاز رکھنے کے لیے اور پھر اہل لکھنؤ نے اہل دلی سے منفرد رکھنے کے لیے اصلاح زبان کی جو سعی کی، اسے اب محض لسانیات کی کتابوں تک محدود رہنا چاہیے۔ اسے اس مثال سے سمجھیے کہ متروکات کے نام پر اگرچہ لاکھوں الفاظ غیر شاعرانہ قرار پائے مگر اس سعی کی ناکامی اس امر میں مضمر ہے کہ وہ تمام متروکات میر اور سودا جیسے شعرا کے کلام کے سبب آج بھی زندہ ہیں، تو کیا ان الفاظ کے متروک قرار دیے جانے کی بنا پر وہ اشعار بھی متروک ہو گئے؟ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر متروکات کا

عمل ہمہ جہتی کے برعکس یک جہتی ثابت ہوتا ہے۔

آج ہمارے لیے اصلاح زبان اس لیے بھی مسئلہ نہ ہونی چاہیے کہ اب دہلی اور لکھنؤ کی سند نا معتبر ہے کہ خود دہلی اور لکھنؤ میں اتنی ہی غلط اردو بولی جا رہی ہے، جتنی کہ بمبئی، مدراس یا کلکتہ میں۔ پاکستان میں اردو کو اب اگر نیا خون مل سکتا ہے تو اسے مفرس یا معرب بنانے کے برعکس صوبائی زبانوں سے نئے خوبصورت، خوش آہنگ اور پر معنی الفاظ کی شمولیت سے اردو کی تخلیقی توانائی میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ چند برس پیشتر اشفاق احمد اور ان کے رفقا نے "اردو کے خوابیدہ الفاظ" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب مرتب کی جو ان الفاظ پر مشتمل ہے جو بظاہر سندھی اور پنجابی معلوم ہوتے ہیں لیکن ہیں در حقیقت اردو کے۔ اشفاق احمد کے بقول:

> "اردو تحریر تقریر میں تو اب کم استعمال ہوتے ہیں لیکن پاکستان کی علاقائی زبانوں میں اظہار کا اہم حصہ ہیں۔ ان الفاظ نے خدا جانے کب اور کس وجہ سے اپنی حرکی قوت کھو دی کہ انھیں لغت کے اوراق میں روپوش ہونا پڑا اور ان کی روپوشی کے بعد کوئی انھیں اپنے بیان کی داستان سرائے میں واپس نہ لا سکا۔ یہ الفاظ خوابیدہ ضرور ہیں، متروک نہیں کیونکہ ایک تو علاقائی زبانوں میں ان کے روزہ استعمال نے انھیں زندہ رکھا ہے، دوسرے اردو کے مستعمل محاوروں اور ضرب الامثلوں میں گاہے بگاہے ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اردو میں ایسے الفاظ کی موجودگی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ زبان اپنی گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے ایک وسیع اور ہمہ گیر زبان ہے اور اس میں اظہار بیان اور معنی و مطالب کے نازک اور لطیف پہلوؤں کے لیے ہر طرح کا لفظ موجود ہے"۔ (۳۳)

اس لیے آج طہارت پسندی کے نام پر زبان کو مفرس اور معرب بنانے کی ضرورت نہیں اور پھر اس ضمن میں یہ منطقی تضاد فراموش نہ کیا جائے کہ اب فارسی بھی غیر ملکی زبان ہے۔ جس قاعدہ کی رو سے انگریزی یا دیگر زبانوں کے الفاظ غریب اور دخیل اور متروک قرار دیے جاتے ہیں، انھی کی رو سے فارسی کے الفاظ بھی دخیل ہی قرار پاتے ہیں۔ رہی لفظ کی

جمالیات کی بات، تو لفظ کی جمالیات، حسنِ استعمال میں مضمر ہے۔ اناڑی شاعر اپنے پھوہڑ پن سے خوبصورت سے خوبصورت لفظ کا حلیہ بگاڑ دے گا جبکہ تخلیقی صلاحیتوں کا حامل شاعر تمام الفاظ بلکہ بے معنی لفظ بھی حسنِ استعمال سے حسین بنا دیتا ہے لفظوں کی چھانٹی کا عمل غیر لسانی ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اب متروک الفاظ و دخیل الفاظ اور غریب الفاظ جیسی اصطلاحات سے پیچھا چھڑا کر اصلاحِ زبان کے نام پر ان سب کے استعمال کو متروک قرار دیا جانا چاہیے۔

انشاء اللہ خان انشا نے دریائے لطافت میں جو لسانی اصول بنایا تھا، اس کی اہمیت دن بدن اجاگر ہوتی گئی۔ ناسخ کے لکھنؤ میں انشا نے یہ لکھا:

"جو لفظ اردو میں مشہور ہے اور مستعمل ہو گیا خواہ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اپنے اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ بہر حال اردو ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہو تو صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہی تو بھی صحیح۔ اس کا غلط و صحیح ہونا اردو کے استعمال پر منحصر ہے، اس لیے کہ جو لفظ اردو کے مزاج کے موافق نہیں ہے، خواہ اصل کے لحاظ سے درست کیوں نہ ہو اور جو چیز اردو کے مزاج کے موافق ہے، وہ صحیح ہے، خواہ اصل کے لحاظ سے غلط کیوں نہ ہو"

ادھر مولانا صلاح الدین احمد نے بھی کچھ ایسے خیالات کا اظہار کیا:

"زبان اور محبت پر آج تک کوئی بند باندھا نہیں جا سکا بس کچھ بنیادی اصولوں اور کیفیتوں کے سوا جو ہماری زبان کے قواعد اور مزاج سے خاص ہیں، ہمیں زبان کے فروغ اور توسیع پر ہر گز کوئی قید نہیں لگانی چاہیے۔ جو اسالیب اور جو الفاظ اور جو تراکیب زندگی کے تقاضوں سے اس میں داخل ہوں گے، اگر وہ اس کے کوائف اور اس کے مزاج کے مطابق ہوں گے تو اس میں سما جائیں گے۔ ورنہ اسی خاموشی سے نکل جائیں گے، جس خاموشی سے وہ اس میں داخل ہوئے ہوں گے" (۱۰۸)

(اردو جیسی پر تنوع اور خوش منظر زبان کے لیے اس کو زریں اصول قرار دیا جا سکتا ہے۔)

(تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ہے۔)

حواشی

۱۔ آرزو، سید احمد حسین "کلام اردو" ص ۵۳

۲۔ خورشید لکھنوی "افادات" ص ۳۰۷

۳۔ بعض ناقدین اسے درست تسلیم نہیں کرتے کچھ کے نزدیک (ابو اللیث صدیقی) وہ صرف ایک مرتبہ ۱۱۰۷ ہجری میں آئے۔ بعض کے نزدیک وہ خود نہیں آئے بلکہ دیوان آیا۔ اسی طرح بعض محققین شیخ سعد اللہ گلشن سے ملاقات کو بھی درست تسلیم نہیں کرتے۔

۴۔ افادات سلیم، ص ۳۹

۵۔ افادات سلیم، ص ۳۸

۶۔ مقدمہ نوادر الالفاظ ص ۳۸

۷۔ آب حیات، ص ۱۱۲-۱۱۱

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۹۔ "مرزا مظہر جان جاناں" (ان کا عہد اور اردو شاعری) ص ۱۱۲

۱۰۔ حسرت کے قول کے مطابق اساتذہ میں سب سے پہلے شاہ حاتم نے اصلاح زبان کی جانب توجہ دی اور بعض ناگوار الفاظ کو متروک قرار دیا۔ "نکات سخن" ۔ ص ۹

۱۱،۱۲۔ آب حیات ص ۱۹۲ (بحوالہ "تذکرہ میر") ص ۷۲-۷۱

۱۳۔ منشورات طبع چہارم ص ۱۳۶

۱۴۔ "منشورات"، ص ۱۲۷

۱۵۔ "نکات سخن"، ص ۲۸

۱۶۔ کیا میر کے اس شعر کا جواب ممکن ہے:

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

۱۷۔ "تنقیدات عبدالحق" ص ۱۶۶-۱۶۷

۱۸۔ "منشورات"، ص ۱۰۳۔

۱۹۔ "اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک" ص ۱۳۳

۲۰۔ خواجہ شجاعت علی "ترجمہ سہل حدائق البلاغت" ص ۸۹

۲۱۔ "تاریخ ادب اردو" جلد دوم حصہ اول ص ۱۹۳

۲۲۔ "اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک" ص ۱۳۵

۲۳۔ "تاریخ ادب اردو" جلد دوم حصہ اول ص ۱۳۸

۲۴۔ ایضاً ص ۱۵۶

۲۵۔ ایضاً ص ۱۶۳

۲۶۔ ان دنوں سب کو ہوا ہے صاف گوئی کا تلاش
نام کو چرچا نہیں ہے اب کہیں ایہام کا

۲۷۔ مرزا مظہر جان جاناں (ان کا عہد اور شاعری) ص ۱۱۶

۲۸۔ طبقات الشعرا ص ۹۱

۲۹۔ مرزا مظہر جان جاناں (ان کا عہد اور شاعری) ص ۱۳۳

۳۰۔ سرگزشت حاتم ص ۴۴

۳۱۔ "زبان اردو" ص ۷، ۱۸۱

۳۲۔ "تاریخ ادب اردو" جلد دوم حصہ اول ص ۱۹۰

۳۳۔ "نوادر الالفاظ" مقدمہ ص ۳۷

۳۴۔ اردو کے خوابیدہ الفاظ تعارف ص ہ، و (تعارف پر صفحات کے نمبر درج نہیں ہیں)

۳۵۔ "اوراق" شمارہ ۳ نومبر ۱۹۶۸ء۔ اسی شمارے میں "اردو میں انگریزی الفاظ کی آمیزش کا مسئلہ" پر بحث شائع کی گئی۔ محرکِ بحث مشتاق قمر۔ شرکائے بحث ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، جمیل ملک، سلیم اختر، انور سدید، ناصر شہزاد اور جمیل آذر۔ بحث کا تعارف ڈاکٹر وزیر آغا

پانچواں باب

اردو رسم الخط

دنیا کی بیشتر قدیم تہذیبوں میں زبانوں کی مانند رسم الخط کی ابتدا بھی اساطیری ہے۔ اس ضمن میں مشرق اور مغرب کی تخصیص نہیں۔ بیشتر ممالک کی اساطیر میں ایسے دیوتا یا دیویاں ملتی ہیں، جنھوں نے انسانوں کو لکھنا سکھایا۔ اس انداز نظر کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں، ایک تو یہی کہ ہر اچھی بری اور ناقابل فہم چیز کا دیوتاؤں سے منسوب کیا جانا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قدیم زمانہ میں تعلیم عام نہ تھی اور لکھنا پڑھنا صرف پجاریوں، پروہتوں، کاہنوں، نجومیوں اور شعراء کے ساتھ ساتھ حکمرانوں تک محدود ہوتا تھا جو عام لوگوں کو خاصے پراسرار اور بعض صورتوں میں تو محیر العقول نظر آتے ہوں گے۔ ان کی قوت زباندانی میں مضمر تھی جس کا اظہار ان کی تحریر اور تقریر سے ہوتا تھا۔ لہذا عام لوگوں کا تحریر کو پراسرار، طلسمی یا متبرک سمجھتے ہوئے اسے دیوتاؤں سے منسوب کرنا قرین قیاس ہے۔ اساطیر اور لفظ کا تعلق کتنا گہرا ہے، اس کا اندازہ صرف اس مثال سے لگایا جاسکتا ہے کہ اساطیر جس یونانی لفظ "Mythology" کا ترجمہ ہے اس میں "Mythos" کا مطلب، منہ سے ادا کیا گیا لفظ یا بات تھی۔

مصری اساطیر میں انسانی دھڑ پر "Ibis" کا سر رکھنے والے دیوتا "Thoth" نے مصریوں کو ہیرو غلافی سکھائی تھی۔ اس دیوتا کا ایک اور نام "Tehuti" بھی ملتا ہے۔ عقل اور دانش کا یہ عظیم دیوتا، محافظ کتب اور ستاروں کا حال جاننے والا بھی تھا۔ یہ دیوتاؤں کا کاتب بھی تھا اور بالخصوص "Osiris" کے فیصلے بھی قلم بند کرتا تھا۔ جادو اور اس سے وابستہ تمام اسرار بھی اسی دیوتا سے منسوب کیے جاتے۔ تھوت کے ساتھ فن تحریر کی دیوی کی حیثیت سے "Seshet" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ مصری اساطیر میں اس کا مقام یونانی "ہیوز" سے مماثل سمجھا جاسکتا ہے۔

قدیم فرانس (Gavl) میں "Ogmios" دیوتا کو فن تقریر میں مہارت کی بنا اگر ایک طرف روم کے دیوتا "Mercury" سے مشابہ قرار دیا جاتا ہے، تو آئرلینڈ کی اساطیر میں فصاحت و بلاغت اور شاعری کا دیوتا "Ogma" بھی ہے۔ "Ogham"

"Alphabet" کا موجد بھی یہی تھا جو "Sceltis" کی ابتدائی صورت کی تھی۔ ٹیو (ناروے سویڈن) اساطیر میں آوڈن (Odin) برتر دیوتا تھا۔ اسے Wotan یا en کے نام سے بھی پکارا جاتا رہا ہے۔ یہ بے حد دانشمند اور زیرک دیوتا تھا۔ اسے جادو سے واقفیت تھی اور "Runes" پر بھی حاوی تھا۔ (قدیم سکنڈے نیویا میں تحریر کی ا. صورت) یہ سب کچھ یوں ممکن ہوا کہ اس نے "Cauldron odhrerir" (اسے حیات سے مشابہ سمجھا جا سکتا ہے) سے اپنی تشنگی بجھائی تھی جس کے نتیجے میں وہ الفطرت علم پر حاوی ہو گیا۔ زیوس کی مانند یہ بھی دیوتاؤں کا دیوتا اور آسمانوں کا مالک اس کے کندھے پر "Raven" بیٹھے رہتے تھے۔ ایک کا نام یادداشت (Monin) دوسرے کا سوچ (Hugin) تھا۔ یہ سارا دن اڑتے رہتے اور اسے دنیا بھر کی خبریں دیتے۔ اس نے علم کیسے حاصل کیا، اس کے بارے میں ایک اور اسطور بھی ملتی ہے۔ مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔ حصول علم کے لیے چاہ دانش پر گیا جہاں کا محافظ دانش (Mimir) تھا اور اس سے اپنی تشنگی بجھانے کی درخواست کی جس پر دانش مند محافظ معاوضے میں ایک آنکھ طلب کی۔ آوڈن نے یہ شرط مان لی اور ایک آنکھ کی قیمت دے "Runes" کا علم حاصل کر لیا۔ یہ پراسرار اور طلسمی تحریر تھی جس کے علم سے یہ پر قوت پرشکوہ ہوا۔ اتنی مہنگی قیمت ادا کر کے حاصل کیا گیا علم تحریر، آوڈن نے انسانوں کو بھی دیا تاکہ وہ بھی اس دنیا میں محفوظ زندگی بسر کر سکیں[۶]۔ اس اسطور کے معنی بہت واضح ہیں یعنی حصول علم آسان نہیں اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت بھی کم ہے۔ جب حاصل ہو جائے تو اسے خود تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ بنی نوع انسان کے کام آنا چاہیے۔

ہندوستان میں رسم الخط کی ایجاد برہما کی دھرم پتنی سرسوتی سے منسوب ہے جو دا حکمت وزبان اور موسیقی کی سرپرست دیوی ہے۔ واضح رہے کہ قدیم دور میں ایک ر الخط براہمی بھی تھا جو براہما کے نام پر ہے۔ چنانچہ دیوندر ناتھ شرما نے اپنی کتاب بھا گیان کے بھومیکا میں لکھا ہے:

"براہمی کو براہما کی تخلیق یا ایجاد کہا جاتا ہے اور سنسکرت میں بھاشا کے لیے بھی براہمی کا لفظ استعمال ہوتا ہے کیونکہ زبان کو بھی خدا کی دین کہا جاتا ہے۔ اس کو برہمنوں کی بھی کہا جاتا ہے[۷]۔

ہندوستان میں رسم الخط کی ایجاد قدیم تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہے۔ سنسکرت میں لپی کو دیوناگری (دیوتا کی تحریر) کہا جاتا تھا۔ اور یہ بھی اساطیری تلازمہ ہے البیرونی نے "کتاب الہند" میں ہندوؤں کے علوم و فنون کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کے رسم الخط کے بارے میں یوں لکھا:۔

> کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کا رسم الخط مٹ گیا تھا۔ لوگ اسے بھول گئے تھے اور کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ ان پڑھ ہو گئے اور اسی سبب سے ان کی جہالت اور علم سے ان کی دوری بڑھتی گئی۔ آخر پر اسد کے بیٹے بیاس نے الہامِ الٰہی سے ان کے پچاس حرفوں کو از سر نو ایجاد کیا۔ حرف کا نام "اکشر" ہے"۔[۳]

رسم الخط کو دیوناگری کہنے کے ضمن میں البیرونی لکھتا ہے کہ "حدود مالوہ میں ایک رسم الخط ہے جس کا نام ناگر ہے۔ یہ خط صورت میں پہلے خط سے مختلف ہے۔ اس کے بعد ایک دوسرا خط ہے جس کا نام اردناگری یعنی آدھا ناگر ہے۔ اس لیے کہ اس میں دونوں خط مذکورہ مخلوط ہیں۔ بھاٹیہ اور سندھ کے بعض شہروں میں یہی خط لکھا جاتا ہے[۴]"۔ سکھ جس لپی میں لکھتے ہیں، اسے گورمکھی (گرو+ مکھ) کہتے ہیں اور یہ بھی مذہبی حوالہ ہے۔

امیر خسرو نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں اعداد پر بحث کرتے ہوئے صفر کے بارے میں یہ لکھا:۔

> اس صفر کا موجد اسا نام کا ایک برہمن تھا اور اس حقیقت میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسی کے نام پر اعداد کا نام ہند اسا پڑا تھا جو مخفف ہو کر اہل عقل کے نزدیک ہندسہ رہ گیا ہے[۵]"۔

چینی زبان کے آغاز کے بارے میں بھی ایسی ہی روایات ملتی ہیں چنانچہ ویسٹر گری زون کے مقالہ "چینی زبان کا ماخذ اور اس کے رموز" میں لکھا ہے:۔

> "چینی تہذیب کی عہد بہ عہد نشوونما میں قدیم تحریروں شکلوں (Kou-Wen) کا تعین ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ کہتے ہیں یہ کام تی ہوانگ (Ti-Houang) نے کیا۔ یہ شخص عبادت کی رسوم، فائدہ مند فنون اور خصوصاً علم کیمیا کا بھی موجد ہے[۶]"۔

اگرچہ اسلام اساطیری مذہب نہیں ہے تاہم یہاں بھی رسم الخط کو مقدس سمجھنے کا رویہ برقرار ہے۔ "آئین اکبری" میں علامہ ابوالفضل کے بموجب "بعض عبرانی کتابوں میں خط

عبری حضرت آدم صفی اللہ سے منسوب کیا گیا ہے اور ایک گروہ نے اس خط کو حضرت ادریس علیہ السلام سے نسبت دی ہے۔ بعض اشخاص کی رائے ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام نے خط مستقل ایجاد کیا...۔

"یہودی روایات سے بھی اس کی توثیق ہو جاتی ہے کہ "تحریر کے موجد حضرت ادریس علیہ السلام ہیں جن کا زمانہ طوفان نوح سے قبل ہے۔ طوفان نوح کا زمانہ چار ہزار سال قبل مسیح سے بھی زائد بتایا جاتا ہے[۸]۔"

یہ صرف چند مثالیں ہیں ورنہ عالمی سطح پر رسم الخط کے بارے میں مزید ایسی روایات ملتی ہیں جن کے بموجب رسم الخط دیوتاؤں کا تحفہ اور طلسمی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔

الفاظ کے چہرے:

ابتدا میں لفظ تصویر تھا اور یہ باعث تعجب نہ ہونا چاہیے۔ ہزاروں برس قبل مسیح کی تہذیب و تمدن اپنے عصر کے لحاظ سے کتنی ہی ترقی یافتہ، پر قوت کیوں نہ ہو لیکن ابھی تک وہ ارتقا کے اس درجے تک نہ پہنچے تھے جہاں مجرد کو اس کی مجرد صورت میں سمجھا جا سکے۔ وہ گفتگو کرتے تھے لیکن صوت اور حرف کے تعلق کا شعوری ادراک نہ رکھتے تھے لہذا جب رسم الخط کی تشکیل کی گئی تو اصوات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کے برعکس، اشیاء کی تصاویر بنا ڈالیں یعنی مرد کو حروف تہجی میں لکھنے کی بجائے مرد کی تصویر بنا ڈالی۔ اسے اصطلاح میں مصورانہ رسم الخط (Pictorial writing) یا تصویری خط (Pictograph) کہتے ہیں۔

اگرچہ بیشتر قدیم تہذیبوں میں مصورانہ رسم الخط کا رواج رہا ہے لیکن جہاں تک مصر کے مصورانہ رسم الخط ہیرو غلافی (لغوی معنی: مقدس تحریر) کا تعلق ہے تو دلکش رنگوں، خوبصورت نقوش اور شبیہوں کی بنا پر یہ مینیچر پینٹنگ جیسی دلکشی اختیار کر لیتا ہے۔ یہ خط مصری اساطیر کے ساتھ تقریباً تین ہزار برس قبل مسیح طلوع ہوا۔ اور فرعونوں کے عروج کے ساتھ ساتھ اس میں ارتقا ہوتا گیا حتیٰ کہ یہ سات سو تصاویر، شبیہوں اور نقوش پر مشتمل ہو گیا۔ مندروں، مقابر اور شاہی محلات پر لکھے جانے کے باعث اس کے حسن و زیبائش میں خوب اضافہ ہوا۔ رفتہ رفتہ ہیرو غلافی نے بھی ایک طرح سے دیوبانی کی صورت اختیار کر لی تو عام ضروریات کے لیے پاپیرس (جس کا معرب قرطاس ہے) پہ لکھے جانے والے رسم الخط نے ایک نیا روپ اختیار کر لیا جسے ہیراطیقی نام دیا گیا۔ مطلب اس کا بھی مقدس ہی ہے مگر یہ زیادہ

خوش نما اور دیدہ زیب نہ ہوتا تھا۔

مصری ہیرو غلافی کی خوبصورتی اور فنکارانہ نزاکتوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ابن حنیف کی کتاب "مصر کی قدیم مصوری" کا مطالعہ کریں تو ہیرو غلافی کی مصورانہ نزاکتوں کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ ابن حنیف نے بڑی تحقیق سے مصر کی قدیم ترین مصوری کا کھوج لگا کر ہزاروں برس قبل مسیح سے اس کی روایات کے سراغ مہیا کیے ہیں۔ مصر میں مصوری کے احیاء کا بڑا سبب شاہی مقابر کا مصور کیا جانا تھا۔ شاہی محلات اور امرا کے رہائش گاہوں میں بھی مصورانہ تزئین ہوتی تھی۔ مصر کی مصوری ایک تحقیقی موضوع ہے۔ اگر ہم اس موضوع پر اور کچھ بھی نہ پڑھیں اور صرف رعمسیس دوم (۱۲۹۰ تا ۱۲۲۴ ق م)[۹] کی ملکہ نفرتیتی کی تصویر یا اس کا مجسمہ دیکھ لیں تو مصریوں کی فنی مہارت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا کی چند اہم اور نادر تصاویر میں سے ایک ہے اور بلحاظ اہمیت مونا لیزا کے مساوی۔ جس ملک میں مصوری کی اتنی قدیم اور توانا تاریخ موجود ہو، وہاں ہیرو غلافی جیسا مصورانہ رسم الخط ہی جنم لے سکتا تھا، برعکس ہونا باعث تعجب ہوتا۔

تصویر کیسے حرف میں تبدیل ہوئی، یہ بے حد طویل داستان ہے جس کے دہرانے کا موقع نہیں تاہم مختصراً اتنا عرض کیا جاسکتا ہے کہ مصورانہ رسم الخط کے بعد جس رسم الخط کی بہت شہرت ہوئی اور جسے مصورانہ رسم الخط اور موجودہ تجریدی علامات کے درمیان اہم کڑی سمجھنا چاہیے، وہ ہے خط میخی یا پیکانی۔ اگرچہ ابتدا میں یہ بھی تصویری ہی تھا لیکن بڑھتی ہوئی عوامی ضروریات اور اختصار پسندی کے باعث مختصر ہو کر تجریدی علامات کی صورت اختیار کر گیا۔

ایشیا میں تہذیب و تمدن کا دجلہ و فرات کے دوآبہ (عراق) سے آغاز کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں اساطیر کی صورت میں مذاہب نے اولین صورت میں ظہور پایا۔ جہاں جلجامش کی داستان کی صورت میں دنیا کی پہلی رزمیہ ملتی ہے اور الواح پر مشتمل دنیا کا بہترین اور قدیم ترین کتب خانہ بھی "دجلہ و فرات کے قدیم باشندوں کا سب سے عظیم کارنامہ فن تحریر کی ایجاد ہے اور یہ سب کچھ آج سے کوئی تین چار ہزار برس قبل مسیح میں ہوا۔ ویسے اس وادی میں انسان کی آبادکاری کی عمر ماہرین نے ایک اور ڈیڑھ لاکھ برس کے درمیان بتائی ہے۔"[۱۰]

جہاں تک فن تحریر کی ایجاد و فروغ کا تعلق ہے تو سبط حسن کے بموجب "گو مصریوں

اور پھر فونیقیوں نے بھی یہ ہنر جلد ہی سیکھ لیا لیکن اولیت کا شرف بہر حال قدیم عراقیوں کو حاصل ہے۔۔۔ یہ انقلابی ایجاد اب سے ساڑھے پانچ ہزار برس پیشتر سمیر کے شہر اُرک کے معبد میں ہوئی۔ عریق اس وقت عراق کا سب سے خوشحال اور ترقی یافتہ شہر تھا" (ص ۴۳) "اس شہر کے کھنڈرات کی کھدائی سے بعض مہریں اور مٹی کی تختی برآمد ہوئی ہے جس پر تصویری حروف کندہ ہیں۔ اس تختی پر ایک بیل کا سر، ایک مرتبان کی شکل اور کئی قسم کی بھیڑیں بنی ہوئی تھیں اور دو مثلث بھی کھنچے تھے۔ یہ انسان کی سب سے پہلی تصویری تحریر تھی جو ۳۵۰۰ ق۔م کے قریب لکھی گئی۔ لوح پر کندہ کی ہوئی یہ تصویریں بظاہر سامنے کی چیز معلوم ہوتی ہیں اور ان کا مفہوم واضح ہے لیکن یہ علامتیں اور ان علامتوں میں حروف کا سا تجریدی عمل بھی شامل ہے" (ص ۴۵) اس ابتدائی رسم الخط میں تصاویر دو ہزار سے بھی زیادہ تھیں لیکن پھر ان میں بتدریج کمی ہوتی گئی اور ۳۰۰۰ ق۔م میں شہر ریک کی الواح میں یہ تعداد ۸۰۰ رہ گئی اور ایک صدی بعد مزید کم ہو کر صرف ۶۰۰ رہ گئی" (ص ۴۶)

ابن حنیف نے عراق میں رسم الخط کے ارتقاء کے بارے میں مزید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان کے بقول "عراقیوں کا رسم الخط میخی یا پیکانی تھا۔۔۔ اس رسم الخط کے میخ نما ہونے کے علماء نے ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ گیلی مٹی پر گول حروف یا علامتیں بنانا دشوار تھا۔ چنانچہ سمیریوں نے اپنی حرفی علامتیں گول کی بجائے میخ نما بنائیں۔ اس رسم الخط کے موجد سمیری ہی تھے۔ ساڑھے چار ہزار سال قبل جب سامی النسل بابلیوں نے سمیریوں کو زیر کیا تو انھوں نے اہل سمیر کے بہت سے تہذیبی گوشوں کے ساتھ ساتھ ان کا طرز تحریر اور حروف بھی اپنا لیے۔ ان حروف کی تعداد کوئی ساڑھے پانچ سو تھی لیکن استعمال عام طور پر تین سو ہی ہوتے تھے۔ گو سمیری تلفظ سامیوں کی زبان پر آسانی سے نہ چڑھتا تھا تاہم انھوں نے بڑی کامیابی سے سمیریوں کے حروف وغیرہ اپنی زبان میں شامل کر لیے"[۱۸]۔

چمڑیا کے ونیجے:

آج کاغذ کے دور میں ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ تحریر کو محفوظ کرنے کے لیے قدیم لوگوں کو کیا کیا جتن کرنا پڑتے تھے۔ عرب ہرن کے چمڑے پر لکھتے تھے۔ مصری پاپیرس کے گودے سے جو "صفحہ" بناتے تھے، وہ قرطاس کہلایا۔ جنوبی ہند میں تاڑ کے پتے

استعمال ہوتے تھے جبکہ شمالی ہندوستان میں توز کی چھال سے بھوج پتر بنتا تھا۔ اہل عراق اور بابلی چکنی مٹی کے الواح پر لکھتے تھے اور انہی پر خط میخی سے "تحریر" کیا جاتا۔ ان گیلی الواح کو سکھا کر پکا لیتے تھے بابل نینوا اور سمیری تہذیب کے بعض مراکز سے ایسی ہزاروں الواح برآمد ہوئی ہیں۔ اس عہد کا ایک بادشاہ اشور بنی پال مطالعے کا شوقین تھا اور اس کی لائبریری الواح کی صورت میں ہزاروں "کتابوں" پر مشتمل تھی۔ اسی کی لائبریری میں سے دنیا کی قدیم ترین داستان اور عالمی ادب کا اگر اولین نہیں تو کم از کم اہم ترین اور بے حد دلچسپ رزمیہ "گلگامش کی مہمات" کی صورت میں دستیاب ہوا جس کا اردو ترجمہ "گلگامش کی داستان" کے نام سے ابن حنیف نے (لاہور ۱۹۶۱ء) کیا انگریزی میں متعدد محققین نے اس کے متن کی درستی کی۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ اس داستان سے طوفان نوح کی بھی توثیق ہو جاتی ہے۔

کسی نے میخی خط کے بارے میں مزیدار بات کہی کہ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا گیلی مٹی پر چڑیا کے پنجوں کے نشانات بن گئے ہوں۔ بات کچھ ایسی ہی ہے لیکن اتنا ہے کہ یہ خط ہزاروں برس تک آج کے معلوم ایشیا کی مختلف اقوام اور تہذیبوں میں مروج رہا۔ آج خط میخی کی الواح کے مطالعے سے ان کی قدیم تہذیب، تاریخ، اساطیر اور عوامی زندگی کے بارے میں بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں تاہم ایک ایسا وقت بھی آیا کہ یہ خط زوال پذیر ہو کر معدوم ہو گیا۔ "میخی خط کے خاتمے کا سبب بابل اور اشوریہ کی سلطنتوں کا کمزور ہو جانا تھا۔ ۵۳۹ ق۔ م سیزس (Cyrus) کی فتح بابل کے بعد اس کا استعمال رفتہ رفتہ کم ہو گیا، دوسرا سبب فنیقی رسم الخط کی ایجاد و اشاعت تھی۔ بابلی اور آشوری رسم الخط میں سینکڑوں نشانات کام آتے ہیں جن میں بعض چودہ چودہ پندرہ پندرہ پیکانوں سے بنتے تھے۔ برخلاف اس کے، فنیقی رسم الخط میں کل بائیس حروف کام آتے تھے جن کا لکھنا بڑا ہی آسان تھا۔ بہر حال میخی رسم الخط سن عیسوی کی ابتدا تک رائج رہا۔ اس کا آخری کتبہ ایک تختی ہے جو غالباً ۸۳ء میں لکھی گئی تھی اور اب میونخ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔"[۲۶]

تصویری اور میخی رسم الخط دنیا کی قدیم ترین زبانوں اور تہذیبوں سے وابستہ رہا ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ اب تک قطعی طور پر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حضرت آدم کون سی زبان بولتے تھے (لفظ آدم سریانی زبان کا لفظ ہے) تاہم اب اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت نوح اور ان کے عہد کی زبان سامی تھی جو ان کے بیٹے سام کے نام پر تھی۔ سام کے بیٹوں میں اعیلام

اور اشور وغیرہ کے نام پر آرامی، عیلامی اور اشوری زبانیں بنیں۔ عرب، یمن اور عراق میں آرامی بولی جاتی تھی۔ جب بابل فتح کیا گیا تو وہاں کی زبانوں سمیری اور عقادی کے الفاظ اس میں شامل ہو گئے۔ آشور کی اولاد میں عابر تھا۔ اس کے نام پر عبری (عبرانی) بنی۔ یہ شام میں بولی جاتی تھی۔ شام کی اصل زبان سریانی تھی، توریت اسی میں لکھی گئی تھی۔ آج یہ تمام زبانیں مردہ ہیں البتہ اسرائیل میں عبرانی نے حیات نو پائی لیکن ان کے متعدد الفاظ ایک طرف مصر کی زبانوں میں شامل ہوئے تو دوسری طرف عربی اور فارسی کے ذریعے سے آج تک زندہ ہیں۔ تصویری یا معنی رسم الخط ان سب زبانوں میں کسی نہ کسی طور پر مشترک تھا اور قدیم تصویر کو جدید حرف کی صورت میں دینے میں کہیں نہ کہیں ان کا بھی، خواہ بے حد دور ہی کا سہی، تعلق ہے۔

"ابجد"

عربی حروف تہجی کے بارے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنے مقالے "اردو حروف تہجی" میں بیان کیا ہے۔ "کہ حروف تہجی کی ایجاد سامی خاندان کی ایک شاخ یعنی آرامی زبان میں ہوئی۔ عربی رسم الخط خط نبطی کے توسط سے آرامی خط سے معکوس ہے۔ آریائی خاندان کی اکثر زبانوں کے رسم الخطوں کی تشکیل آرامی خط کے زیر تحت ہوئی ہے۔" وہ مزید لکھتے ہیں "عربی حروف تہجی کا صوری انداز ترتیب کچھ ایسا عجیب و غریب یا ناقص نہیں ہے۔ یہ صوتیاتی انداز ترتیب کی مشکلات کے بعد وجود میں آیا تھا۔ ابتدا میں عربی حروف کی ترتیب آرامی ابجد یعنی ابجد، ہوز، حطی، کلمن سعفص، قرشت کے مطابق تھی۔ ان میں ثخذ اور ضظغ کا اضافہ کیا گیا۔ یہ ترتیب نہ صوری نہ صوتیاتی۔ خلیل بن احمد نے ان کو حلقی (صوتیاتی) انداز پر ترتیب دیا لیکن اس سے دشواریاں دور نہیں ہوئیں خصوصاً حروف کے یاد رکھنے میں آسانی نہیں ہوئی۔ بالآخر ابن مقلہ نے حروف تہجی کو صوری انداز سے ترتیب دیا اور یہ ترتیب جو ترتیب اثبت کہلاتی ہے، اس قدر مقبول ہوئی کہ ابجدی اور حلقی ترتیبیں ختم ہو گئیں (۱۲)"۔

جہاں تک عربی حروف تہجی کا تعلق ہے تو یہ عربوں کی ایجاد نہ تھے۔ جیسا کہ الفا (الف) اور بیٹا (ب) سے ظاہر کیا گیا یہ ہزاروں برس کا سفر طے کر کے عربوں تک پہنچے تھے۔ پہلے ۲۲ حروف قدیم ہیں۔ عربوں نے اپنی صوتی ضروریات کے مطابق مزید ۶ حروف یعنی ث۔ خ۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ غ کا اضافہ کیا۔ اور شاید اسی لیے انھیں آخر میں رکھا گیا تھا۔

انھیں حروف روادف بھی کہتے ہیں۔ بعد میں ان میں مزید اضافے بھی ہوئے اور مزید جدت یہ ہوئی کہ صوری ترتیب سے لکھے جانے لگے۔ اب یہ یوں لکھے جاتے ہیں۔ ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ل م ن و ہ ی[۱۳]۔

خطاطی:

قدیم ایران میں متعدد (بعض محققین کے بموجب سات) خط رائج تھے، ان میں سے بعض مخصوص مقاصد کے لیے استعمال ہوتے تھے جیسے فلسفہ، منطق، طب اور ان سے متعلق مباحث کے لیے اکنج اور راس سر استعمال ہوتے تھے۔

شاہ دبیریہ اور راس سہریہ امور مملکت کے لیے تھے اور یہ خفیہ نوعیت کے ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ دین دفتریہ، ریش دبیریہ، نامہ دبیریہ تین اور خطوط بھی مروج تھے۔ ویسے جہاں تک ایران میں رسم الخط کی قدامت کا تعلق ہے تو اس کے سراغ ۳۵۰ ق۔ م تک تلاش کیے جا چکے ہیں۔ یعنی وہ دور جب ان تمام علاقوں میں خط میخی تھا۔ جس نے ارتقا پذیر ہو کر پہلوی رسم الخط کی صورت اختیار کر لی جس کی دو قسمیں پہلوک اور پارسک بیان کی جاتی ہیں۔ زرتشت کے صحائف کے لیے مخصوص خط نے اوستائی کا نام پایا۔ یہ تمام خطوط ایران میں اسلام پھیلنے تک موجود رہے لیکن اسلامی اثرات کی بدولت تمام ایرانی خط ختم ہو گئے اور ان کی جگہ کوفی نے لے لی۔ قرآن مجید اور تمام عبادات کی زبان عربی تھی۔ لہذا اسلام کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور رسم الخط بھی پھیلنے لگے۔ اگرچہ عرب اپنے ساتھ اپنا خط کوفی لائے تھے لیکن عربی جلال اور عجمی جمال نے مل کر خطاطی کی صورت میں جمالیاتی اظہار کے متنوع امکانات دریافت کیے، یوں خطاطی مسلمانوں سے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ اسلامی تہذیب کی تاریخ میں بھی خطاطی نے جمالیاتی سطح پر اظہار کے جو بوقلموں اسالیب ایجاد کیے ان کی بنا پر خطاطی اور بعض مشہور اسالیب پر باقاعدہ تحقیقی کتابیں لکھی گئیں۔ خطاطی کے جتنے دبستان اور اہم اسالیب ہیں، ان کے موجد و استاد، تلامذہ، جدتوں اور اختراعات کا بالکل اسی طرح ذکر کیا جاتا ہے جیسا ہمارے ہاں شاعری کے اہم اساتذہ اور تلامذہ کا ذکر ہوتا ہے۔

اہم خطوط کا مختصر بلکہ مختصر ترین تذکرہ کیا جاتا ہے جس سے اور نہیں تو اجمالی طور پر ہی خطاطی کی متنوع جہات کا اندازہ ہو جائے گا۔

"نسخ":

محققین کا خیال ہے کہ خط کوفی کے پہلو بہ پہلو یہ خط مدینہ اور مکہ میں مستعمل تھا۔ اسی

کا ماخذ نبطی بتایا جاتا ہے۔ قرآن مجید اس خط میں بھی لکھا جاتا رہا ہے۔ بعض ماہرین کے نزدیک ابن فصلہ اس کا موجد تھا جیسا کہ مولانا امتیاز علی خان عرشی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مدرسہ کتابت کی افتتاحی تقریب میں نسخ کے بارے میں فرمایا "گیارھویں صدی کے شروع میں بغداد کے ایک وزیر ابن مقلہ کے ثلث کے دائروں میں کچھ گولائی بڑھانے اور کششوں میں غیر ضروری لمبائی کم کرنے سے نسخ پیدا ہوا[18]۔ ابو علی ابن مقلہ (متوفی ۳۲۸ھ) نے اگرچہ اسلامی خطاطی کے جمالیاتی امکانات دریافت کرنے میں اہم کردار ادا کیا مگر بعض اسے نسخ کا موجد تسلیم نہیں کرتے لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس نے جو دیگر اسالیب ایجاد کیے ان کی بنا پر وہ یقیناً خطاطی میں جینئس کا درجہ اختیار کر جاتا ہے۔ ابوالفضل اسے نسخ کا موجد تسلیم نہیں کرتا۔ وہ "آئین اکبری" میں لکھتا ہے کہ ابن مقلہ نے ۳۱۰ ہجری میں معقلی اور کوفی سے ثلث، توقیع، رقاع، نسخ، ریحان، محقق اور غبار ایجاد کیے۔ جہاں تک نسخ کا تعلق ہے تو اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ کچھ اور ماہرین اس کا موجد مستعصمی کو سمجھتے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے بموجب "یعقوب مستعصمی (متوفی ۶۹۶ھ) نے اس میں ایک خاص حسن بھر دیا ہے جس سے خط اسلامی یعنی طرز نسخ نے ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی[19]۔ بعض اسے خط یاقوت کا موجد بھی سمجھتے ہیں لیکن اس کی تردید بھی کی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ اطہر حسین جعفری نے اپنے مضمون "تین خطوں کے موجد ابن مقلہ" میں انہیں صرف محقق، ریحان اور نسخ کا موجد بتایا ہے۔

خط ریحان کا موجد ریحانی تھا۔ خط نسخ ابن مقلہ سے پہلے وجود میں آ چکا تھا، اس لیے وہ اس کے موجد نہیں ہو سکتے (غالباً انھوں نے اس خط کی اصلاح کی تھی اور خوش نویسی کے اصول مقرر کیے تھے) خط محقق کو بعض نے ابن بواب کی ایجاد بتایا ہے۔ خط توقیع کا موجد یوسف (شاگرد اسحاق بن حماد شامی تھا)۔ رہا خط ثلث، سو یہ خط ثلثین سے کسی قدر مختلف تھا اور ثلثین کا موجد، یوسف کا بھائی ابراہیم ال شیری اور شاگرد، اسحاق بن حماد شامی تھا[20]۔

تعلیق:

ڈاکٹر طارق عزیز نے مختلف حوالوں سے لکھا ہے کہ "حسن بن حسینی علی فارسی نے خط رقیع اور خط توقیع کی آمیزش سے ایک نیا خط تعلیق وضع کر لیا۔ حافظ یوسف سدید کا یاقوت مستعصمی (پورا نام یاقوت بن عبداللہ الدری المستعصمی) کو خط تعلیق کا موجد قرار دیا

ہے۔ محمد سجاد مرزا نے خط تعلیق کے اجرا کا زمانہ چوتھی صدی ہجری اور پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ایم۔ ایس ڈیسمنڈ کے حوالے سے تیرھویں صدی عیسوی قرار دیا ہے۔ محتاط تحقیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا اجراء پانچویں صدی ہجری میں ہوا(۱۸)۔

جامی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کاتبان را ہشت خط باشد بطرز مختلف
ثلث و ریحان و محقق نسخ و توقیع و رقع
بعد ازاں تعلیق آں خط است کش اہل عجم
از خط توقیع استنباط کردند اختراع

خط تعلیق شاہی رسل رسائل سرکاری کاروبار اور عام مراسلت میں استعمال ہوتا تھا۔ اس لیے اس کا دوسرا نام خط ترسل بھی مشہور ہو گیا۔ یہ خط پیچیدہ تھا۔ اس کے حرفوں کے پیچ و خم دیکھ کر قاآنی ایک موقعہ پر کہتا ہے:

اے زلف تو پیچیدہ تراز خط ترسل
بروائے زلفِ تو مرا است توسل

خواجہ ابوالمعالی بیک نے فارسی زبان کے مخصوص حروف پ چ ژ گ ایجاد کیے (پہلے گ پر بجائے دو لکیروں کے تین نقطے رکھے جاتے تھے) اور خط تعلیق میں اتنی اصلاح کی کہ لوگ انھی کو اس کا موجد سمجھنے لگے(۱۹)۔

یہ پہلا خط ہے جو کسی ایرانی نے ایجاد کیا تھا۔ جہاں تک خود لفظ تعلیق اور خط کی ایجاد کا تعلق ہے تو مولانا امتیاز علی عرشی کے بموجب تعلیق عربی میں لٹکانا کا مترادف ہے۔ کتابوں کے مشکل الفاظ یا مطالب کی تشریح یا توضیح کے سلسلے میں اہل علم برجستہ کچھ جملے کتاب کے حاشیوں پر یا بین السطور میں لکھ دیا کرتے تھے اور انھیں تعلیقات کہتے تھے۔ عموماً یہ نوٹ اپنے ذاتی استعمال کے لیے لکھے جاتے تھے۔ اس بنا پر سادہ خط بھی ہوتے تھے۔ خواجہ تاج الدین سلمانی نے اسی سادہ و رواں انداز تحریر کے اصول اور ضابطے بنائے اور اسے خط تعلیق کا نام دیا۔ یہ نام بعد میں مختصر ہو کر تعلیق رہ گیا۔ یہ خط بہت جلد مقبول ہو گیا۔ چنانچہ کئی برس تک نسخ کے پہلو بہ پہلو کام رہا(۲۰)۔

ابوالفضل نے تعلیق کو رقع و توقیع سے مستخرج بتاتے ہوئے لکھا ہے "کہ خواجہ سلمانی شش قلم نے اس خط میں کمال پیدا کیا۔ بعض افراد کی رائے ہے کہ یہی شخص خط تعلیق کا موجد ہے"[۳۱]۔

نستعلیق:

بقول ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی "مستند طور پر خط نستعلیق کا موجد میر علی تبریزی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ میر علی بغداد میں سلطان احمد جلائر (۷۸۳ - ۸۱۳ ہجری) کے دربار سے منسلک تھا"[۳۲]۔ اس خط نے نسخ اور تعلیق کے ملاپ سے جنم لیا۔ جیسا کہ میر علی تبریزی کے شاگرد سلطان علی مشہدی کے اس شعر سے بھی ثابت ہو جاتا ہے:

نسخ و تعلیق گر خفی و جلی ست
واضع الاصل خواجہ میر علی ست
وضع فرمود از زہین دقیق
از خط نسخ وز خط تعلیق[۳۳]

ابوالفضل نے آئین اکبری میں میر علی تبریزی کو اس کے موجد ہونے کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ روایت صحیح نہیں" کیونکہ اس سے پیشتر بھی اس خط میں چند رسالے دیکھے گئے ہیں"[۳۴]۔

ان تحقیقی بحثوں سے قطع نظر، خط نستعلیق کی صورت میں، اسلامی خطاطی نقطہ عروج تک پہنچ جاتی ہے۔ اب تک مختلف خطوط کی صورت میں گویا خطاطی سے وابستہ فنی اور جمالیاتی امکانات کی جستجو کی جا رہی ہے۔ اگرچہ خطاطی کے دیگر اسالیب بھی انفرادی حیثیت میں عصری تقاضے پورے کر دیتے تھے لیکن ان میں چیزے دیگر کی کمی کا احساس بھی تھا جسے نستعلیق نے پورا کر دیا۔ خط کوفی کی صورت میں عربی رسم الخط کے جس سفر کا آغاز ہوا، اس نے نستعلیق کی صورت میں مکمل جمالیاتی قدر کو پا لیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی خطاطی کے مزید اسالیب وضع ہوتے رہے مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ نستعلیق کی صورت میں علم خطاطی نے معراج حاصل کر لی۔ اس کا حسن قائم بالذات ہے۔ اس میں کشش کی نزاکت، دائروں کی لطافت اور نقطوں کی نفاست کا اپنا داخلی معیار جمال ہے جو کسی سے مستعار نہیں۔

خطاطی کے اسالیب:

مرتضیٰ قلی خاں شاملوں (حاکم ہرات) نے گیارہ سو ہجری میں خط شکستہ ایجاد کیا جو نستعلیق ہی کی مختصر صورت تھی، اسے زود نویسی کے تقاضوں کو مد نظر رکھ کر ایجاد کیا گیا تھا۔ یہ دفتری ضروریات کے لیے تھا اور صدیوں تک ہندوستان میں مستعمل رہا۔ ہمارے ہاں اب بھی جائداد اور زمین کی خرید و فروخت کی رجسٹریاں اسی میں لکھی جاتی ہیں۔

شکستہ آمیز (شفیعہ) مرتضیٰ قلی شاملوں کے میر منشی محمد شفیع نے ایجاد کیا۔ یہ گویا نستعلیق کی مختصر ترین صورت تھی(۲۵)۔

عام اور کاروباری ضروریات کے ساتھ ساتھ جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے کچھ ایسے خطوط بھی ایجاد کیے گئے جو عملی یا افادی ہونے کی بجائے تزئینی اور آرائشی تھے۔ ان میں سے بیشتر خطوط ایسے ہیں کہ ان کے نام سے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس نوعیت کے ہیں جیسے خط گلزار، خط ماہی، خط طاؤس، خط ہلال و بدر، خط گوہر، خط خشت، خط غبار، خط لرزہ، خط زلف عروس، خط منشور، خط توام، خط طغریٰ، خط سنبل، خط پیچاں، خط ناخن، خط معکوس۔ ان کے علاوہ خطوط کی مزید اقسام بھی ہیں جیسے خط بہار(۲۶) (یا بہاراں)۔ اس خط کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں "نستعلیق کے ساتھ اس کا یہ رشتہ زیادہ گہرا ہے کہ یہ اسی شاخ سے پھوٹا ہے اس کے بعد اس کا قریبی تعلق نسخ اور کوفی کے ساتھ ہے بلکہ اپنے ارتقا کی آخری منازل میں تو یہ خط کوفی کی طرف زیادہ ہی مائل ہو گیا تھا جس کی بنا پر بعض محققین اسے کوفی اور نسخ کی درمیانی کڑی قرار دیتے ہیں۔"

خط بابری۔ یہ خط مغل سلطنت کے بانی بابر کے نام سے منسوب ہے بلکہ بعض محققین تو بابر ہی کو اس خط کا موجد گردانتے ہیں جو خود اعلیٰ درجہ کا خوش نویس بھی تھا مگر اس نے اپنی تزک میں ایسا دعویٰ نہیں کیا۔

اہل لکھنؤ نے جہاں تہذیب و تمدن کے دیگر شعبوں میں جدت پسندی سے اختراعات کیں وہاں انھوں نے خطاطی میں بھی ایجادات کیں۔ چنانچہ مرزا جعفر حسین کی تالیف "لکھنؤ کی ایجادات و اختراعات" سے معلوم ہوتا ہے کہ خط معکوس اہل لکھنؤ نے ہی ایجاد کیا تھا۔ چاول یا چنے کی دال پر قل ہو اللہ تحریر کرنا، ناخن سے قلمکاری یا شبیہ سازی بھی ان کی اختراعات میں سے ہیں۔

اردو رسم الخط کا مسئلہ:

تو یہ ہے وہ تناظر جس میں اردو رسم الخط نے نشوونما پائی۔ مسلم حکمرانوں اور
بادشاہوں میں اکبر سے لے کر شاہجہاں تک مسلم خطاطی کی خوب سرپرستی ہوئی جس
تفصیلات معاصر تواریخ میں محفوظ ہیں۔ مسلم حکومت ہونے کی بنا پر یہاں خود بخود اسلامی خط
مروج ہو گئی۔

رسم الخط کے بارے میں لکھنے والے ماہرین نے اردو رسم الخط پر جو اعتراضات کیے
ہیں، ان میں غالباً قدیم اور بنیادی اعتراض ہے کہ ایک آواز کسی ادائیگی کے لیے دو
حروف ہیں جیسے الف۔ ع - ہ - ح - ت - ط - ث۔ س۔ ص۔ ذ ز ض ظ وغیرہ لیکن اس
اعتراض کا غالباً جواب بھی اتنا ہی قدیم ہے۔ کہ یہ سب حروف قرآن مجید اور عربی الفاظ و
اصطلاحات کی درست تحریر اور صحیح املا کے لیے ہیں۔ اسے یوں بھی سمجھیے کہ اگر حیدر آباد
دکن کے لوگ ق کو خ بولتے ہیں اور لاہوری ر کو ڑ تو ان کی سہولت کے لیے نہ تو ق ابجد سے
خارج کیا جا سکتا ہے اور نہ ر کو ڑ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال رسم الخط اور اس کے
حوالے سے املا کی بحث بہت پرانی ہے۔

حواشی

۱۔ Himilton, Edith, Mythology, P 308-309

۲۔ مصنف کی کتاب کا ایک حصہ بعنوان: "رسم خط یا لپی کا ماضی"، ہمایوں دہلی سالنامہ جنوری ۱۹۶۹ء میں شائع کیا گیا۔ یہ اقتباس اسی سے ماخوذ ہے۔

۳۔ ابوریحان البیرونی "کتاب الہند" ص-۱۲۸ (نوٹ: اب سنسکرت میں ۴۸ حروف ہیں۔)

۴۔ ابوریحان البیرونی "کتاب الہند" ص ۱۸۳۔

۵۔ نہ سپہر ترجمہ محمد رفیق مایہ: ص ۱۸۵

۶۔ اورینٹل کالج میگزین، مارچ جون ۱۹۷۳ء

۷۔ "آئین اکبری" جلد اول ص: ۱۸۶-۱۸۷

۸۔ پروفیسر سید محمد سلیم، "اردو رسم الخط" ص: ۱۳۱

۹۔ حضرت موسیٰ نے اسی عہد میں جنم لیا تھا اور اسی کے محل میں پرورش پائی۔

۱۰۔ سید سبط حسن "ماضی کے مزار" طبع دوم ص ۱۳۱

۱۱۔ "بھاشا کی داستان" ص ۱۳

۱۲۔ محمد اسحاق صدیقی، "فن تحریر کی تاریخ" ص: ۸۰۱

۱۳۔ مجلہ مطبوعہ "خامہ" بمبئی شمارہ ۳، ۴-۱۹۸۶ء۔

۱۴۔ "خط" کے بارے میں ڈاکٹر سہیل بخاری کا دلچسپ مقالہ "حمزہ" ملاحظہ ہو مطبوعہ "اوراق" لاہور۔ ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء۔

۱۵۔ "نسخ، تعلیق، نستعلیق" مطبوعہ اخبار اردو اسلام آباد جنوری ۱۹۸۵ء۔

۱۶۔ پاک و ہند میں خط نستعلیق، مطبوعہ مجلہ اقبال لاہور، اکتوبر ۱۹۷۳ء

۱۷۔ فن تحریر کی مختصر تاریخ ۲۱۸-۲۱۹

۱۸۔ "اردو رسم الخط اور ٹائپ" ص-۱۸۰

۱۹۔ "فن تحریر کی تاریخ" ص: ۲۲۰

۲۰۔ "نسخ، تعلیق، نستعلیق" مطبوعہ اخبار اردو جنوری ۱۹۸۵ء، اسلام آباد۔

۲۱۔ "آئین اکبری" ص: ۱۸۸

۲۲۔ "پاک و ہند میں خط نستعلیق" مجلہ اقبال، اکتوبر ۱۹۷۳ء۔

۲۳۔ "فن تحریر کی تاریخ"، ص ۲۲۱

۲۴۔ "آئین اکبری" ص: ۱۸۹

۲۵۔ "فن تحریر کی تاریخ" ص: ۲۲۱

۲۶۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر وحید قریشی کا مقالہ "خط بہار" مجلہ تحقیق شمارہ نمبر ۱-۲

چھٹا باب

اردو میں لغت نویسی

"لغت (ع) اسم مذکر (۱) کسی قوم کی زبانی بولی، بھاشا وہ اصوات یا کلمات جن کے وسیلے سے آدمی اپنے مطالب و اغراض بیان کرے۔ (۲) وہ الفاظ جن کے معنی مشہور نہ ہوں (۳) لفظ، شبد، کلمہ مفرد، ورڈ (۴) ڈکشنری[۱]۔ کوش۔ کتاب۔ لغت۔ فرہنگ"[۲]

"فرہنگ (ف) اسم مونث (۱) دانش۔ دانائی۔ سمجھ، عقل، ادب فہم فراست، قیاست (۲) کتاب لغات فارسی"[۳]

لغت کیوں؟

لغت کے نام ہی میں اس کا استعمال، ضرورت اور افادیت پوشیدہ ہے۔ یہ جاننا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ لغت کا آغاز کیوں ہوا۔ اگرچہ اس پر خاصی خامہ فرسائی ہوئی ہے تاہم سیدھی سی بھی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس کی ابتدا کا تدریس سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوگا۔ دوران تدریس، معلم متعدد ایسے الفاظ استعمال کرجاتا ہے جن کے معنی سے طلبا ناآشنا ہوتے ہیں یا پھر سبق میں بھی ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جن کے معنی سے طلبا ناواقف ہوتے ہیں۔ ذہین طالب علم سبق کی بہتر تفہیم، یادداشت اور مستقبل کی ضرورت کے تحت ان مشکل الفاظ کے معانی قلم بند کرتا جاتا ہوگا۔ کسی طالب علم نے انھیں بلاترتیب ایام تدریس کے مطابق لکھا ہوگا۔ کسی نے کتب کے موضوعات اور مسائل کے مطابق اور کسی نے سب الفاظ کو حروف تہجی کے مطابق ترتیب دے دیا ہوگا۔ یہ طالب علمانہ سعی، لغت کی ابتدائی صورت ہو سکتی ہے، ہر چند کہ یہ خاصی خام اور نامکمل بھی ہوتی ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود معلم طلبا کی تدریسی ضروریات کے مطابق مشکل الفاظ اور ان کے معنی کی فہرست مرتب کرا دیتا ہو۔ الغرض یہی دو محرک نظر آتے ہیں جن کے نتیجے میں فہرست الفاظ نے ایسی کتاب کی صورت اختیار کی ہوگی جسے لغت، فرہنگ، ڈکشنری کوش[۱۵] وغیرہ کا نام دیا گیا۔

بعض اوقات اس صورت میں بھی فہرست الفاظ ترتیب پا جاتی ہے جب کوئی ادیب، دانشور، لسانی محقق یا نقاد کسی دوسری قوم کی زبان یا تو سیکھ رہا ہو یا اس کے ادب اور تاریخ

وغیرہ پر تحقیقات کر رہا ہو۔ اس صورت میں وہ اپنی یادداشت کے لیے الفاظ، ان کے معانی اور مترادفات لکھتا جاتا ہے جو بالآخر لغت کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ یورپین حضرات نے جو اردو کی ابتدائی لغات مرتب کیے تو اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے خود انھوں نے زبان سیکھنے کے لیے الفاظ جمع کیے۔ اسی انداز پر ڈاکٹر جمیل جالبی کی "قدیم اردو کی لغت" کو ان کی "تاریخ ادب اردو" کی ضمنی پیداوار قرار دیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس کے پیش لفظ میں خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے(۱۵)۔

"اس لغت کی داستان یہ ہے کہ تاریخ ادب اردو پر کام کرتے ہوئے مجھے سیکڑوں مخطوطات اور بیاضوں کے صحراؤں سے گزرنا پڑا۔ دوران مطالعہ اکثر ایسے لفظوں سے واسطہ پڑا جو میرے لیے اجنبی تھے۔ میں ان لفظوں کو ایک کاپی میں لکھ لیتا اور پھر سیاق و سباق کے حوالے، مختلف لغات کی مدد اور اہل علم سے گفتگو کرنے کے بعد جب ان لفظوں کے معنی متعین ہو جاتے تو ان کو سامنے لکھ دیتے(۱۶)۔"

یہ کام دس برس (۱۹۶۱-۱۹۷۱) میں مکمل ہوا اور لغت تقریباً گیارہ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کتاب کے آخر میں مؤلف یا مرتب مشکل الفاظ کے معانی درج کر دیتا ہے جیسے ڈنکن فاربس نے لندن سے "باغ و بہار" کا جو مستند ایڈیشن (۱۸۷۳ء) شائع کرایا، اس کے آخر میں انگریزی قارئین کی سہولت کی خاطر اردو الفاظ کے معانی انگریزی میں درج کیے جو ۱۲۳ صفحات پر پھیلے ہیں۔ اس انداز کی فہرست الفاظ عمومی ہونے کے باوجود، اساسی طور پر یک موضوعی ہوتی ہے۔

عام تصور کے برعکس لغت الفاظ کا سٹور ہاؤس نہیں، نہ لفظوں کی کالونی اور نہ ہی یہ الفاظ کی لشکرگاہ بلکہ یہ تو زبان کی ترقی اور نشوونما کے مختلف مراحل منعکس کرنے والا آئینہ ہے جس طرح شہر کے لوگ کسی ملک کی تہذیب و تمدن کے مظہر ہوتے ہیں، بلحاظ زبان لغت بھی ایسی ہی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ جن لغات میں الفاظ کے اشتقاق اور مختلف ادوار میں الفاظ کے معنی، تغیرات کو اشعار یا تقلیبات کی مثالوں سے اجاگر کیا جاتا ہے، ایسے لغات بلاشبہ زبان کے تخلیقی سفر کی روداد میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ماخذ اور اشتقاقات کی بنا پر اس امر کا تعین بھی ہو سکتا ہے کہ زبان میں کتنے ملکی الفاظ ہیں اور کتنے غیر ملکی، دخیل، غریب اور یتیم۔ یوں دیکھیں تو لغت الفاظ کی تعریف اور ان کی حیات کے بارے

میں اساسی نوعیت کی معلومات بہم پہنچانے کی بنا پر لسانی اہمیت بھی اختیار کر جاتا ہے۔ فکر و فلسفہ شعور و تخیل کی اساس الفاظ پر استوار ہوتی ہے۔ لہذا لغت کسی قوم کی لسانی کے ساتھ ساتھ تہذیبی ترقی کا بھی مظہر ثابت ہوتا ہے۔ لغت کو محض لفظ شماری نہ سمجھا جائے کہ تعداد الفاظ وسعت زبان کی غماز ہوتی ہے۔

اردو لغت نویسی کا آغاز:

لغت اور زبان ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ زبان ہو اس کے مخصوص الفاظ یا اصطلاحات ہوں، ذخیرہ الفاظ ہو مگر ان سب کو یکجا کرنے والا لغت نہ ہو۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ جب زبان (اپنے زمانے کے حالات کے مطابق) ترقی یافتہ ہو، وہ تعلیم و تدریس اور کاروباری مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی ہو اور اس میں کوئی لغت نہ ہو۔ قدیم، متروک اور مردہ زبانوں میں بھی لغات ہوں گے، یہ الگ بات ہے کہ امتدادِ زمانہ سے وہ ناپید ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جن زبانوں میں اب قدیم لغات دستیاب ہیں، ان میں بھی بعض لوقات قدیم ترین لغات ناپید ہیں جیسے یونانی زبان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ زینو ڈوٹس کے معلوم لغت گلوسو (Glasso) (انگریزی لفظ Glossary اسی سے ماخوذ ہے) سے قبل ۳۵ لغات لکھے جا چکے تھے جو اب ناپید ہیں۔ زینو بطلیموس اول اور دوم کے زمانوں میں سکندریہ کے کتب خانے کا مہتمم تھا[۷]۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کے بموجب "سنسکرت لغات میں امر کوش کا نام سے پہلے آتا ہے۔ اسے لکھنے والا امر سنگھ ایک ہزار عیسوی سے پہلے گزرا ہے۔ یہ متعدد مرتبہ کلکتہ (۱۸۰۷۔ ۱۸۳۴ء) بمبئی (۱۸۶۰ء)، لکھنو (۱۸۶۳ء) مدراس (۱۸۷۰ء) سے طبع کیا گیا۔ امر ویدک کے نام سے مہیشور نے اس کی شرح (بنارس ۱۸۶۷ء) لکھی[۸]۔

عربی لغات میں خلیل ابن احمد، متوفی ۱۶۰ ہجری کی کتاب العین اولیت کی حامل ہے۔ یہ اس نے ۷۰ برس کی عمر میں لکھی۔

جہاں تک ایران میں لغت نویسی کے آغاز کا تعلق ہے تو آقائے محمد علی داعی الاسلام کی تالیف "فارسی لغت نویسی کی تاریخ[۹]" میں یہ معلومات ملتی ہیں کہ "پہلی صدی ہجری میں عربی اور پہلوی کی آمیزش سے فارسی نے جنم لیا۔ دوسری صدی ہجری فارسی شاعری کا آغاز ہوا اور تیسری صدی ہجری میں سب سے پہلے اہل توران نے شعرا کے مخصوص لفظوں کی فرہنگ

کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ سب سے پہلے ابو حفص سعدی نے ایک لغت ترتیب د
اس لغت کا کوئی نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں۔ مؤلف جہانگیری نے ا
اپنا ماخذ قرار دیا ہے اور محمد قاسم سروری کاشانی نے بھی اسے اپنے سواد تالیف میں شمار
ہے۔ خراسان میں بھی تیسری صدی ہجری میں فرہنگ کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ رود
(المتوفی ۳۲۹ ہجری) نے تاج المصادر کے نام سے ایک فرہنگ لکھی مگر اب رودکی کی شاعر
کی طرح اس کا بھی کوئی نسخہ موجود نہیں ہے ... تاج المصادر کے بعد تیسری فرہنگ شعر
ابوالحسن علی ابن احمد الاسدی الطوسی کی تالیف "لغت فرس" ہے۔ (۴۶۳ ہجری) ...
لغت کئی اعتبار سے بہت اہم ہے اول یہ کہ معلوم تاریخ کے بعد فارسی کی سب سے
شعری لغت ہے دوسرے یہ کہ بعد کے لغت نویسوں کا ماخذ رہی ہے۔ سوئم یہ کہ اساتذہ
کے بہت سے اشعار بھی ہیں جو کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں۔ قدیم شعرا اور اساتذہ کا تذکر
ہے۔ اس میں تقریباً ۷۶ ایسے شعرا اساتذہ کا تذکرہ ہے جو اور کہیں نظر نہیں آتا۔ چہارم یہ کہ
کلیلہ دمنہ اور رودکی کے گم شدہ سند باد کے اشعار بھی ہیں۔ اسی طرح عنصری کی وامق و عذ
کے اشعار بھی ہیں جو کسی جگہ موجود نہیں"۔ صاحب مقالہ نے متعدد قدیم فرہنگوں کا تعارف
کروایا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے محولہ بالا مقالہ میں لکھا ہے "فارسی لغت کی کتابوں میں
سب سے پہلا نمبر برہان قاطع کا آتا ہے" مگر یہ درست نہیں جیسا کہ آغا نے محمد علی کے مقالہ
سے واضح ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں قدیم لغات:

جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو ان کی زبانوں عربی، فارسی، ترکی وغیرہ
کے الفاظ اور مقامی زبانوں اور بولیوں کے الفاظ کے امتزاج سے اس لسانی عمل کا آغاز ہو گیا
جو بالآخر اردو کی صورت میں پایہ تکمیل تک پہنچا۔ ظاہر ہے اردو کے تشکیلی دور میں لغت کی
ضرورت محسوس نہ ہوئی ہو گی۔ حکمران اور خواندہ حضرات کی زبان فارسی تھی، اس لیے
ہندوستان میں اگر اردو کے مقابلے میں فارسی کے لغات پہلے مدون ہوئے تو ان کی وجہ ظاہر
ہے۔ پاک و ہند کی سرزمین پر سب سے پہلی فارسی فرہنگ علاؤ الدین محمد خلجی کے عہد میں
(۱۲۹۵ - ۱۳۱۵ء) کے مابین تالیف ہوئی۔ یہ فرہنگ خلجی دربار کے امیر مولانا محمد فخرالدین
مبارک شاہ غزنوی المعروف بہ قواس نے تالیف کی جو "فرہنگ قواس" کے نام سے مشہور
ہے[10]۔

سب سے پہلا اردو لغت:

امیر خسرو (۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ء) ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ لسانیات، شاعری، تصوف اور موسیقی کا تذکرہ ہو اور ان کا ذکر نہ ہو۔ امیر خسرو کی متعدد موضوعات پر تصانیف میں "خالق باری" بھی شامل ہے۔ یہ منظوم لغت ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں اسے امیر خسرو کی تالیف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا[۱]۔ دوسری طرف سید مسعود حسن رضوی ادیب کے بموجب "حضرت امیر خسرو کو جس طرح اور بہت سی چیزوں میں اولیت کا شرف حاصل ہے اسی طرح اردو کا سب سے پہلا لغت لکھنے کا فخر بھی انھیں کے لیے ہے۔ اب تک اردو کا کوئی ایسا لغت دستیاب نہیں ہوا جو خالق باری سے زیادہ قدیم ٹھہرتا[۲]"۔

بعض حضرات اس شعر کی وجہ سے اسے امیر خسرو ہی کی تصنیف تسلیم کرتے ہیں۔

مولوی صاحب سرن پناہ

گدا بھکاری خسرو شاہ

اس لغت میں عربی، فارسی اور ہندوی الفاظ اور ان کے معانی درج ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب کے بقول "خالق باری" سے پہلے اس انداز کی ایک کتاب نصاب الصبیان از ابو نصر محمد بدرالدین فراہی ملتی ہے اور خسرو نے بھی وہی انداز اپنایا ہے، جہاں تک اس کے نام کا تعلق ہے، تو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اصلی نام کیا تھا لیکن مسعود حسن رضوی ادیب کے بقول کریمہ (سعدی) اور مقیماں (شیخ علاؤالدین خراسانی) کی مانند اس کے پہلے دو الفاظ نام قرار پا گئے۔ ۱۹۲ اشعار پر مشتمل خالق باری کا آغاز یوں ہوتا ہے:

خالق باری سرجن ہار

واحد ایک بدا کرتار

رسول پیغمبر جان بسیٹھ

یار دوست بولی جا ایٹھ

اسم اللہ خدا کا ناؤں

گرما دھوپ سایہ چھاؤں[۳]

منظوم لغات:

خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہو یا نہ ہو، اس امر کا تصفیہ محققین کا کام ہے لیکن اتنا یقینی ہے کہ یہ نہ صرف مقبول ہوئی بلکہ رجحان ساز بھی ثابت ہوئی جس کا ثبوت اس کے تتبع میں لکھے گئے متعدد منظوم لغات ہیں۔ مسعود حسین رضوی ادیب محولہ بالا مقالہ سے چند لغات کے نام درج کیے جاتے ہیں:-

قصیدہ در لغات ہندی، از حکیم یوسفی ۴۴ اشعار پر مشتمل ہے۔
اللہ خدائی، از تجلی ۱۰۶۵ھ تقریباً ۲۵۰ اشعار
اسمائے فارسی، از منشی نوبندہ رائے تقریباً ۲۰۰ اشعار
لغات سعدی مصنف نامعلوم سنہ نامعلوم تقریباً ۲۵۰ اشعار
نصاب عجائب از سید فرزند علی شوق بریلوی ۱۳۰۳ھ ۱۲۵ اشعار
فیض شاہ جہانی از مولوی غلام احمد فرخی، ۱۳۱۰ھ، ۴۲۰ اشعار
انوار اللغات از حافظ انوار اللہ بے خود ۱۳۱۲ھ
بحر الفضائل فی منافع الافاضل (دو جلدیں) از محمد بن قوام کرخی ۷۹۵ھ۔

یہ منظوم لغات اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ شاید ہی اور کسی (بالخصوص یورپین) زبان میں اس انداز کا کام ہوا ہو۔ ان کے مصنفین کے مقاصد لسانی کے برعکس تدریسی تھے اور طلبہ کی نصابی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھے جاتے تھے، کسی خاص نصاب یا سبق کے مشکل الفاظ یا معنی بتانا نہیں بلکہ عمومی طور پر ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ مقصود تھا اور یقیناً اس مقصد میں یہ منظوم لغات کامیاب رہے ہوں گے۔ نثر کے مقابلے میں شعر دلچسپ اور بامزہ ہوتا ہے۔ مختلف الفاظ کے انفرادی طور پر معنی یاد رکھنے کے مقابلے میں شعر کی صورت میں معنی یاد کرنا آسان بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ ان لغات میں اشعار کی تعداد زیادہ نہ ہوتی تھی زیادہ سے زیادہ دو اڑھائی سو اشعار کی مدد سے طلبہ کو کار آمد الفاظ پر مشتمل ذخیرہ الفاظ مہیا کر دیا جاتا تھا۔ اگر فی شعر چار الفاظ فرض کیے جائیں تو اڑھائی سو الفاظ کی لغت ایک ہزار الفاظ سکھا دیتی تھی۔

ملک میں فارسی کا چلن تھا، اس لیے جب اردو زبان اتنی بالغ ہو گئی کہ لغت مدون ہو سکے تو ابتدائی لغت بھی اردو شعرا کے قدیم تذکروں کی مانند ہوتے تھے یعنی اردو الفاظ کے معنی فارسی میں درج کیے جاتے تھے۔ جہاں تک اس ضمن میں اولیت کا تعلق ہے تو بقول

ڈاکٹر سید عبداللہ "اردو میں فرہنگ نویسی کا باقاعدہ آغاز عہد عالمگیری میں ہوتا ہے چنانچہ اردو کا قدیم ترین لغت " غرائب اللغات " اسی زمانے میں لکھا جاتا ہے۔" اس کے مولف میر عبدالواسع معصر یا نوی ہیں مگر ان کے حالات کے بارے میں کوائف ناپید ہیں۔ جہاں تک اس لغت کی علمی حیثیت کا تعلق ہے تو بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "غرائب کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے مگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ میر عبدالواسع کو لغت نگاری کے تقاضوں سے پوری پوری واقفیت نہ تھی۔ اس لغت میں لفظوں کی ترتیب بے حد ڈھیلی ہے اور بہت سے موقعوں پر پہلے حروف کی رعایت سے قطع نظر لفظ کے باقی حروف کے معاملے میں بھی صحیح ترتیب کو مد نظر نہیں رکھا" (ص ۵)۔۔۔ غرائب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اردو الفاظ ہریانی تلفظ اور لہجہ کے تابع ہیں (ص:۹۰)۔۔۔ اسی طرح بعض لفظوں کا تلفظ پنجابی زبان کے تابع ہے (ص:۱۰۰)

آرزو کی "نوادر الالفاظ"

سراج الدین علی خان آرزو کو آج کی اصطلاح میں انسائیکلوپیڈیائی ذہن کی حامل شخصیت قرار دیا جاسکتا ہے۔ شاعری ان معنی میں ان کے لیے وجہ شہرت نہیں بنتی کہ وہ لسانیات اور تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ لغت بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ علم لغت میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ فارسی میں کئی دواوین اور متعدد مثنویوں کے خالق ہیں۔ نثر میں بھی ان کے کارنامے وقیع ہیں۔ جب ان کی لغت نویسی کا جائزہ لیں تو اگرچہ ان کی شہرت "نوادر الالفاظ" (۱۱۶۵ھ) کی بنا پر ہے لیکن وہ اس کے علاوہ قدیم شعراء کے کلام میں ملنے والی مخصوص اصطلاحات اور چالیس ہزار الفاظ پر مشتمل "سراج اللغات" کے بھی مولف ہیں جس میں "کاظم" کی اغلاط کے نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل چراغ ہدایت ہے اور پھر "المزہر" ہے جس میں لغت نویسی کے اصولوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

لغت کے ضمن میں "نوادر الالفاظ" ان کا اہم ترین کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ خان آرزو نے جب میر عبدالواسع ہانسوی کی اردو فارسی "غرائب اللغات" کا مطالعہ کیا تو انھیں اس میں کافی سے زیادہ اغلاط نظر آئیں، انھوں نے نہ صرف اغلاط کی تصحیح کی بلکہ اس وقت تک اردو

میں مستعمل عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور دکھنی کے الفاظ بھی شامل کر کے ان کے معنی کا تقابلی مطالعہ بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی زبان اس کی تبدیلیوں اور الفاظ و محاورات کی مختلف اور بدلتی صورتوں کا جائزہ لینے کے لیے یہ لغت حوالے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ خان آرزو نے جس انداز میں مختلف زبانوں کے الفاظ کا تقابل کیا، یہ مروج لسانی اصولوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ انھوں نے تلفظ اور املا کے بارے میں وقت نظری کا ثبوت دیتے ہوئے عوامی استعمال کی بجائے اہل زبان کے تلفظ اور املا کو بنیاد بنایا الغرض انھوں نے اس عہد میں اردو کا ایسا مستند لغت لکھا جس کی لسانی اہمیت میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا گیا "نوادر الالفاظ" کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے مرتب کر کے مقدمہ اور حواشی قلم بند کیے (مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۱ء)۔

اس لغت کا تجزیاتی مطالعہ کر کے لفظ شماری سے اس امر کا تعین کیا جا سکتا ہے کہ بارھویں صدی ہجری میں اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ کی تعداد کتنی تھی۔ ذیل میں مختلف حروف سے بننے والے الفاظ کی تعداد درج ہے۔

باب الالف: ۱۲۸۔ باب الباب العربیۃ (ب): ۱۵۹، باب الباء الفارسیہ (پ) ۱۴۲، باب التاء الفوقانیہ (ت): ۲۳، باب التاء الہندیہ (ٹ): خان آرزو کا نوٹ: "چوایں حرف کہ مخصوص ہندوستان است مقرر است و دیگر حروف ہندیہ مخلوط تلفظ ہا برائے ایں باب علیحدہ مقرر کردہ شد" ص ۱۳۱-۲۹، باب الجیم العربیہ (ج): ۲۶، باب الجم الفارسیہ (چ): ۱۴۳، باب الخاء معجمہ (خ): ۱۱، باب الدال (د): ۲۳، باب الدال الہندیہ (ڈ) ۳۰، باب الراء المہملہ (ر) ۵۳، باب الزاء المہملہ (ز): ۲، باب السین المہملہ (س): ۱۱۱، باب الشین المہملہ (ش): ۱۳، باب الغین المعجمہ (غ): ۵ باب الفاء (ف): (ڈاکٹر سید عبداللہ کا نوٹ: غرائب اللغات میں ف اور ق کی رو بقیں موجود نہیں ص ۳۰۷): ۳، باب القاف (ق) (ڈاکٹر سید عبداللہ کا نوٹ غرائب اللغات یہ فصل موجود نہیں ص ۳۰۹): ۱، باب الکاف العربیہ (ک) ۲۰۰، باب الکاف الفارسیہ (گ): ۱۰۷، باب اللام (ل): ۵۲، باب المیم (م): ۱۱۱، باب النون (ن) ۵۲، باب الواو (و): ۱، باب الہاو (ہ) ۳۵، میزان: ۱۶۰۰۔

غالب بطور لغت نویس:

غالب کے خطوط کے مطالعہ سے جہاں اس کی شخصیت کی کئی پرتیں کھلتی ہیں اور نفسیاتی اہمیت کا سواد حاصل ہوتا ہے، وہاں تاریخی کوائف اور سماجی نوعیت کی معلومات بھی ملتی ہیں۔ اسی طرح اشعار کی اصلاح اور تشریح کے ضمن میں غالب نے الفاظ کی جو بحث کی، وہ اس کے تنقیدی شعور کی مظہر ہے۔ ادھر فارسی پر غالب کو جو عبور حاصل تھا، اس نے اس کے لسانی شعور کو صیقل کیا۔ واضح رہے کہ خسرو اور بیدل کے علاوہ غالب کسی کا قائل نہ تھا اور خود کو صائب اور انوری کا ہم پلہ سمجھتا تھا، اس حد تک کہ فارسی کے مقابلے میں اُردو کلام کو بھی "بے رنگ" سمجھتا تھا۔

مولانا الطاف حسین حالی نے "یادگارِ غالب" میں لکھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں غالب جب گھر میں بیٹھنے پر مجبور ہو گیا تو ان ایام میں "برہان قاطع" کا مطالعہ شروع کیا (وقت گزاری کے لیے لغت کا مطالعہ بذات خود معنی خیز ہے) تو اسے اغلاط سے بھرپور پایا۔ جہاں تک "برہان قاطع" کے مؤلف کا نام محمد حسین برہان ہے، یہ خلف تبریزی کا بیٹا تھا۔ اسی لیے بعض اوقات اس کا نام محمد حسین تبریزی لکھ دیا جاتا ہے۔ تخلص کی رعائت سے اس نے لغت کا نام "برہان قاطع" رکھا۔

مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں لکھی گئی، اس کے علاوہ حالات کے ضمن میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ بقول آقائے محمد علی "اس زمانے میں گولکنڈہ کے مسلمانوں کی بول چال کی زبان تحریف شدہ فارسی تھی۔ اس میں دکن کی ہندی کے الفاظ شامل ہو گئے تھے۔ گولکنڈہ تلنگا کے صوبے میں واقع ہے اور اس کی اصل زبان مسلمانوں کی آمد سے پہلے تلنگی تھی۔ محمد حسین برہان نے گولکنڈہ کے تلنگی فارسی کے الفاظ کو بھی ادبی فارسی کے طور پر ضبط تحریر کر لیا"۔ مرزا غالب نے جب اس کا مطالعہ کیا تو غالباً اسی وجہ سے انھیں اتنی ذہنی کوفت ہوئی کہ اس کا جواب لکھنے کی ٹھان لی۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں قاطع کو ایک طرح سے نصابی حیثیت بھی حاصل تھی اور بوقت ضرورت سب اس سے رجوع کرتے تھے۔ غالب نے اغلاط کی تصحیح کا کام شروع کر دیا اور جب ۹۸ صفحات پر مشتمل "قاطع برہان" (لکھنؤ نول کشور، ۱۸۶۲ء) کے نام سے طبع ہوئی تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو

گیا۔ لوگ یہ باور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ برہان قاطع بھی غلط ہو سکتی ہے حالانکہ خان آرزو اس سے پہلے اس کی اغلاط کی نشاندہی کر چکے تھے مگر یا تو "نوادر الفاظ" عام لوگوں کی پہنچ سے باہر تھی ورنہ یہ پھر غالب کی نزاعی شخصیت کا اثر تھا کہ قاطع برہان" کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا "قاطع القاطع" (مولوی امین الدین پٹیالوی) "محرک قاطع" (مولوی علی) "ساطع برہان" (مرزا رحیم بیگ) "معرکہ برہان" (مولوی احمد علی) کی صورت میں کتب لکھی گئیں۔ ادھر غالب کے حمایتی بھی میدان میں اتر آئے جنھوں نے "دافع ہذیان" (مولوی نجف علی خان) "لطائف غیبی" (سیف الحق) وغیرہ لکھیں۔ خود "نامہ غالب" "تیغ تیز[۱۸]" کی صورت میں غالب نے بھی جوابات دیے۔ اس بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب نے "قاطع برہان" پر کام جاری رکھا۔ چنانچہ معترضین کے اعتراضات اور اپنے جوابات کی سند میں مزید شواہد پر مبنی "درفش کاویانی" (دسمبر ۱۸۶۵ء) طبع کرائی اس کے ۱۵۴ صفحات تھے اور اکمل طابع دہلی سے چھپی۔ آج "برہان قاطع" اور اس کے انداز کے دیگر لغات متروک ہیں۔ ملک میں فارسی زبان اور اس کا ذوق ماند پڑ چکا ہے جس کے نتیجے میں خود غالب بھی فارسی گوئی پر نازاں ہونے کے باوجود اب اردو کلام پر ہی زندہ ہے۔ تاہم لغات کی یہ بحث جہاں شناسوں کے لیے دلچسپی کا باعث رہی، وہاں اس کی روشنی میں غالب کے شعور کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب اگر شاعر نہ ہوتا اور اس نے صرف لسانیات، زبان و بیان اور صرف و نحو کے مباحث پر قلم اٹھایا ہوتا تو یقیناً وہ ایک ماہر کا درجہ پاتا ہے۔ اگر اس نے باقاعدگی سے لغت مدون کی ہوتی تو یقیناً یہ اہم کام ثابت ہوتی۔ اور غالب خان آرزو کے پایہ کا لغت نویس تسلیم کیا جاتا۔

غالب نے خسرو کی "خالق باری" کے انداز پر بچوں کے لیے تقریباً ۲۰۰ الفاظ پر مشتمل منظوم لغت قادر نامہ (مطبع سلطانی دہلی ۱۸۵۶ء) شائع کیا۔ اس میں عربی، فارسی کے مشکل الفاظ کے اردو معنی درج ہیں۔ نمونے ملاحظہ فرمائیے:۔

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا

ہے نبی مرسل پیغمبر راہ نما

اہل فرنگ کی آمد:

ہندوستان میں لغت نویسی کے دو ادوار بنائے جا سکتے ہیں، ایک دور وہ جس میں

فرہنگوں کے قواعد کے مطابق لغت مدون ہوتے تھے اور ان میں الفاظ و معنی اور اخذ اشتقاق کی بحثیں، فصاحت اور علم بیان کی روشنی میں مل پاتی تھیں۔ یہ اس عہد کے اہل علم، شعرا اور طلبا کی ضروریات کو کافی تھا۔

لغت نویسی کا دوسرا دور یورپین قوموں کی ہندوستان میں دلچسپی سے شروع کیا جاسکتا ہے۔ پرتگالی، فرانسیسی اور انگریز یہاں آئے، تو خود ہندوستانی سیکھنے اور دوسروں کو سکھانے کے لیے ڈکشنریاں مرتب کیں۔ ان دونوں میں کیا فرق ہو سکتا تھا، وہی جو لغت یا فرہنگ اور ڈکشنری کے الفاظ میں ہو سکتا ہے یعنی مشرقی اہل علم کا لفظ اور زبان کے بارے میں جو رویہ تھا اور یورپین لفظ اور زبان کی پرکھ کس انداز سے کرتے تھے۔ اہل مغرب کی ہندوستان سے تجارت خاصی قدیم تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے "دربار اکبری" میں اس ضمن میں خاصی تفصیل سے لکھا ہے بلکہ ان کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اکبر کی خواہش پر ۹۸۳ ہجری میں اہل فرنگ کو دہلی لایا گیا۔

مولانا آزاد کے بموجب ہندوستان میں پادری بھی آئے اور "انجیل لائے تثلیث پر دلائل پیش کر کے نصرانیت کا اثبات کیا اور ملت عیسوی کو رواج دیا"۔ اکبر ان سے مذہبی گفتگو کرتا بلکہ "شہزادہ مراد کو ان کا شاگرد بھی کیا"[۲۶]۔

اگرچہ مولانا آزاد کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اہل فرنگ کس ملک کے تھے بلکہ خود انھوں نے بھی اس پر تعجب کیا ہے "کہ جو زبان شاہزادے سیکھتے تھے، وہ رومی تھی یا عبرانی۔ شاید وہ یعنی یونانی زبان سکھاتے ہوں گے[۲۷]" غالباً آزاد کی رومی سے مراد لاطینی زبان ہے۔ اگرچہ اب اس ضمن میں وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا تاہم قوی امکان ہے کہ وہ پرتگالی ہوں گے۔ اس قیاس کو اس امر سے تقویت پہنچتی ہے کہ مولانا آزاد نے ایک مقام پر لفظ پادھری (ص ۷۶) استعمال کیا ہے جو کہ پرتگالی (Padre) ہے۔ ان دنوں سپین اور پرتگال کو انگلستان اور فرانس پر بحری فوقیت حاصل تھی۔ تاریخ سے بھی پرتگالیوں کی آمد کے شواہد ملتے ہیں۔

کالی کٹ نے جلد ہی یورپ سے تجارت کے لیے ایک اہم بندرگاہ اور تجارتی منڈی کی حیثیت حاصل کر لی۔ اگرچہ بعد میں فرانسیسی اور انگریز[۲۸] بھی اس دوڑ میں شریک ہو گئے لیکن ان کے اثر و رسوخ کے پھیلنے سے پہلے دو اڑھائی صدیوں تک پرتگالیوں کا ہی تجارتی غلبہ رہا۔ انگریزوں کے مقابلے میں پرتگالیوں کے پیچھے رہ جانے کی دو وجوہ نظر آتی ہیں، ایک تو یہ کہ

خود یورپ میں انگلستان اور فرانس کے مقابلے میں پرتگال کمزور ملک بن گیا اور دوسرے اس لیے بھی کہ انھوں نے یہاں بالعموم تجارتی امور سے دلچسپی رکھی۔ انگریزوں کی مانند نہ سازشیں کیں، نہ حکمرانوں کو لڑایا اور نہ مقامی سیاست میں دخل اندازی کی۔ جنوبی ہندوستان کے باشندوں کے پرتگالیوں سے طویل روابط کی لسانی اہمیت ہے کیونکہ اردو میں پرتگالی کے متعدد الفاظ شامل ہو کر اب عام بول چال کی زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔ چند الفاظ بطور مثال پیش ہیں۔ اچار، آیا (کھلائی)، الماری، باسن، بالٹی، بمبا، پاؤ روٹی، پرچ، پیپا، پستول، پولیس، تولیہ، ساگو، صابون، فالتو، فرما، کمرہ^(۹)، کپتان، کارتوس، کاج (بٹن کا)، قمیض، میز، مستول، نیلام۔ یہ فہرست الفاظ "منثورات" (ص ٦٠) میں درج ہے۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد نے اس فہرست میں مزید الفاظ شامل کر دیے ہیں۔ اناناس، بوتل، بسکٹ، پادری، پپیتا، پرات، تمباکو، تمبور، طنبور (طنبورہ)، جاکٹ، چاہ، چھاپ، چابی، سوفا، فیتہ، کابی کوچ، کاجو، گاری، مستری۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد^(۱۰) نے اس فہرست میں چائے کو بھی شامل کیا ہے۔ "CHA" چینی زبان کا لفظ ہے جو چائے کے ساتھ یورپ میں پہنچا تھا۔ پرتگالی میں یہ اپنی اصل صورت یعنی چاہ ہی میں استعمال ہوتا ہے انگلستان میں نہ جانے کیسے یہ "ٹی" بن گیا۔ یہ بھی عجیب بات ہے اردو میں تو یہ چائے ہی ہے مگر پنجابی میں اصل چینی تلفظ کے مطابق چاہ ہی بولتے ہیں۔ اسی طرح اچار کو بھی پرتگالی بتایا گیا۔

سازشیں، جوڑ توڑ اور ان کے نتیجے میں سیاسی اہمیت اور پھر بالآخر بالادستی حاصل کرنے سے پہلے ہندوستان آنے والے فرنگیوں کی عمومی تقسیم یوں کی جا سکتی ہے۔ تاجر، سیاسی عزائم کے حامل، مہم جو، طالع آزما اور وہ دانش ور جو یہاں کی تاریخ، مذاہب، تہذیب و تمدن، اساطیر اور زبانوں کو سمجھنا چاہتے تھے۔ موخرالذکر دانش ور بسلسلہ ملازمت آتے یا کسی وجہ سے لیکن اتنا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے بارے میں جو کچھ لکھا، اس کی اب بھی تاریخی اہمیت ہے۔ یہی وہ لوگ تھے جن میں سے بعض نے مقامی زبانیں سیکھیں، مقامی لباس پہنا۔

اردو: (ملکہ وکٹوریہ سے ہٹلر تک)

انگریزوں کی اردو سے دلچسپی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود ملکہ وکٹوریہ میں اردو سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی چنانچہ آگرہ کے مولوی برکت اللہ صاحب ملکہ کو اردو پڑھانے

کے لیے لندن بھیجے گئے۔ ملکہ نے تھوڑے عرصہ میں اس قدر اردو سیکھ لی کہ اپنا روزنامچہ اردو میں لکھا کرتی تھی"۔

عظیم بیگ چغتائی کے ایک مقالہ "اردو کی شاہی سرپرستی (مطبوعہ ادبی دنیا لاہور، فروری ۱۹۴۱ء) سے بھی اس ضمن میں معلومات حاصل ہوتی ہیں البتہ انھوں نے ملکہ کے معلم کا (جسے اردو سیکرٹری کہا جاتا تھا) نام سولوی برکت اللہ کی بجائے حافظ منشی عبدالکریم لکھا ہے۔ اس مقالہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان حافظ صاحب سے ملکہ وکٹوریہ نے قرآن مجید میں پڑھا تھا اور وہ "اس کو الہامی کتاب مانتی تھی"۔

عظیم بیگ چغتائی کے بموجب ۱۸۹۰ء سے پہلے ہی اردو سکھانے پر مامور تھے اور انتقال تک وہ شاہی محل میں مقیم رہے تھے۔ اس مضمون سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ وکٹوریہ اردو میں دستخط بھی کرلیتی تھیں۔

۱۸۵۷ء میں سقوط دہلی کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے جب "قیصرہ ہند" کا لقب اختیار کیا اور ایک سال بعد سارے ملک میں امن عامہ کا جو اعلان کیا وہ اردو ہی میں تھا۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ اسے کس نے لکھا تھا جب کہ عبدالرفیق کے بموجب "وائسرائے ہند سرجان لارنس نے ۱۲ نومبر ۱۸۶۷ء کو لکھنؤ کے جلسے میں جو تقریر کی تھی وہ بھی اردو زبان اور فارسی رسم الخط میں تھی۔

ملکہ وکٹوریہ سے لے کر ہٹلر تک خاصہ زمانی بعد ملتا ہے لیکن ہٹلر نے بھی فوجی اصطلاحات پر مبنی ایک اردو لغت تیار کرائی تھی "اردو معلیٰ" (قلم اردو نمبر، شمارہ ۹۰) میں مطبوعہ "ہٹلر کا اردو لغت" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۲۲۸ صفحات کا یہ لغت آزاد ہند فوج کے ایما پر سرکاری پریس سے ۱۹۴۳ء میں طبع ہوا اس کے ابواب کی فہرست یوں ہے ۱۔ جرمن قلم ہندوستان میں ۲۔ دستوں کے نام ۳۔ فوجی راہنمائی ۴۔ میدانی علم ۵۔ ہتھیاروں کا فن ۶۔ پل پار کرنے کے طریقے ۷۔ فوجی سامان ۸۔ فوجی سامان کی مرمت ۹۔ پانی کا پہنچاؤ ۱۰۔ ہوائی بیڑا ۱۱۔ سکھلائی۔ یہ عنوانات اردو کے علاوہ جرمن میں بھی درج ہیں۔ اس لغت کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ۱۹۴۳ء تک جرمنی میں اردو کو ہندوستانی کہا جا رہا تھا لغت کا جرمن میں سرورق یوں ہے:

Militar Worter Buch
Fur Den
Fuhrer und unter Fuhrer
Deutsch - Hindustani
1943

ڈکشنری بمقابلہ لغت:

تو یہ ہے وہ تناظر جس میں یورپین قوموں کی اردو سے عملی اور پھر علمی دلچسپی کا آغاز ہوا۔ انھوں نے پہلے خود آموزی کے لیے اور پھر ہم وطنوں اور طلبہ کی زبان شناسی کے لیے ڈکشنریاں مرتب کیں۔ اردو میں لغت اور فرہنگ کا جو انداز مروج تھا، وہ عربی، فارسی روایات کے تابع تھا، اسی لیے ایک مخصوص انداز اور اسلوب میں لغت لکھے جاتے تھے۔ لغت کو محض الفاظ کے معنی بتانے والی کتاب سمجھا جاتا تھا اور بس۔ یہ جو تصور ہے کہ لغت، زبان کے ارتقائی مراحل کا آئینہ بن جائے اور اشتقاق سے متداول لفظ کی "جڑ" تک پہنچا جائے، وہ اس سے ناآشنا تھے۔ اسی لیے خان آرزو کی "نوادر الالفاظ" کی استثنائی مثال سے قطع نظر باقی تمام لغات یکساں نوعیت کے تھے۔ اس کے برعکس انگریز لغت کے پیچھے صدیوں کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کے علاوہ یونانی Lexicon اور لاطینی ڈکشنریوں کی روایات بھی تھیں۔ مزید برآں اس زمانے میں یہاں لسانیات نام کا کوئی علم نہ تھا، صرف شعر کے حوالے سے علم بیان بدیع اور عروض کے مباحث سے دلچسپی کا اظہار کیا جاتا تھا جب کہ انگریز لغت نویس اگر لسانیات کے ماہر نہ تھے تو کم از کم اس کے بنیادی مباحث سے آشنا ضرور ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل زبان جو کام نہ کر سکے وہ نہ صرف یورپین نے کر دکھایا بلکہ اتنا معیاری تھا کہ حضرت عبدالحق کو یہ اعتراف کرنا پڑا:

"حیرت کی بات یہ ہے کہ اہل زبان کی کتابیں اکثر ناقص اور ناقابل التفات ہیں[۲۱]۔"

اردو کی قدیم ترین لغت:

یورپین قوموں کی اردو زبان سے دلچسپی کے تناظر میں جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ اردو کی قدیم ترین لغت کسی مقامی کے برعکس ایک یورپی نے لکھی تو یہ باعث تعجب نہیں معلوم ہوتا۔ آغا افتخار حسین کی کتابوں "یورپ میں اردو" اور "یورپ میں تحقیقی مطالعے" میں جہاں

اردو اور ہندوستان کے حوالے سے کار آمد معلومات ملتی ہیں، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "اردو زبان کی سب سے پہلی لغت ایک فرانسیسی مشنری فرانسکو ماریا دو تور نے سترھویں صدی میں لکھی[۳۲]۔ یہ غیر مطبوعہ ہے۔ سرجارج گریرسن اور مولوی عبدالحق نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کا مخطوطہ نمبر ۸۳۹ ببلیو تھک ناسیونال پیرس میں موجود ہے۔ یہ پانڈیچری کے مشنری کتب خانے میں ملازم تھا۔ اس نے سورت، نیپال اور تبت کی سیاحت بھی کی تھی۔ ۱۷۰۹ء میں پٹنہ میں انتقال ہوا۔

یہ لغت جس کا نام "Lexcon Lingua Indostanicae" ہے۔ چار زبانوں یعنی لاطینی، ہندی، فرانسیسی اور سور کے الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کے پانچ سو کے قریب صفحات ہیں، ہر صفحہ دو کالمی ہے (اردو معلی "قدیم اردو نمبر)۔

گریرسن نے "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" کی جلد نہم میں ہندوستانی لغات و قواعد کا جائزہ لیتے ہوئے جو تفصیلات دی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی سب سے پہلی لغت مسٹر کورج کے جو کا ایک قلمی نسخہ تھا جس میں فارسی، ہندوستانی انگریزی اور پرتگالی الفاظ یکساں درج تھے۔ اس کی تالیف ۱۶۳۰ء میں سورت کے مقام پر ہوئی۔

لغات اٹھارویں صدی میں:

یہ اٹھارویں صدی تھی جس میں مطبوعہ لغات ملتے ہیں، اب تک انگریز بھی اس میدان میں آ چکے تھے۔ چنانچہ پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے مدون کردہ لغات بھی طبع ہونے لگے۔ جیسے جیسے ہندوستانی سیاست میں انگریزوں کی مداخلت اور برتری بڑھتی گئی، ویسے ویسے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کی علمی سرگرمیوں میں بھی تیزی آتی گئی تاہم اٹھارویں صدی کے آغاز میں قابل ذکر کام انگریزوں کے بجائے دیگر اقوام کے افراد نے کیا۔ اس ضمن میں ڈنمارک کے جان جوشوا کوٹلر (John Joshua Kactelaer) (۱۷۱۸-۱۶۵۹ء) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ "جس نے ہندوستانی زبان کی صرف و نحو کی لغت لکھی۔ اس کا مسودہ ولندیزی زبان میں ہے اور ابھی تک ہیگ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس کا ترجمہ ڈیوڈ مل (David Mill) نے کیا اور اپنی کتاب "Miscellanea Brientalia" میں شامل کر کے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا کٹلر کی کتاب اس ترجمہ کے ذریعے منظر عام پر آئی[۳۳]۔ یہ ترجمہ لیڈن (Leiden) سے شائع ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق کے خیال

کے مطابق کتاب کا زمانہ تالیف ۱۷۱۵ء ہے" (قواعد اردو، ص ۱۹:) کتاب لاطینی زبان میں
ہے لیکن ہندوستانی (اردو) الفاظ اور عبارتیں رومن حروف میں لکھی گئی ہیں۔ ان کے ساتھ
ساتھ حروف ہندوستانی جدول میں ہندوستانی الفاظ اور املا میں درج ہیں ان الفاظ کا املا ولندیزی
زبان کے مطابق ہے۔[۲۴]

"Instruztie off Onderwiotsinge Der
Hindoustanse, Ev Dersiaanse Teleu,
Verens Hare Declinatie En Conjucatie
Als Mede Verqgelijkinge Der Hindoustanse
Med de Hollandse Maat, Ev Genwig H Ten
Mitsgaders Beduijd Ingh Ee.
Niger Moors Naeem etc."

("ہندوستانی اور فارسی زبان سیکھنے کے لیے ہدایات اور سبق فعلوں کے مختلف صیغوں کی
گردانیں ہندوستان کے ناپ تول کے پیمانوں سے متعلق الفاظ اور ان کی ولندیزی اور
مسلمانوں کے مختلف ناموں کے معنی ہیں[۲۵]")

سلیم الدین قریشی اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں کہ "اسے ڈیوڈ مل (David mill)
"Dissertationes selectae, varias Literarum et Antiquitatis نے
orientalis cadita
"Miscellanea orientalia"
کے عنوان کے تحت ایک باب (صفحات ۲۰۱-۳۵۵) کی حیثیت سے شامل کر کے جنوری
۱۷۳۳ میں شائع کی تھی۔ اس باب کے پہلے حصہ (صفحات ۳۸۸-۳۵۵) کا عنوان۔ De
Ling ua Hindustanica ہے اور اس کے صفحہ ۳۵۷ پر مصنف نے ہندوستانی اور
دکنی کے مندرجہ ذیل الفاظ اردو ٹائپ میں دیے ہیں۔

ہندوستانی: ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ،
دکنی: پہل وال، دوسروال، تیسراوال، چوتھاوال

مندرجہ بالا الفاظ کے علاوہ اردو کے دوسرے الفاظ رومن رسم الخط میں ولندیزی زبان
کے تلفظ کے مطابق دیے گئے ہیں البتہ فارسی اور عربی الفاظ کے لیے نستعلیق ٹائپ کیا گیا
ہے۔[۲۶]

آغا افتخار حسین نے ڈنمارک کے ایک اور شخص آوارس ابیل (Iwarus Abed)

کی فرہنگ کا بھی تذکرہ کیا ہے جو "۱۷۸۴ء میں کوپن ہیگن سے شائع ہوئی۔ اس فرہنگ میں (۵۴) الفاظ کے معنی کا گیارہ زبانوں میں مقابلہ کیا گیا ہے۔ ان زبانوں میں ہندوستانی بھی شامل ہے"۔(۲۷)

سترہویں اور اٹھارویں صدی میں ڈکشنریوں کے سلسلے میں جو کام ہوا وہ زیادہ تر فرانسیسیوں اور پرتگالیوں کا تھا۔ پروفیسر ثریا حسین نے گارسیں دتاسی کے بارے میں اپنے تحقیقی مقالے میں ایک فرانسیسی لغت کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں "ہندوستانی، فرانسیسی اور فرانسیسی، ہندوستانی لغت جس میں ہندوستان کی دیومالا، تاریخ اور جغرافیہ کے الفاظ بھی ہیں، اس کے مولف فرانسوا دلنوئل تھے اور یہ گارسیں دتاسی کی زیر نگرانی میں ۱۸۷۶ء میں چھپی۔ اس کے صفحات کی تعداد ۱۲۰۳۲ ہے اس لغت کا دیباچہ گارسیں دتاسی نے لکھا ہے۔

انگریزوں کی ڈکشنریاں:

اٹھارویں صدی کے آواخر سے ایسی ڈکشنریاں مدون کی جانے لگی تھیں جو اس زمانے میں خاصی مقبول تھیں اور اب بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ گل کرسٹ اس ضمن میں خصوصی تذکرہ چاہتا ہے۔

محمد عتیق صدیقی کی تالیف "گل کرسٹ اور اس کا عہد" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گل کرسٹ نے خاصی مالی مشکلات اور پریشانیوں کے بعد ڈکشنری مکمل کی تھی، حتی کہ "اتنا مقروض ہو گیا کہ مسٹر گوپر ساہوکار کے پاس لغت کے حقوق کا رہن نامہ رکھنا پڑا (ص ۸۳)۔ اس ضمن میں غازی پور سے ۱۲ مئی ۱۷۹۰ء کو جو اشتہار شائع کیا گیا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈکشنری کی فروخت سے گل کرسٹ کو اس وقت تک کوئی تعلق نہ ہوگا۔ جب تک قرض کی ادا نہ ہو جائے۔ اس وقت تک مولف کو اس رقم کی وصولی کا قطعا کوئی حق نہیں ہے" (ص: ۸۴-۸۳)۔ گل کرسٹ دھن کا پکا تھا چنانچہ ناساعد حالات اور مالی مشکلات کے باوجود فتشم پشتم جس طرح بھی بن پڑا ۱۷۸۶ء میں English Dictionary Hindustanee کا پہلا اور چار سال بعد دوسرا حصہ چھپا۔ وہ تو اس کا تیسرا حصہ بھی طبع کرانا چاہتا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا، البتہ ہندوستان سے واپس اپنے وطن ایڈنبرا پہنچ کر ان دونوں حصوں کو یکجا کر کے مکمل ڈکشنری ۱۸۱۰ء میں طبع ہوئی۔ ۷۰۴ صفحات پر مشتمل ڈکشنری کے سرورق پر اس کے دوست، تھامس روبک کا نام بھی درج ہے۔ پروفیسر ایس کے حسنی کے

مقالہ "اردو لغت نویسی اور اہل انگلستان" کے بموجب لندن سے ۱۸۱۰ء میں اس کا ایڈیشن طبع ہوا تھا، اب معلوم نہیں یہ ایڈیشن جداگانہ تھا یا وہی ایڈنبرا والا تھا۔ تاہم ان ایڈیشنوں کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ ہندوستانی ایڈیشن میں انگریزی الفاظ کے معنی اردو اور فارسی رسم الخط میں ہیں جبکہ ایڈنبرا اور لندن ایڈیشن کے تمام الفاظ رومن میں ہیں۔ شاید یہ عجیب محسوس ہو۔ غالباً گل کرسٹ نے یہ ڈکشنری ہندوستانیوں کی بجائے انگریزوں کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر مدون کی ہوگی، اسی لیے معانی رومن میں دیے۔

عطش درانی کے بقول "۱۷۹۰ء میں اردو کا پہلا مکمل لغت ڈاکٹر ہنری ہیرس نے مدارس سے شائع کیا۔ اس کی کتاب "اے ڈکشنری آف انگلش اینڈ ہندوستانی" اپنے موضوع پر ایک جامع حوالہ جاتی کتاب ہے ۔۔۔ اس لغت کا ایک نسخہ احسان دانش کے کتب خانے میں موجود تھا ۔۔۔ اس پر سنہ اشاعت ۱۷۹۰ء درج ہے مگر محمد عتیق صدیقی نے "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں سنہ اشاعت ۱۷۹۱ء بیان کیا ہے۔ اس لغت کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تدوین میں جدید ترین معیار کو سامنے رکھا گیا۔ صفحات کے نمبر نہیں دیے گئے البتہ ہر صفحہ دو کالموں میں منقسم اور ان کالموں کے نمبر دیے گئے ہیں۔ کتاب دو ہزار باون کالموں یعنی ایک ہزار چھبیس (۱۰۲۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ۱۵۸ صفحات اشاریہ کے بھی ہیں۔ کتاب کے اختتام پر اغلاط نامہ درج کیا گیا ہے۔ الفاظ لکھنے سے پہلے ان کے ماخذ (زبان) کو درج کر دیا گیا ہے اور معنی بتانے سے پیشتر بتایا گیا ہے کہ یہ کس لفظ سے مشتق ہے اور اس کا تلفظ کیا ہے۔ اگر سنسکرت کا لفظ ہے تو دیوناگری رسم الخط میں بھی اسے تحریر کیا گیا ہے۔ زیادہ تر ہندی، سنسکرت، عربی، فارسی، ترکی، یونانی اور انگریزی ماخذوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دیگر خصوصیات جدید لغات کی ہیں مثلاً تذکیر و تانیث، واحد جمع وغیرہ کی نشاندہی بھی کی ہے[۲۸]۔

محمد عتیق صدیقی نے اس لغت کو "جامع" قرار دیتے ہوئے گل کرسٹ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ "اس لغت کی ترتیب و تالیف میں ڈاکٹر ہیرس نے بڑی محنت اور صحت سے کام لیا ہے اور یہ کتاب ہندوستانی زبان سے مؤلف کی پوری پوری واقفیت کے ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتی ہے۔ گل کرسٹ نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ڈاکٹر ہیرس نے "کچھ منتخب الفاظ" اخذ کر کے اس نے اپنے "ضمیمے" میں شامل کیے تھے۔ ڈاکٹر ہیرس کی کتاب کا نام تھا "Analysis Grammer and Dictionray of

Hindustany Language"(۲۹)

ہیرس کی لغت اگرچہ کئی لحاظ سے جامع نظر آتی ہے مگر اپنی اہمیت کے باوجود یہ اس نوعیت کا پہلا کام نہ تھا کیوں کہ ۱۷۷۳ء میں بے۔ فرگوسن کی "A Short Dictionary of The Hindustan Language" دو حصوں میں شائع ہو چکی تھی۔(۳۰)

اسی دوران میں جارج ہیڈلے کی بھی ڈکشنری شائع ہوئی مگر وہ صرف و نحو کے ساتھ تھی۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد کے بقول "ہیڈلے کی صرف و نحو مع فرہنگ انگریزی رموز کے الفاظ فارسی رسم الخط میں ہے۔ ان الفاظ کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے جو متحد الصوت اور مختلف المعنی ہیں۔ اس کے مختلف ایڈیشن ۱۷۷۳ء، ۱۷۷۹ء، ۱۷۹۷ء، ۱۸۰۲ء، ۱۸۰۹ء میں شائع ہوئے"۔ (ص ۲۸۱) معلوم ہوتا ہے کہ ہیڈلے ہر ایڈیشن میں اضافے کرتا گیا کیوں کہ گل کرسٹ کی لغت کی اشاعت (۱۷۹۰ء) کے بعد ہیڈلے کے لغت کا جو ایڈیشن ۱۷۹۷ء میں شائع ہوا تھا، اس میں ہیڈلے نے گل کرسٹ کی شکایت کے بموجب، اس کے لغت سے کچھ الفاظ اور ان کے معنی "چرا کر" شامل کر لیے تھے اور صرف دو جگہ گل کرسٹ کے لغت کا حوالہ دیا۔ گل کرسٹ نے جل کر اسے "دو کوڑی کی کتاب" قرار دیا تھا(۳۱)۔

کپتان تھامس روبک گل کرسٹ کا قریبی دوست اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا اسسٹنٹ سیکرٹری (۱۸۱۱-۱۷ء) تھا اسے اردو زبان وادب سے جو دلچسپی تھی گل کرسٹ کی صحبت نے اس میں مزید نکھار پیدا کیا۔ کپتان تھامس روبک کی شہرت روسی میں لکھے گئے لغت جہازرانی (کلکتہ: ۱۸۱۱ء طبع دوم لندن ۱۸۱۳ء) سے ہوئی۔ یہ ایک مقبول لغت تھا جس میں جہازرانی سے متعلق اصطلاحات اور مخصوص الفاظ کے معنی درج تھے۔ اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہوتے رہے۔ چھٹا ایڈیشن "لشکری لغت" (۱۸۸۲ء) کے نام سے چھپا۔

کپتان تھامس روبک کی Hindustani Interpreter (لندن ۱۸۱۸ء) بھی خصوصی تذکرہ چاہتی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب اصولِ قواعد سے بحث کرتی ہے تاہم اس میں فرہنگ بھی تھی۔ دوسرے ایڈیشن (لندن ۱۸۲۴ء) کے بعد لندن اور پیرس سے تیسرا ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنے مقالے "بنگال کے انگریز مصنفین اردو" میں کپتان تھامس روبک کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان کا انتقال کلکتہ میں ہوا اور قبر کے کتبے کے مطابق

انتقال کی تاریخ ۸ دسمبر ۱۸۱۹ء ہے[۳۲]۔

کچھ اور انگریزوں کے لغات کے تذکرے بھی ملتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو ایک دو مرتبہ چھپے، پھر معدوم ہوگئے، اس لیے ان کی خوبیاں یا خامیاں گنوانا ممکن نہیں تاہم ان کی اتنی اہمیت یقیناً ہے کہ انگریز لغت نویسوں کی دو صدیوں پر پھیلی روایت میں ان کا بھی ذکر آتا ہے۔

ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی A Dictionary of Hindustani and English دو جلدوں میں کلکتہ سے ۱۸۰۶ء میں چھپی۔

وائی رابرٹ کی ایک ہزار الفاظ پر مشتمل An Indian Glossary لندن سے ۱۸۰۰ء میں طبع ہوئی۔

ولیم ٹھینٹ کی گرائمر لغت اور اسباق زباندانی ۱۸۲۴ - ۱۸۲۷ اور ۱۸۳۳ میں طبع ہوئی۔

جارج کلیفرڈ وائنٹ ورتھ (Gc. Whitworth) کی An Anglo-Indian Dictionary لندن سے ۱۸۳۲ میں شائع ہوئی۔ سرورق پر درج عبارت کے مطابق "یہ انگریزی میں مستعمل ہندوستانی اصطلاحات اور ان انگریزی یا دیگر غیر ہندوستانی اصطلاحات کی فرہنگ ہے جنھوں نے ہندوستان میں خصوصی معانی حاصل کر لیے ہیں۔" یہ ڈکشنری اس لحاظ سے اپنی نوعیت کی غالباً واحد مثال ہے کہ مولف نے اردو کے عام الفاظ کے برعکس صرف ان الفاظ کا انتخاب کیا جو ہندوستان میں رہائش پذیر انگریزوں کی زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ اس لحاظ سے مولف نے پیش لفظ میں اسے "انگلش ڈکشنری ہندوستانی ضمیمہ" قرار دیا ہے اور یہ بالکل درست ہے۔ الفاظ اور ان کے معنی انگریزی میں ہیں لیکن یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ لفظ کس زبان کا ہے۔ ۳۵۰ صفحات کی اس ڈکشنری میں الفاظ کے ساتھ اشیاء، تاریخی شخصیات و قبائل، جغرافیہ اور سرکاری عہدے داروں کے بارے میں مختصر ترین معلومات بھی مل جاتی ہیں۔

این برائس کی ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۴۷ء میں کلکتہ میں شائع ہوئی۔

جے۔ ٹی۔ ٹامسن کی اردو انگریزی ڈکشنری ۱۸۳۸ء میں رام پور سے طبع ہوئی۔

ایچ ایم ایلیٹ کی Glossary of Ind Term ۱۸۴۵ء میں آگرہ سے چھپی

ڈاکٹر ایف ہیچی کی میڈیکل لغت کلکتہ میں ۱۸۷۳ء اور اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں

شائع ہوئی۔

ایچ انڈوس کی اردو انگلش لغت کا ساتواں ایڈیشن کلکتہ سے ۱۹۶۹ء میں چھپا۔

ڈاکٹر آغا افتخار حسین کے مقالہ "برطانیہ میں اردو" میں ان لغت نویسوں کے نام ملتے ہیں۔

نارتھ برائس۔ ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۴۷ء

بلوک میں انگریزی اردو ڈکشنری ۱۸۷۷ء

ایونگ یونانی اردو لغت[۳۱]

ان کے علاوہ پروفیسر ایس کے حسنی کے مقالے "اردو لغت نویسی اور اہل انگلستان" میں مزید لغت نویسوں کا ذکر بھی ملتا ہے، سو ان کے بقول ہنگری گرانٹ نے ۱۸۵۰ء میں اپنا لغت ترتیب دیا۔ J. P. Hazel-Grove نے ۱۸۶۵ء میں، لاگ نے ۱۸۷۷ء میں، ریورنڈ کریون نے ۱۸۹۰ء، تھابرن نے ۱۸۹۱ء اور راڈنگ نے ۱۹۰۵ء میں انگریزی اردو لغت ترتیب دیے[۳۲]۔

ان میں سے بیشتر لغات ان انگریزوں نے لکھے جن کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں ملتیں، اس لیے کتابیاتی کوائف کا بہم پہنچانا ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں لیکن اب جن لغات کا ذکر کیا جائے، ان کے مؤلفین گمنام نہیں۔

ڈبی۔ ڈبی ولیم ایٹس ایک مشنری تھا مگر اسے زبانیں سیکھنے کا شوق تھا۔ ہندوستان آ کر اس نے اردو کے علاوہ سنسکرت، ہندی اور بنگلہ میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ لغت لکھنے کے قابل ہو گیا۔ کچھ دیر کے لیے یہ کلکتہ سکول بک سوسائٹی میں سنسکرت اور بنگلہ کے شعبہ کا سیکرٹری بھی رہا۔ اس کی دو کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ۳۳۶ صفحات کی Introduction to Hindustani (کلکتہ ۱۸۳۰) جو اردو گرامر، الفاظ، اسباق کی صورت میں تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کی ہندوستانی انگریزی لغت خاصی معروف ہے اور شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے بقول "مصنف پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ اس نے اس لغت میں سنسکرت آمیز یا ہندوی الفاظ کو شامل نہیں کیا لیکن یہ بات نہ تو درست ہے اور نہ ہی ممکن ہے کیونکہ اردو ہندوستانی زبان ہے جس میں بے شمار الفاظ سنسکرت سے آئے ہیں یا ہندوستان کی دیگر پراکرت زبانوں سے۔ ہاں مصنف چونکہ سنسکرت سے واقف تھے، اس لیے انھوں نے اس بات کی کامیاب کوشش کی کہ ٹھیٹھ سنسکرت الفاظ سے ان کی لغت پاک رہے۔ دیباچہ کی تاریخ جنوری ۱۸۴۷ء

ہے اور ۱۸۲۷ء ہی میں یہ بپٹسٹ (Baptist) مشن پریس کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کے صفحات ۵۸۳ ہیں(۳۵)۔ لغت نگاری کے سلسلے میں کیپٹن جوزف ٹیلر کا نام اور کام بھی قابل توجہ ہے۔ جان شیکسپیئر کی انگریزی اردو لغت کے پیش لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل کیپٹن جوزف ٹیلر نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے یہ ڈکشنری مرتب کی تھی۔ بعد میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ارنڈیشو کی اعانت سے ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے ۱۸۰۸ء میں اسے کلکتہ سے طبع کروایا۔ اس کا نام تھا A Dictionary of Hindustani English۔ یہ لغت خاصا مقبول ہوا اور اس کی طلب میں کمی نہ ہوئی مگر اس لغت سے متعلق دونوں حضرات کا انتقال ہو چکا تھا۔ اوھر لغت بھی بالعموم دستیاب نہ تھا۔ چنانچہ ترامیم اور اضافوں کے ساتھ ۱۸۱۷ء میں لندن سے طبع کیا گیا۔ مسلسل طلب کی بنا پر تین سال بعد تیسرا اور پھر ۱۸۳۴ء میں چوتھا ایڈیشن طبع ہوا جس میں انڈیکس کے اضافہ سے افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ بعد ازاں جان شیکسپیئر نے مزید الفاظ کے اضافے سے اسے اپ ٹو ڈیٹ کر دیا۔ پیش لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لغت میں دکھنی کی زبان کے الفاظ کا بطور خاص اضافہ کیا گیا اور ان کتب کی نشاندہی بھی کر دی گئی جن سے الفاظ اخذ کیے گئے تھے۔ جیسے پریم ساگر (کلکتہ ۱۸۲۵ء) ڈاکٹر ہیرس کی ڈکشنری انگلش اینڈ ہندوستانی (مدراس ۱۷۹۰ء) دکھنی انوار سہیلی (مدراس ۱۸۲۴ء) ڈاکٹر ہیرس کی ڈکشنری انگلش اینڈ ہندوستانی (مدراس ۱۷۹۰ء)، دکھنی انوار سہیلی (مدراس ۱۸۲۴ء) ڈاکٹر ہر کلوٹس کی قانون اسلام (لندن ۱۸۳۲ء) اور An Introduction to the Study of Hindustani Language A Spoken Carnatic (مدراس ۱۸۰۸ء) یوں دیکھیں تو جان شیکسپیئر ۱۸۳۴ء کا مرتب ایڈیشن ایک لحاظ سے نئے لغت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جان شیکسپیئر مستشرقین میں خاصا اہم نام ہے۔ وہ مشرقی زبانوں بالخصوص عربی کا ماہر تھا اور رائل ملٹری کالج مارلو میں مشرقی زبانوں کا پروفیسر تھا۔ اس کی تالیفات میں An Introduction to Hindustani بھی خاصی معروف ہے۔

مستشرقین میں ڈنکن فاربس بھی اہم نام ہے۔ اس کی ڈکشنری تقریباً پندرہ ہزار الفاظ پر مشتمل تھی۔ ادبی کے پہلو بہ پہلو اس نے ان الفاظ کو بھی ڈکشنری میں شامل کر لیا جو روز مرہ کی زندگی اور عام اشیاء سے متعلق تھے۔ لندن سے ۱۸۷۹ء میں طبع ہونے والی ڈکشنری کا مکمل نام یہ ہے۔

Dictionary English Hindustani and Occompanied by a

Reversed Dictionary of English and Hindustani
ڈنکن فوربس باغ و بہار کے مستند ایڈیشن کے لیے بھی خصوصی شہرت رکھتا ہے۔
جب ۱۸۷۳ء میں اس نے لندن سے باغ و بہار کا دیدہ زیب چوتھا ایڈیشن طبع کیا تو ۲۵۲ صفات پر مشتمل باغ و بہار کے اختتام پر ۱۲۵ صفحات کی فرہنگ بھی شامل کر دی۔ اس نے ہر لفظ کے انگریزی کے معانی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تلفظ اور تذکیر و تانیث کی بھی وضاحت کر دی۔ اگرچہ یہ صرف باغ و بہار کی فرہنگ ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسی بنا پر آج یہ خصوصی اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ دلی کے روڑے میر امن نے باغ و بہار کے "قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان عورت مرد، لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں" قلم بند کیا تھا۔ اس لحاظ سے تو یہ انیسویں صدی کے آغاز کی دلی کے گلی کوچوں میں بولی جانے والی زبان کی چھوٹی سی ڈکشنری بن جاتی ہے۔
ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن کی A New English Industani Dictionary لندن سے ۱۸۷۹ء میں چھپی تھی۔ ڈاکٹر فیلن ایک کامیاب ڈکشنری کے فنی تقاضوں سے آگاہ تھا۔ چنانچہ اس نے ڈکشنری کے ذخیرہ الفاظ کو پر تنوع بنانے کے ساتھ ساتھ ماخذ، تذکیر و تانیث کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی جیسا کہ اس نے دیباچہ میں لکھا۔
"۔۔۔ اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان میں جن لوگوں کی مادری زبان ہندی ہے، ان کی ٹھیٹھ گفتگو کے الفاظ کو بطور خاص جگہ دی گئی ہے، یہی نہیں بلکہ پہلی مرتبہ دونوں کی ملاوٹ سے پاک زبان کے خالص الفاظ بھی شامل لغت ہیں۔ جہاں تک الفاظ کے معانی کا تعلق ہے تو اس مقصد کے لیے شاعری، گیتوں، محاورات اور کہاوتوں کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی عوامی گفتگو سے بھی مثالیں اخذ کی گئیں"۔
یہ لغت اس بنا پر بھی قابل توجہ ہے کہ سید احمد دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ" اس لغت کی تدوین میں فیلن کے معاون تھے[۲۰]۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لغت نویسی کے اصول اور قواعد انہوں نے فیلن ہی سے سیکھے ہوں گے اور پھر ان ہی کی روشنی میں انھوں نے "فرہنگ آصفیہ" مدون کی ہو گی شاید یہی وجہ ہے کہ جو محققین فیلن کے کام سے خوش نہیں، وہ فرہنگ آصفیہ" کے بھی قائل نہیں اور فیلن جسے اپنے لغت کی خوبی سمجھتا تھا، وہ خامی قرار پائی۔ جنول جابر علی سید:
"۔۔۔۔۔ اس کی خصوصیت محاورات و امثال کی کثرت اور ادبی اصطلاحات کا فقدان

ارادی ہے۔ جس کمی کو پلیٹس پورا کرتی ہے۔ فیلن کی ادبی گریز پائی ایسی نمایاں ہے کہ پلیٹس اور مولوی عبدالحق دونوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ سید احمد دہلوی نے بھی فیلن کے وطیرہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ ابتذال جیسا اہم کثیر المعنی لفظ دونوں نے نکال باہر کیا ہے۔"(۳۷)

پلیٹس نے اپنی ڈکشنری کے پیش لفظ میں ڈاکٹر فیلن پر یہ اعتراض کیا:

"ڈاکٹر فیلن نے اپنی ڈکشنری میں اردو اور ہندی ادب کے سینکڑوں الفاظ کو اس بنا پر خارج کر دیا کہ اس کے نقطہ نظر کے مطابق یہ الفاظ طلبیت کے مظہر ہیں جس کے باعث کم از کم طلبا کی حد تک تو اس کی کتاب کی افادیت خاصی کم ہو جاتی ہے تاہم اس کے باوجود بھی اس کا کام خاصا اہم ہے اور بلاشبہ شعراء کے کثیر حوالوں اور لاتعداد محاورات اور ضرب الامثال کی بنا پر محققین کے لیے یقیناً باعث افادیت ثابت ہو گی۔"

ان اعتراضات کے باوجود فیلن کی ڈکشنری کی خصوصیات اور اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی، اس لیے کہ پہلی مرتبہ ناخواندہ اور دیہی عوام کی گفتگو کے تمام الفاظ اور محاورات کو بطور خاص جمع کیا گیا۔ غالباً اس معاملے میں وہ بھی اپنے ہم وطن ورڈز ورتھ کے اس تصور کا حامی تھا کہ شہروں میں تعلیم یافتہ حضرات کے مقابلے میں دیہاتی فطرت کے زیادہ قریب ہوتے ہیں، اس لیے ان کی مانند ان کی زبان بھی زیادہ فطری ہوتی ہے۔ اس کی لغت ۱۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر فیلن کی قانون اور تجارت سے متعلق الفاظ اور اصطلاحات پر مبنی A Hindustani English Law and Commercial Dictionary ۱۸۷۹ء میں بنارس سے طبع ہوئی تھی۔ ۲۸۴ صفحات کی اس ڈکشنری میں ہندی الفاظ دیوناگری میں بھی لکھے گئے ہیں۔

جان ٹی پلیٹس کی A Dictionary of Urdu, Classical Hindi and English

۱۸۸۴ء میں پہلی مرتبہ لندن سے طبع ہوئی اور چھپتے ہی مقبول عام ہو گئی۔ اس کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۱۱ء اور پانچواں ۱۹۳۰ء میں طبع ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں آخری مرتبہ چھپی جبکہ پاکستان میں ۱۹۸۳ء میں پہلی مرتبہ طبع ہوئی۔

ڈکشنری کے پیش لفظ میں پلیٹس نے جہاں فیلن پر اعتراضات کیے وہاں یہ اعتراف

بھی کہا کہ یہ ڈکشنری جان شیکسپیر کی ڈکشنری کے انداز پر مدون کی گئی ہے۔ پلیٹس نے عوامی گفتگو اور غیر کتابی الفاظ کو بھی شامل کیا ہے۔ پلیٹس نے ہر لفظ کا ماخذ ظاہر کیا اور مختلف المعنی مگر ہم صوت اور یکساں املا والے الفاظ کو یکجا کر دینے کے برعکس الگ الگ سطر میں ماخذ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ہندی الفاظ دیوناگری رسم الخط میں لکھے ہیں جبکہ سنسکرت عربی اور فارسی الفاظ کے ضمن میں پلیٹس نے تمام ماخذ کا حوالہ بھی دیا ہے اور جان شیکسپیر کی مانند لفظ سے پہلے اس زبان کے نام کا پہلا حرف رومن میں درج کیا ہے۔ یعنی لفظ سے پہلے 'H' کا مطلب ہندوستانی ہوگا۔ یہ ڈکشنری باریک ٹائپ کے ۱۲۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

جہاں تک اس کی خوبیوں یا خامیوں کا تعلق ہے، جابر علی سید کے بقول:

"..... کئی اعتبار سے مثالی ہے اصلاً یہ انگریزوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں انگریزوں کے تصور اردو بصورت ہندوستانی • ہندی کی یہ بہترین مثال ہے۔ اصناف سخن کا صحیح ادراک اس میں مفقود ہے۔ یہ اس کا کمزور ترین پہلو ہے لیکن اس سے ہندی سنسکرت الفاظ اور دیوناگری رسم الخط بآسانی سیکھا جاسکتا ہے۔ فارسی الفاظ کی اصل بھی قابل تعریف پہلو ہے۔ اس معاملے میں اغلب ہے کہ مولف نے سب سے بڑھ کر برہان قاطع جیسی مقبول اور بآسانی دستیاب لغت سے پورا استفادہ کیا ہے[۳۸]۔"

جابر علی سید نے پلیٹس کی لغت اور اس کے ساتھ فرہنگ آصفیہ کا محاکمہ کیا ہے اور پھر ان کے اعتراضات پر وارث سرہندی نے تبصرہ کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

کتب لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ:

اور اب آخر میں تذکرہ ایک ایسی ڈکشنری جو حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کے نام نامی سے موسوم کی گئی ہے۔ کرنل سرہنری یول اور آرتھر کوک برنل اس کے مولفین ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں لندن سے طبع ہونے والی ڈکشنری کا مکمل نام یوں ہے:

Hobson Tobson Being A Glossary of Anglo-Indian Colloquical Words and Phrases And of Kindered Terms: Etymiological Historical Geographical Discursive

اس کے بارے میں جملہ کوائف آغا افتخار حسین کی کتاب "یورپ میں اردو" سے ماخوذ ہے۔ کرنل یول کے والد میجر ولیم یول عربی اور فارسی کے فاضل تھے۔ انھوں نے اور کتابوں کے علاوہ حضرت علی کی "نہج البلاغتہ" کا بھی ترجمہ (۱۸۳۲ء) کیا تھا۔ گھر کے علمی

ماحول کے باعث یول کو بھی اسلام سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے ڈکشنری کے دیباچے میں نام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا۔ یا حسن یا حسین انگریزی میں ہابسن جابسن بن گئے۔ اس نام میں مولفین کی طرف اشارہ بھی ہے۔ اشتقاقی نقطہ نظر سے یہ لغت پر از معلومات ہے اور مولفین نے انگریزی کے متعدد الفاظ کو عربی، فارسی، اردو اور جنوبی ہند کی زبانوں سے مشتق قرار دیا ہے۔ اس طرح یورپ کی زبانوں سے جو الفاظ اردو کا حصہ بن گئے، ان کی وضاحت بھی کر دی گئی۔ مولفین نے اس ضمن میں ہر طرح کی ادبی، تاریخی اور جغرافیائی معلومات جمع کر دی ہیں۔ حوالہ جاتی تنوع کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۰۷ کتابوں سے استفادہ کیا گیا جس کے نتیجے میں یہ ڈکشنری نیم انسائیکلوپیڈیا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ حتیٰ مولفین نے پشاور کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں ۴۰۰ عیسوی سے لے کر ۱۸۶۳ء تک کے مستند تاریخی حوالوں کی مدد سے پشاور کے بارے میں معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس طرح انگریزی لفظ Grabe، بگاڑنہ، پنکھا، پنجاب، شلوار، رن کچھ، شیمپو وغیرہ کی مثالوں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ لفظ کس طرح صدیوں کا سفر طے کر کے مختلف تہذیبوں اور زبان میں صورتیں بدلتا جاتا ہے۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ ہماری شلوار کا لفظ یونانی زبان میں بھی آج سے دو ہزار سال قبل رائج تھا؟ الغرض ایک صدی پیشتر چھپنے والی یہ ڈکشنری اب بھی استفادہ کے قابل ہے۔ تعجب کہ ہمارے کسی بھی علمی ادارے کو اس کی اشاعت کا دھیان نہیں آیا۔

تو یہ تھی مختصر الفاظ میں لغت نویسی کی داستان جس کا آغاز فارسی سے ہوا مگر نیا خون یورپین محققین اور مستشرقین نے دیا۔ جب یورپین نے آغاز کار کیا تو ان کے سامنے فارسی کی قدیم اور روایتی فرہنگوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا مگر انھوں نے اہل زبان نہ ہوتے ہوئے بھی جس محنت اور لگن سے لغت نویسی میں جادہ تراشی کی، اس کی داد نہ دینا زیادتی ہو گی۔ واضح رہے کہ اس عہد میں آج کی مانند لاکھوں کی گرانٹ سے چلنے والے، نہ تو سرکاری ادارے تھے، نہ ایئر کنڈیشنڈ دفاتر، نہ لمبی کاریاں، نہ سیکرٹری، نہ ٹائپسٹ اور نہ ہی چپراسی کو بلانے والی گھنٹی۔ یہ سب کام انھوں نے اپنے شوق، لگن اور جذبہ تحقیق سے کیا۔ گلکرسٹ کے لغت کے سلسلے میں بتایا جا چکا ہے کہ وہ کس طرح مالی پریشانیوں کا شکار رہا، حتیٰ کہ قرض خواہ کے پاس ڈکشنری کے حقوق رہن رکھنے پڑ گئے۔

یورپین اور بالخصوص انگریز لغت نویسوں کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے لغت نویسی کے جدید اصولوں اور قواعد کے مطابق کام کیا۔ تقابلی لسانیات اور تقابلی صوتیات کو

ملحوظ رکھا۔ اشتقاق کا اہتمام کیا۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ خود تو یہ لوگ اردو کی بعض اصوات کی درست ادائیگی سے قاصر تھے، اس لیے کہ ق، غ جیسے حروف اور دو چشمی ھ والے بیشتر الفاظ کے درست تلفظ کے اہل نہ تھے مگر اپنی ڈکشنریوں میں انھوں نے صوتی مخارج املا اور تلفظ کے بارے میں بطور خاص سعی کی۔ اس پر مستزاد یہ کہ الفاظ و محاورات کے استعمال کی مثالوں میں اشعار نقل کیے۔ الغرض انھوں نے مقامی لوگوں کو لغت نویسی کے فنی رموز سے آگاہ کیا۔ یہ درست ہے کہ بعد کے محققین نے ان پر اعتراضات کیے جو سب کے سب غلط بھی نہ تھے لیکن ہزاروں الفاظ پر مشتمل لغت میں چند الفاظ کی غلطیاں کوئی اتنا بڑا جرم نہیں اور اس نوع کے کام میں غلطیوں کا ہمیشہ امکان رہتا ہے۔ فرہنگ آصفیہ، نور اللغات، جامع اللغات، امیر اللغات اور دیگر اردو لغات پر بھی تو اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ جب زبان دانوں کا یہ حال ہے، تو پھر غیر ملکی تو قابل معافی ٹھہرے۔

فرہنگ آصفیہ پر قاضی عبدالودود کا سلسلہ مضامین اور جابر علی سید کا محاکمہ "نور اللغات" اور "جامع اللغات" پر مولوی عبدالحق کے تبصرے (تنقیدات عبدالحق) اور مرکزی اردو بورڈ کراچی کی لغت میں سے رشید حسن خان نے جس طرح کیڑے نکالے ہیں، یہ عبرت ناک ہے۔ یہ تو تھا اپنی زبان کا حال اور اہل زبان اور زبان دان حضرات کا کمال لیکن جب انگریزی میں کام کیا تو کیا ہوا؟ اس کا اندازہ اس مثال سے ہو جاتا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی "دی سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" (مرتبہ مولوی عبدالحق) پر ڈاکٹر تاثیر نے جو مضمون لکھا اور اس میں جس طرح سے اس ڈکشنری کا "ریکارڈ" لگایا گیا وہ قابل مطالعہ ہے ("نثر تاثیر" مرتبہ فیض احمد فیض) میرا مقصد ان کاموں کی وقعت کو کم کرنا نہیں، صرف یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ اس نوعیت کے بڑے اور مشکل منصوبے اغلاط سے پاک نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اردو دانوں کی ان مثالوں کے بعد اہل یورپ کی ابتدائی کاوشوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جانی چاہیے اور پھر جب "لغت نویسی کے مسائل" (مرتبہ: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ) میں شامل ان مقالات کا مطالعہ کریں جن میں لغت نویسی کی فنی مشکلات اور اس سے وابستہ اصولوں اور قواعد سے بحث کی گئی ہے تو اس کام کی مشکلات کا مزید اندازہ ہو جاتا ہے۔

حواشی

۱۔ ڈکشنری کا لاطینی ماخذ Dictionorious جس کا لغوی مطلب ذخیرہ الفاظ ہے جبکہ یونانی میں اس مفہوم کا لفظ Lexicon ہے۔ جبکہ Glossary بمعنی مختصر فرہنگ کا ماخذ یونانی Glossa بمعنی زبان یا لسانی ہے۔

۲-۳۔ فرہنگ آصفیہ۔

۴۔ سنسکرت میں لغت کو کوش کہتے ہیں۔ ہندی میں اس کے مترادفات ساگر، مالا اور سندھو ہیں۔

۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "قدیم اردو کی لغت"، ص ۷

۶۔ "اردو لغت کی باتیں" از ڈاکٹر سہیل بخاری مطبوعہ نقوش لاہور شمارہ ۱۲۰۰، جنوری ۱۹۷۶ء۔

۷۔ "اردو لغت کی باتیں" از ڈاکٹر سہیل بخاری حوالہ سابق

۸۔ ترجمہ سید سعید احمد۔ مطبوعہ سہ ماہی اردو نمبر ۳، ۱۹۷۵ء، یہ وہی محمد علی ہیں جنہوں نے علامہ اقبال پر سب سے پہلا فارسی مقالہ قلم بند کیا تھا۔

۹۔ "فارسی لغت کی تاریخ" حوالہ سابق

۱۰۔ "خالق باری" کے ضمن میں تحقیقی مباحث کے لیے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مقالہ "امیر خسرو اور خالق باری" مطبوعہ ہم سخن "امیر خسرو نمبر" جامع گورنمنٹ کالج کراچی، ۱۹۷۵ء۔ ۱۹۷۶ء سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

۱۱۔ اردو کے منظوم لغت مطبوعہ خیابان جنوری ۱۹۷۲ء۔

۱۲۔ "اردو زبان کے لغت" مطبوعہ ہندوستانی الہ آبادی جنوری ۱۹۳۱ء۔

۱۳-۱۴۔ صفحہ نمبر ۱۳۰۔

۱۵۔ "دربار اکبری" ص: ۶۸

۱۶۔ ایضاً، ۶۸

۱۷۔ برطانوی سفیر کیپٹن ہاکنز ۱۶۰۸ء میں جہانگیر کے دربار میں آیا ۱۶۱۵ء میں سورت میں تجارت کی اجازت ملی۔

۱۸۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مگرہ لاطینی زبان کا لفظ ہے "زبان اور اردو زبان" ص ۳۱

۱۹۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد "اردو زبان اردو میں مستشرقین کی علمی خدمت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" ص: ۱۳

۲۰۔ تذکرہ یورپین شعرائے اردو، ص: ۹۱

۲۱۔ "تنقیدات عبدالحق"، ص: ۱۹۳

۲۲۔ "یورپ میں اردو"، ص: ۵۰

۲۳۔ آغا افتخار حسین، "یورپ میں اردو"، ص: ۳۱-۱۳۰

۲۴۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد، "اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"، ص ۱۹۱-۱۸۰

۲۵۔ "اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب"، ص: ۹۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۰-۹۔

۲۷۔ "یورپ میں اردو"، ص: ۱۳۰

۲۸۔ عطش درانی، "اردو زبان اور یورپی اہل قلم" ص: ۲۳-۲۲۔

۲۹۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص: ۸۷

۳۰۔ ایضاً، ص: ۵۵

۳۱- گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص: ۵۳

۳۲- "افکار" برطانیہ میں اردو ایڈیشن، ۱۹۸۱ء۔

۳۳- یہ صفحات افکار کے برطانیہ میں اردو ایڈیشن میں مطبوعہ مقالہ بعنوان کے انگریز مصنفین از شانتی رنجن بھٹاچاریہ سے ماخوذ ہیں۔ آغا افتخار حسین کا مقالہ بھی اسی ایڈیشن میں شامل ہے۔

۳۴- ایضاً

۳۵- افکار، برطانیہ میں اردو ایڈیشن

۳۶- بقول سید احمد دہلوی "... کبھی فیلن جیسے لغت نگاروں کے اسسٹنٹ ڈکشنری بنے" (مقدمہ فرہنگ آصفیہ)

۳۷- جابر علی سید "کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ" ص: ۱۳۔

۳۸- کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ، ص: ۱۳

۳۹- وشو ورتھ کی Anglo Indian ڈکشنری میں جانسن جانسن کے الفاظ نہ ملے۔

ساتواں باب

اردو میں قواعد نگاری

جس طرح ہندوستانی ڈکشنری کی تدوین کے ضمن میں ابتدائی کام یورپین نے کیا، ایسا کام کہ ان میں سے بعض ڈکشنریاں تو ہمارے لیے اب بھی کار آمد ثابت ہو رہی ہیں، اسی طرح اردو قواعد نگاری میں بھی اولیں اور بعض امور کے لحاظ سے تو اساسی کام اہل مغرب ہی نے کیا۔ وجہ وہی زبان آموزی کے آلات کی تیاری۔ یہ عجب بات ہے کہ عربی، فارسی اور سنسکرت میں صرف و نحو کی روایت کے باوجود اردو زبان کی کبھی بھی کوئی قواعد نہ لکھی گئی۔ ادھر انگریزی میں یونانی اور لاطینی اثرات کے تحت گرامریں لکھی جاتی رہی تھیں جو نصاب کا حصہ ہوتی تھیں۔ اسی لیے جب گلکرسٹ نے ہندوستانی سیکھنے کا ارادہ کرتے ہوئے مقامی لوگوں سے استفسار کیا تو سب نے حیران ہو کر پوچھا کہ زبان سیکھنے کے لیے اہل زبان کو قواعد کی کیا ضرورت؟ اس جواب سے گلکرسٹ کس قدر متعجب ہوا ہوگا۔ اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ ادھر اہل زبان کی حیرت بھی بجا۔ اہل زبان تو خود زبان، روزمرہ، محاورہ اور تذکیر و تانیث میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔

ع: مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ابھی تک فارسی شامل نصاب تھی۔ علمی اور ادبی موضوعات پر کتابیں بالعموم فارسی ہی میں لکھی جاتی تھیں، اردو نثر برائے نام تھی۔ اگر اس زمانے تک کسی کو اردو قواعد لکھنے کا خیال نہ آیا تو یہ باعث تعجب نہ ہونا چاہیے کہ انھیں تو سرے سے قواعد کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ تھے حالات جن میں گلکرسٹ نے اردو قواعد لکھنے کا بیڑہ اٹھایا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب سے پہلی قواعد اس کے قلم سے نکلی تھی، ایسا نہیں۔ جس طرح لغت نویسی میں پرتگال، ہالینڈ اور فرانس کے باشندوں نے انگریزوں پر سبقت حاصل کی اسی طرح انگریزوں سے کوئی دو صدی قبل ہالینڈ والے قواعد نویسی کا آغاز کر چکے تھے۔

پہلی قواعد:

مولوی عبدالحق سے محمد عتیق صدیقی تک سبھی محققین متفق ہیں کہ ہالینڈ کا جان

ساتواں باب

اردو میں قواعد نگاری

جس طرح ہندوستانی ڈکشنری کی تدوین کے ضمن میں ابتدائی کام یورپین نے کیا، ایسا کام کہ ان میں سے بعض ڈکشنریاں تو ہمارے لیے اب بھی کارآمد ثابت ہو رہی ہیں، اسی طرح اردو قواعد نگاری میں بھی اولیں اور بعض امور کے لحاظ سے تو اساسی کام اہل مغرب ہی نے کیا۔ وجہ وہی زبان آموزی کے آلات کی تیاری۔ یہ عجب بات ہے کہ عربی، فارسی اور سنسکرت میں صرف و نحو کی روایت کے باوجود اردو زبان کی کبھی بھی کوئی قواعد نہ لکھی گئی۔ اُدھر انگریزی میں یونانی اور لاطینی اثرات کے تحت گرامریں لکھی جاتی رہی تھیں جو نصاب کا حصہ ہوتی تھیں۔ اسی لیے جب گلکرسٹ نے ہندوستانی سیکھنے کا ارادہ کرتے ہوئے مقامی لوگوں سے استفسار کیا تو سب نے حیران ہو کر پوچھا کہ زبان سیکھنے کے لیے اہل زبان کو قواعد کی کیا ضرورت؟ اس جواب سے گلکرسٹ کس قدر متعجب ہوا ہوگا۔ اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ اُدھر اہل زبان کی حیرت بھی بجا۔ اہل زبان تو خود زبان، روزمرہ، محاورہ اور تذکیر و تانیث میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔

ع: مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ابھی تک فارسی شامل نصاب تھی۔ علمی اور ادبی موضوعات پر کتابیں بالعموم فارسی ہی میں لکھی جاتی تھیں، اردو نثر برائے نام تھی۔ اگر اس زمانے تک کسی کو اردو قواعد لکھنے کا خیال نہ آیا تو یہ باعث تعجب نہ ہونا چاہیے کہ انھیں تو سرے سے قواعد کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ تھے حالات جن میں گلکرسٹ نے اردو قواعد لکھنے کا بیڑہ اٹھایا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب سے پہلی قواعد اس کے قلم سے نکلی تھی، ایسا نہیں۔ جس طرح لغت نویسی میں پرتگال، ہالینڈ اور فرانس کے باشندوں نے انگریزوں پر سبقت حاصل کی اسی طرح انگریزوں سے کوئی دو صدی قبل ہالینڈ والے قواعد نویسی کا آغاز کر چکے تھے۔

پہلی قواعد:

مولوی عبدالحق سے محمد عتیق صدیقی تک سبھی محققین متفق ہیں کہ ہالینڈ کا جان

جوشوا کیٹلر سب سے پہلی قواعد کا مؤلف ہے مگر تازہ تحقیقات کے مطابق یہ کام کیٹلر سے کوئی ایک صدی پہلے کیا جا چکا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بنجمن شلزے کی " ہندوستانی گرامر " کے مقدمے میں لکھتے ہیں "سولھویں صدی کے ان مصنفین میں ایک نام جیرونیموزز اوزر (Jeronimo xavier) کا ہے۔ جو حضرت عیسیٰ کے حواریوں (Companian of Jesus) کی تنظیم سے متعلق تھا اور جہانگیر کے دربار میں بھی پیش ہوا تھا۔ اس کا قیام آگرہ میں تھا۔ جہاں وہ ۱۵۸۶ء اور ۱۶۱۵ء کے درمیان موجود تھا۔ اس نے ہندوستانی فارسی لغت کا ایک مجموعہ مرتب کیا (یہ لغت اب دستیاب ہو گئی ہے اور زیر ترتیب تدوین ہے۔ حاشیہ مصنف) یہ ان کتابوں میں شامل ہے جو ۱۵۹۹ء سے قبل کی تصنیف ہیں۔ اس کا پورا نام یہ ہے۔ Vocabularium Portugalico Hindustano Persicum اس اعتبار سے اس کا شمار اردو کی قدیم ترین لغت اور قواعد اردو میں ہوتا ہے۔ ۱۶۰۰ء اور ۱۶۹۹ء کے درمیان مختلف مشنریوں نے بنگالی کنزمبی، کونکنی، مالا باری، سنسکرت، تامل اور سنگالی (سہالی) زبان میں مختلف رسالے لکھے۔ اس دور کا اردو کا ایک مشنری مصنف انیٹونیودمی سلوا Antionio de Saldhana تھا۔ اس کی وفات ۱۶۶۳ء میں ہوئی۔ اس نے دعاؤں کا ایک مجموعہ Rosas کے نام سے ہندوستانی زبان میں لکھا[۱] اور کونکنی کے لغات کا ایک رسالہ بھی مرتب کیا۔

اس کی ولادت باری (bari) میں ۱۶۱۵ء میں ہوئی اور یہ جماعت عیسوی (Society of iesus) میں ۱۶۳۱ء میں شامل ہوا۔ اس کی وفات ۳۰ اپریل ۱۶۸۳ء کو ہوئی۔ اس نے کونکنی اور دکھنی یعنی اردوئے قدیم کا ایک لغت لکھا جس میں لاطینی مترادفات بھی درج کیے۔ اس کے رسالے میں قواعد بھی ہے اور لاطینی کونکنی لغت کے علاوہ ایک پوری فصل دکھنی اور کونکنی بولیوں کی خصوصیات پر لکھی گئی ہے۔ اٹھارویں صدی کی ایک اور مشنری شخصیت فادر کاسیانوماسیراتا[۲] ہے۔ F.R. Cassiano de Macreata ان کی ولادت ۱۷۰۸ء میں ماسیراتا میں ہوئی تھی۔ ۱۷۳۸ء میں انھوں نے تبلیغ کے لیے تبت کا سفر کیا۔ ۱۷۴۸ء میں اٹلی کو واپسی ہوئی۔ تبت کا دوسرا سفر ۱۷۵۹ء میں کیا اور ۱۷۸۵ء میں ان کی وفات ہوئی۔ انھوں نے ہندوستانی زبان کی ایک قواعد (Grammatica Hindustana) کے نام سے لکھی۔ اس کا سنہ تالیف بعض حوالوں سے ۱۷۵۶ء ہے اور اس کا قلمی نسخہ موجود ہے"[۳]۔

قواعد اور اس کے ساتھ ساتھ لغت کے سلسلے میں آغاز کار ہالینڈ اور پرتگال کے

باشندوں نے کیا اور عہد جہانگیری سے اس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے قواعد نویسی کا مقصد اپنے ہم وطنوں کے لیے ہندوستانی سیکھنے کی سہولت پیدا کرنا تھا۔ بالفاظ دیگر یہ سب کچھ پہلے تجارتی اغراض کے لیے اور پھر حالات سازگار ہونے کی صورت میں انگریزوں کی مانند سیاسی مقاصد کے لیے تھا لیکن اردو زبان کے لیے اس کے ضمنی فوائد یہ ہوئے کہ اسی بہانے قواعد کی کتب مدون ہو گئیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جن اولین کتب کی نشاندہی کی، یہ سب مخطوطات کی صورت میں ہیں۔ ہم کیونکہ صرف انگریزی جانتے ہیں، اس لیے ہمارے محققین، ناقدین اور ماہرین لسانیات ہمیشہ برٹش میوزیم کا رخ کرتے ہیں اور وہاں سے بہت کچھ حاصل بھی کرتے ہیں لیکن ضرورت اب اس امر کی ہے کہ فرانس، جرمنی، اٹلی، ہالینڈ اور پرتگال وغیرہ کی لائبریریوں کو بھی کھنگالا جائے اور زبان و ادب کے بارے میں وہاں محفوظ مخطوطات کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ آغا افتخار حسین نے اس انداز کا مفید کام کیا ہے۔ یورپی زبانیں جاننے والے حضرات بھی تھوڑے وقت کی قربانی دے کر اس نوع کا قیمتی سواد تلاش کر سکتے ہیں۔ اردو زبان کی یہ بہت بڑی خدمت ہو گی۔ اس سلسلے میں ہمارے سفارت خانے بھی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اور مقامی سکالرز ٹرینڈری سرچ یا ریفرنسرز سے باسانی کام لیا جا سکتا ہے۔

ہندوستانی زبان: قواعد کی پہلی کتاب

اردو زبان کی سب سے پہلی قواعد جان جوشوا کوٹلر کی John Joshwa Ketelaer Lingua Hindustanica (1743) تسلیم کی جاتی ہے۔ اسے لاطینی زبان میں سمجھا جاتا رہا ہے لیکن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے جس مقدمے کا حوالہ دیا جا چکا ہے اس میں انھوں نے بجمی شلزے کے حوالے سے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ لاطینی میں نہیں، ڈچ میں تھی" تاہم عام طور پر اسے لاطینی ہی میں سمجھا جاتا رہا ہے، حتیٰ کہ تازہ ترین تالیف کتابیات قواعد اردو (۱۹۸۵ء) میں بھی اسے لاطینی کتابوں میں درج کیا گیا ہے (ص ۸۷)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود ایک زمانے تک ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی یہی سمجھتے رہے ہیں چنانچہ انھوں نے اپنی جامع القواعد (حصہ صرف) (لاہور ۱۹۷۱ء) میں بھی کچھ لکھا ہے ص (۱۵۳)۔ جہاں تک اس کے لاطینی یا ڈچ میں ہونے کا تعلق ہے تو آغا افتخار حسین کے اس بیان سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ "اس کتاب کا اصل مسودہ ولندیزی

زبان میں ہے اور ابھی تک ہیگ (Hague) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کا ترجمہ ڈیوڈ مل نے کیا اور اپنی کتاب Miscellanea Orientalia میں شامل کر کے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ کوٹلر کی کتاب اس ترجمہ کے ذریعے منظرِ عام پر آئی۔[20] گویا اصل مسودہ ڈچ زبان میں تھا اور مطبوعہ ترجمہ لاطینی میں۔

کوٹلر کے بارے میں مختلف ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کے بموجب یہ پرشیا کے شہر Elbing میں ۱۶۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ عقیدے کی رو سے پروٹسٹنٹ تھا۔ ڈنمارک کے دربار سے وابستہ تھا اور آج کی اصطلاح میں اسے کیریئر ڈپلومیٹ کہا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں بجمن شلزے کی ہندوستانی گرامر کے پیش لفظ سے کوٹلر کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ "ڈنمارک کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے مغل اعظم کے دربار میں سابق سفیر تھے۔[21]

جس زمانے میں وہ آگرہ میں مقیم تھے، انھوں نے ہندوستانی زبان کے باب میں اپنے مشاہدات ڈچ زبان میں قلمبند کیے۔ یقیناً انھیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے اس زبان کو مشرقی زبانوں کے ماہر مستشرقین سے متعارف کروایا اور ان کی توجہ کا مرکز بنایا اور اس طرح ایک مبسوط رسالے کی تالیف کے لیے راہ ہموار کر دی جسے اب میں نے اضافہ کر کے مرتب کیا ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہی فاضل مصنف ہندوستانی الفاظ کو فارسی رسم الخط میں بھی تحریر کر گئے ہوتے اور کچھ امور اس کے تلفظ کے باب میں لکھ گئے ہوتے" (ص ۳۰)۔

سفارتی ذمہ داری کے بعد کوٹلر کو ۱۷۱۲ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی امور کا نگران (ڈائریکٹر) بنا دیا گیا، اسی حیثیت سے اس نے تیس برس کام کیا۔ سفارتی اور تجارتی امور کے ضمن میں اسے ہندوستان کے کئی علاقے دیکھنے کا موقع ملا چنانچہ وہ لاہور تک آچکا تھا جبکہ مغل دربار سے تعلق کے دوران دہلی اور آگرہ میں رہ چکا تھا۔ غالباً اہلِ زبان سے روابط کی بنا پر ہی اس نے اردو زبان سیکھی ہوگی۔ مولوی عبدالحق کی بموجب ہندوستانی قواعد اس نے ۱۷۱۵ء میں سورت میں تالیف کی۔ اس کی قواعد سے نصف صدی پیشتر بھی اس نوع کا کام ملتا ہے لیکن مخطوطات کی صورت میں جبکہ کوٹلر کی قواعد طبع ہو چکی ہے۔ بجمن شلزے کے بقول یوٹریکٹ (Utract) میں السنۂ شرقیہ کی متبرک تحقیقات کے پروفیسر ڈیوڈ ملینو (David Millino) نے "اپنے متفرقات بابت (۱۷۴۳)" میں اسے شائع کرایا تھا[22]۔ اس کا انتقال ۱۷۱۸ء میں ایران میں ہوا جہاں اسے سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ اگرچہ گریرسن کے حوالے

سے اس کی موت کا سبب بخار بتایا جاتا ہے لیکن آغا افتخار حسین کے بموجب ۱۷۱۶ء میں اسے ایران کا سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا اور جب ۳ برس کی ملازمت کے بعد "اصفہان سے واپس آرہا تھا تو راستے میں ایرانی گورنر نے اس سے خواہش کی وہ ولندیزی جہاز کو بعض عرب حملہ آوروں کے مقابلے میں اس کے ساتھ ہو کر لڑنے کی اجازت دے۔ کوٹلر نے اس سے انکار کیا، اس پر ایرانی حاکم نے اسے قید کر لیا۔ قید میں اس نے دو ہی روز گزارے تھے کہ اس کا انتقال ہو گیا(۶)"۔ وجہ بخار بتائی گئی لیکن یہ قیاس شاید مبالغہ آمیز نہ ہو کہ کوٹلر کی موت بخار سے نہیں بلکہ زہر خورانی سے ہوئی ہو گی۔ سیاسی قتل کا یہ آسان اور محفوظ ترین طریقہ سمجھا جاتا ہے۔

ہندوستانی گرامر: قواعد کی دوسری کتاب

کوٹلر کی اردو کی پہلی قواعد کی اشاعت کے صرف ایک سال بعد جرمن مشنری بنجمن شلزے Benjamin Schultz یا Schulzino نے قواعد کی دوسری کتاب تالیف کی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس کا ترجمہ کر کے تحقیقی مقدمہ اور حواشی کے ساتھ شائع کرا دیا ہے۔ کوٹلر کے برعکس بنجمن شلزے مشنری تھا۔ ڈنمارک کے بادشاہ نے اسے کرناٹک کے دربار میں بھیجا تھا۔ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے مدراس میں مشن کی بنیاد اسی نے رکھی تھی۔ ۳۰ جون ۱۹۳۱ء کو قواعد پر لکھے گئے پیش لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قواعد کی تالیف سے ۱۲ سال قبل یعنی ۱۷۲۹ء میں وہ تلگو زبان (جس کا ایک نام وہ وردگی بتاتا ہے) کے مبادیات پر ایک مختصر رسالہ قلم بند کر چکا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہندوستان کی زبانوں پر تحقیق کر رہا تھا۔ شلزے اول سے آخر تک مشنری ہے چنانچہ تلگو پر ابتدائی کام یا ہندوستانی گرامر کی تالیف خالص مذہبی جذبے کے تحت تھی۔ وہ سمجھتا ہے کہ (مغل اعظم کی) سلطنت میں بولی جانے والی یہ ایک مقبول زبان ہے۔ اس لیے مقامی آبادی سے گفتگو اور تبلیغ کے لیے اس کا جاننا ضروری ہے۔ اس عہد کے عام مشنریوں کی مانند وہ خاصا متعصب معلوم ہوتا ہے اور اس میں مذہبی رواداری نام کو بھی نہیں۔ وہ یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو Pagan (کافر) قرار دیتے ہوئے ان کے لیے راہ نجات مسیحیت میں دیکھتا ہے۔ (ص: ۳۰) یہ ہے تو گرامر کی کتاب لیکن ایک مشنری کی نفسیات کے مطالعے کے نقطہ نظر سے اس میں خاصا مواد مل جاتا ہے۔ قواعد کے نکات سمجھانے کے لیے بھی مسیحیت کی مثالیں

پیش کرتا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے چند مثالیں پیش ہیں:۔

"جنت ڈھونڈنے کے واسطے اللہ ہمنانوں عقل دیے اسے ناہوں کو انجیل کوں فرمائے" (ص ۱۲۹)۔

اسی طرح ضمیمہ مسیحی دعائیں اور Ten Commandments دیا گیا ہے (ص ۱۳۰ - ۱۳۴) اسم نکرہ کی مثالیں عہد نامہ عتیق، عہد نامہ جدید کے اسما میں سے ہیں (ص ۱۳۴) اور یہ فقرہ تو یقیناً پر خشونت پادری کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے:

"حرامی عاجزی کیے تو بھی خداوند اوسے قبول کرتے نہیں" (ص ۱۱۲)

بنجمن شلزے جنوبی ہند میں کرناٹک اور مدراس میں قیام پذیر رہا، اس لیے اس نے دکھنی زبان لکھی ہے۔ واضح رہے کہ اٹھارویں صدی کے وسط تک دکھنی میں زبان اور ادب خاصی ترقی کر چکے تھے۔ نثر میں ملا وجہی کی سب رس (۱۶۳۵ء) لکھی جا چکی تھی۔ دکھنی ادب کی بعض اہم مثنویاں قلم بند کی جا چکی تھیں جیسے ابن نشاطی کی پھول بن، غواصی کی طوطی نامہ اور سیف الملوک، نصرتی کی گلشن عشق اور ہاشمی کی یوسف زلیخا وغیرہ۔ جبکہ ولی جیسا شاعر دہلی میں غزل کی شمع فروزاں کرنے کے بعد وفات (۱۷۲۵ء) پا چکا تھا۔ الغرض جس زمانے میں شلزے دکن میں تھا، وہ دکنی ادب کے عروج کا زمانہ تھا لیکن مشنری ہونے کی بنا پر اسے "کافروں" کے ادب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسی لیے اس کی گرامر میں اشعار یا تخلیقی نثر کی مثالیں نہیں ملتیں تاہم اس گرامر کا ایک فائدہ یہ ہے کہ بطور مثال دیے گئے الفاظ اور فقرات کی صورت میں اس زمانے کی عام بول چال کی زبان کے متعدد الفاظ قدیم املا میں مل جاتے ہیں۔ ایک اور اضافی خوبی مسیحی دعاؤں کے تراجم ہیں، ایسے تراجم اردو میں ترجمہ کی غالباً اولین مثال قرار دیے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک اس کے لسانی مطالعہ کا تعلق ہے تو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مقدمہ اور تعلیقات میں اچھا تجزیہ کیا ہے۔ یہ کتاب مدراس میں لکھی گئی تھی مگر لاطینی سے انگریزی ترجمہ کرنے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں، حتیٰ کہ مترجم کا نام تک بھی معلوم نہیں۔ ۱۷۴۵ء میں بمقام حال جہاں سکینی طبع کی گئی۔ انگریزی ترجمہ کا مکمل نام یوں ہے:۔ "A Grammer of the Hindustani Language"

جبکہ لاطینی نام یہ تھا: "Grammatica Indostanica"

انگریز قواعد نویس:

اٹھارہویں صدی کی چوتھی دہائی میں لکھی جانے والی قواعد کی ان کتابوں کے بعد یورپین اقوام کے اہل علم ہندوستانی قواعد سے دلچسپی ظاہر کرتے رہے ان کی تحریر کردہ قواعد کی کتابوں کے حوالے گریئرسن وغیرہ کے ہاں مل جاتے ہیں۔ ان سے صرف نظر کرتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازمین کی تحریر کردہ کتب قواعد کا جائزہ لینے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس معاملے میں انگریز کوئی بہت زیادہ پیچھے نہیں رہے۔ محمد عتیق صدیقی نے اس ضمن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک سول ملازم گلکشی کے رسالہ قواعد کا ذکر کیا ہے جو گورنر وشی ٹارٹ (vansittart) کا سیکرٹری اور فارسی مترجم تھا اور ایک فساد کے دوران ہلاک ہو گیا تھا۔ "ہندوستانی زبان کے قواعد پر اس نے انگریزی میں ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا۔" ۱ بقول محمد عتیق صدیقی "اس نے میدان میں پہل کی۔" اگرچہ نہ اس کے لکھنے کی تاریخ معلوم ہے اور نہ ہی یہ کبھی طبع ہوا۔ البتہ گلکرسٹ نے "اس مقالے کی بے حد تعریف کی۔" ۲

برطانوی مستشرقین کا باوا آدم:

ڈاکٹر رضیہ نور محمد نے ہیڈلے کو "برطانوی مستشرقین کا باوا آدم" قرار دیتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا: "اس نے سنجیدہ علمی تحقیق کی جو داغ بیل ڈالی وہ آئندہ آنے والوں کے لیے رہنمائی کا باعث ہوئی۔ قدماء میں بھی اس کی اہمیت مسلم ہے جب بھی قواعد نویسی کی تاریخ لکھی جائے گی۔ اس میں کیٹلر اور شلزے کے بعد ہیڈلے کا ذکر ناگزیر ہوگا۔" ۳ مختلف ذرائع سے ہیڈلے کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کے مطابق یہ ۱۷۶۳ء میں بنگال میں فوج سے منسلک ہوا۔ ۱۷۶۶ء میں کپتان بنا دیا گیا۔ ۲۳ نومبر ۱۷۷۱ء کو ملازمت سے فارغ ہونے کے لیے درخواست کی اور انگلینڈ آ گیا۔ ہیڈلے اور اس کے ماتحت سپاہیوں نے ہندوستانی سے عدم واقفیت کی بنا پر خاصی دقت محسوس کی ہوگی چنانچہ خود آموزی کے لیے اس نے ایک قواعد مرتب کر لی اور پھر ۱۷۶۵ء میں سپاہیوں کے لیے قواعد تیار کر لی جو ۱۷۷۰ء میں لندن سے طبع ہوا۔ دو سال بعد نظر ثانی شدہ ایڈیشن طبع

ہوا۔ اس کے بعد ۱۷۷۳ء، ۱۷۷۹ء، ۱۷۹۳ء، ۱۷۹۷ء، ۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۹ء تک اس کے ایڈیشن چھپتے رہے۔ یقیناً یہ اس عہد کی بیسٹ سیلر قواعد تھی۔ میرے خیال میں اتنی زیادہ مقبولیت کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اس نے ہندوستانی سیکھنے والے انگریزوں کے لیے نصابی حیثیت اختیار کر لی ہوگی۔ لندن سے بار بار چھپنے کا بھی یہی باعث ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرنے والے انگریز زباندانی کے لیے اس سے استفادہ کرتے ہوں گے۔ کتاب کا مکمل نام یہ ہے: "A compandious grammer of the current dialect of jorgan of hindustan" ۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۹ء کے ایڈیشن ہیڈلے کی وفات کے بعد چھپے تھے۔ مرزا محمد فطرت لکھنوی نے ۱۸۰۲ء والے ایڈیشن میں اضافے اور تصحیح بھی کی تھی چنانچہ اس ایڈیشن کے سرورق پر ہیڈلے کے ساتھ فطرت لکھنوی کا نام بھی درج ہے۔ ا قواعد کے اردو الفاظ فارسی رسم الخط میں درج کیے گئے ہیں۔ اگرچہ بعد میں آنے والے مصنفین نے اس قواعد پر کچھ اعتراضات بھی ظاہر کیے ہیں کہ اس نوع کے ابتدائی کام میں کچھ نہ کچھ اغلاط تو رہ جاتی ہیں تاہم انگریزی زبان میں پہلی باضابطہ قواعد ہونے کی بناء پر یہ تاریخی اہمیت کی حامل رہے گی۔

گلکرسٹ کی قواعد:

لغت کے ضمن میں ڈاکٹر گلکرسٹ کے بارے میں لکھا جا چکا ہے۔ یہاں اس کی قواعد کا ذکر مطلوب ہے جو پہلی مرتبہ کلکتہ سے ۸ مئی ۱۷۹۶ء اور دوسری مرتبہ ۱۸۰۹ء میں طبع ہوئی۔ پہلے ایڈیشن کے دو برس بعد اس نے اپنی لغت اور قواعد کا ضمیمہ the appendex بھی کلکتہ سے طبع کروایا۔ گلکرسٹ کی قواعد انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی۔ کتاب کے سرورق کی نقل پیش ہے جس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ گلکرسٹ نے ہندوستانی لسانیات پر تین جلدوں میں کام کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ (پہلا حصہ لغت دوسرا حصہ لغت و قواعد کا ضمیمہ اور تیسرا حصہ قواعد)۔

A GRAMMER OF THE
HINDUSTANEE LANGUAGE
OR PART THIRD OF
VOLUME FIRST
OF A SYSTOM OF
HINDUSTANEE LANGUAGE

BY JOHN GILCHRUST

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ میرے منہ میں زباں ہے
میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو
اللہ ہی اللہ کیا نظم و بیاں ہے

ہر جا کہ سہو خطائے واقع شود بذیل کرم
بپوشند و قلم اصلاح براں جاری دارند۔

CALCUTTA
PRINTED AT THE CHORINICAL
PRESS MDCCXCVI (11)

گلکرسٹ کی ہندوستانی زبان کی قواعد خاص ضخیم تھی اور طلباء کو اس سے استفادے میں دقت ہوتی تھی۔ اس لیے بہادر علی حسینی نے اس کی تلخیص کر کے اسے رسالہ گلکرسٹ کا نام دیا۔ اگرچہ بالعموم اس کا سال اشاعت ۱۸۱۶ء (کلکتہ) بتایا جاتا ہے۔ مگر خلیل الرحمن داؤدی نے کتاب کا جو سرورق شائع کیا ہے۔ اس پر ۱۸۲۰ء (کلکتہ) درج ہے۔ انھوں نے اسے پہلا ایڈیشن قرار دیا ہے۔ (۱۲)

شامل نصاب ہونے کی بناء پر یہ متعدد مرتبہ طبع ہوئی ۱۸۳۱ء، ۱۸۳۶ء، اور ۱۸۶۳ء میں کلکتہ سے جب کہ ۱۸۴۵ء میں آگرہ سے۔

شلزے کی قواعد کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ امر بطور خاص ابھار کر گیا تھا کہ اگرچہ اس کے قیام کے وقت دکنی ادب کی جملہ اصناف میں اہم تخلیقات معرض وجود میں آ چکی تھیں لیکن اس نے نثری ادب یا شاعری سے مثالیں دینے کی ضرورت محسوس نہ کی، شاید اس لیے کہ وہ مشنری تھا اور اسے دیگر لٹریچر سے کسی طرح کی دلچسپی نہ ہوئی۔ اس کے برعکس گلکرسٹ کی قواعد ایک صاحب ذوق اور شعر و ادب کے دلدادہ شخص کی تحریر معلوم ہوتی ہے

اور کیوں نہ ہو کر زبان سیکھنے کے لیے اس نے فیض آباد کے دوران قیام ہندوستانی وضع اپنا کر داڑھی بھی رکھ لی۔ زبان سیکھنے میں اسے جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، اس نے ان کا بیان کیا ہے لیکن یہ بھی لکھتا ہے کہ صحیح معنوں میں زبان کلیات سودا سے سیکھی تھی۔ یہ معنی خیز امر گلکرسٹ کے شعری ذوق کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ ایک غیر ملکی کے لیے سہل اسلوب کی بنا پر کی شاعری مرغوب خاطر ہونی چاہیے تھی لیکن گلکرسٹ میر کے مقابلے میں نسبتاً مشکل شاعر سودا کو پسند کرتا ہے، اس کا ایک باعث سودا کا شاعرانہ لہجہ بھی ہو سکتا ہے جس میں ایک خاص قسم کا جلال اور اسلوب میں شکوہ لفظی ہے۔ اگر یہ محض شعری ذوق کا مسئلہ نہ تھا تو پھر سیدھی سی بات یہ ہوگی کہ میر کے مقابلے میں سودا کی غزل میں ذخیرہ الفاظ نسبتاً زیادہ ہے اور زبان سیکھنے والے غیر ملکی کو اس کی غزل سے زیادہ الفاظ مل سکتے ہیں۔ گلکرسٹ کو سودا سے جو عقیدت تھی، اس کا اظہار گرامر کے سرورق سے بھی ہو جاتا ہے۔ وجہ کچھ بھی کیوں نہ ہو لیکن اتنا طے ہے کہ سودا، گلکرسٹ کا پسندیدہ شاعر تھا اور یہ شعری ذوق ہی ہے جس کی بنا پر عام انگریزوں کی قواعدوں کے مقابلے میں گلکرسٹ کی قواعد نمایاں تر ہو جاتی ہے کہ اس نے قدم قدم پر اشعار کی مثالیں پیش کی ہیں اور شعراء بھی کیسے کیسے۔ ولی، آبرو، یقین، حاتم، قائم متقدمین میں سے جبکہ متاخرین میں سے اس کے معنوی استاد سودا کے ساتھ ساتھ درد، سوز اور میر حسن کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ ان پر مستزاد ۸۱ بندوں پر مشتمل عبداللہ مسکین کا مکمل مرثیہ جو مختلف مثالوں کی صورت میں نقل ہو گیا۔ قواعد کے اختتام پر اردو کے ان ۳۱ صاحب دیوان شعرا کے اسما درج ہیں جن کے مطالعے سے انگریز طلبہ اپنی زبان بہتر بنا سکتے تھے۔ یہ شعرا ہیں: ولی، سودا، میر، درد، فغاں، آبرو، مظہر، جان جاناں، یقین، تاباں، حاتم، سوز، عشق، بیان، حسن، قدرت، ناجی، عیش، مسکین، سکندر، جرات، محمد، قائم، دردمند، افضل، انجام، جعفر، ذکی، امین، جوشش، ذکی اور بیدار (ص ۳۱) اس کا مطلب یہ ہوا کہ گلکرسٹ ان سب شعراء کے کلام سے واقف تھا اور اسی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اردو شاعری کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا اور زبان شناسی کے لیے شاعری کا کتنا قائل تھا۔ لونی نقطہ نظر سے اس کتاب کی اضافی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شیکسپیئر کے دو ڈراموں کے مکالمات کے ہندوستانی میں تراجم بھی درج کیے گئے ہیں۔ الغرض گلکرسٹ کی ہندوستانی زبان کے قواعد اس کے ماہر لسانیات ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب سے دلچسپی کی مظہر بھی ہے۔

اٹھارھویں صدی میں قلم بند کی گئی، قواعد کی ان کتابوں کی شاید آج اہمیت نہ ہو لیکن اس زمانے کے لحاظ سے یہ قابل قدر ہیں اور ان یورپین اور انگریزوں نے زبان آموزی

کے ساتھ ساتھ زبان کی قواعد مرتب کر کے آنے والے اہل قلم کے لیے جادہ تراشی کی۔
انیسویں صدی میں یہ کام جاری رہا اور قواعد کی کتابوں کی مقدار میں اضافہ ہوتا گیا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری کی "کتابیات قواعد اردو"۔

دریائے لطافت

انیسویں صدی میں اہل یورپ کے ساتھ ساتھ برصغیر کے اہل قلم نے بھی قواعد نویسی کی طرف رجوع کیا، اس ضمن میں اولیت انشاء کی "دریائے لطافت" کو حاصل ہے جو ۱۸۰۷ء میں لکھی گئی۔
"آب حیات" میں مولانا آزاد نے انشاء کا جو خاکہ لکھا ہے، اس سے وہ ایک بے فکرا، بانکا، لطیفہ گو، عجیب و غریب اور لوگوں کو اچنبھے میں مبتلا کرنے والا شاعر نظر آتا ہے حالانکہ انشاء میں جتنی صلاحیتیں تھیں، اگر وہ زوال پذیر لکھنؤں کے مردہ دربار سے وابستہ نہ ہوتا اور بہتر حالات میں جنم لیا ہوتا تو اپنی متنوع ذہنی دلچسپیوں کی بنا پر آج وہ شاعر کے ساتھ ساتھ ماہر لسانیات کے طور پر بھی مشہور ہوتا۔ جو شخص نصف درجن زبانیں جانتا ہو "رانی کیتکی کی کہانیاں" اور "دریائے لطافت" لکھ سکتا ہو، وہ محض عامیانہ غزلوں اور ریختی تک کیسے محدود ہو سکتا ہے۔
انیسویں صدی میں اہل پنجاب نے بھی اردو قواعد نویسی کی طرف توجہ کی۔ مولوی نور احمد چشتی (م ۱۸۶۷ء) نے ۱۸۵۴ء میں پادری جان جنٹر مارسن کے لیے تحفۂ چشتی کے نام سے اردو قواعد لکھی ہے۔ اس قواعد کو پنجاب میں اردو کی پہلی قواعد کا درجہ حاصل ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن پنڈت اجودھیا پرشاد کے فرزند پنڈت جس ناتھ مشتاق کے زیر اہتمام مطبع لاہور گزٹ نے ۲۱۔ مارچ ۱۹۵۴ء کو شائع کیا۔ تفصیلی کوائف ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی تصنیف "لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات" میں موجود ہیں۔
ڈاکٹر صاحب نے اس کے اسلوب نگارش کے بارے میں لکھا ہے:

> تحفۂ چشتی اردو میں فنی اور دستوری (مراد ہے قواعدی) نثر کا خوبصورت نمونہ ہے۔ گرامر کے پیچیدہ اور خشک مطالب کو سلیس، عام فہم اور مترنم زبان میں ادا کرنا مولوی نور احمد چشتی کے کمال فن کا مظہر ہے۔ زبان کا معیار اور اظہار کا حسن کسی جگہ بھی مجروح نہیں ہونے دیا اور جگہ جگہ اردو اشعار کی مثالیں دے کر موضوع کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔ (۳)

حواشی

۱۔ قلمی نسخہ موجودہ کتب خانہ سینٹ لزبن (St. LisBoA-Bn.) حاشیہ مصنف
۲۔ "ہندوستانی گرامر" ص: ۳-۴
۳۔ "یورپ میں اردو" ص ۱۳۱
۴۔ بہ عہد بہادر شاہ اول اور جہاندار شاہ ۱۲-۱۷۰۸ء
۵۔ "ہندوستانی گرامر" ص ۳۱۱
۶۔ "یورپ میں اردو" ص ۱۳۵
۷۔ "گلکرسٹ اور اس کا عہد" ص ۵۱
۸۔ ایضاً ص ۵۲
۹۔ اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" ص ۴۷
۱۰۔ "قواعد اردو زبان" مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی، ص ۳۷
۱۱۔ ایضاً ص ۳۷
۱۲۔ ایضاً ص ۵۰
۱۳۔ لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات ص ۲۷، ۲۳ مطبوعہ مرکزی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور دسمبر ۱۹۹۳ء۔

آٹھواں باب

اردو میں تراجم اور وضع اصطلاحات

مستعار روشنی

ترجمہ مستعار روشنی ہے۔ زبان جن علوم سے ناآشنا اور جن فنون کے رموز سے ناواقف ہوتی ہے۔ تراجم سے یہ کمی پوری کی جاتی ہے۔ کسی زبان کی بلند پایہ، رجحان ساز اور آفاقی اہمیت کی تخلیقات کو اپنی زبان میں اس لیے منتقل کیا جاتا ہے تاکہ ماںگے کے اجالے سے اپنا تخلیقی منظر نامہ منور کیا جاسکے۔ ترجمے کو مستعار روشنی یا ماںگے کا اجالا کہنے کا مطلب اس کی اہمیت کو کم کرنا اور اس کی ضرورت سے انکار نہیں۔ صرف اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود تھا کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی ضروری اور کامیاب کیوں نہ ہو، اصل زبان کے مقابلے میں ترجمہ کی گئی زبان میں وہ ماںگے کا اجالا ہی رہے گا۔

مختلف اقوام میں لین دین کا جو عمل جاری رہتا ہے، اس کی معروف صورت تجارت اور درآمد و برآمد ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بھی اقوام میں لین دین کا ایک اور عمل جاری رہتا ہے جو تہذیبی اور تخلیقی سطح پر ہوتا ہے اگرچہ درآمد و برآمد کی مانند اس کا واضح اور شعوری احساس نہیں ہوتا لیکن یہ بھی اتنا ہی اہم بلکہ بعض امور کے لحاظ سے تو کہیں زیادہ اہم اور دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوتا ہے کہ اس تہذیبی لین دین کے سلسلے میں اشیا اور الفاظ سے لے کر خیالات اور تصورات تک سب کی درآمد اور برآمد ہوتی ہے۔ آج بین الاقوامیت کے باعث اس عمل میں بہت تیزی نظر آتی ہے۔ تراجم نے بلاشبہ اب ایک بین اللسانی فن اور بین الاقوامی ضرورت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کا افادی پہلو اقوام متحدہ میں تقریر کے فوری تراجم اور مختلف زبانوں میں رپورٹوں کے تراجم سے واضح ہو جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کا مجلہ "پیامی" اور اس کے ساتھ ساتھ "ریڈرز ڈائجسٹ" متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے اشاعتی ادارے بھی مختلف زبانوں کے تراجم طبع کرتے رہتے ہیں جو علمی

اور تحقیقی ہر دو نوعیت کے ہوتے ہیں۔ یورپ کی مختلف حکومتوں نے بھی تراجم کے مراکز قائم کر رکھے ہیں۔

تراجم انفرادی شوق اور شخصی سعی سے بڑھ کر ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہو چکے ہیں یعنی کمپیوٹر کے ذریعے تراجم کیے جا رہے ہیں۔ اصطلاحات اور متن کے تراجم کے لیے (Computor aided translation) پر انحصار میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، یعنی تراجم کے کام میں بین الاقوامی سطح پر رابطہ پیدا کرنے اور معلومات و کوائف کا تبادلہ کرنے کے لیے انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور بعض دیگر زبانوں میں تراجم کے لیے وقف جرائد بھی شائع ہو رہے ہیں۔ مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہوں "مغربی ممالک میں ترجمہ کے قومی اور عالمی مراکز" از عطش درانی۔ (اسلام آباد ۱۹۸۶ء)۔

لسانی لین دین۔

اگرچہ قدیم دور کے مترجمین کو جدید ٹیکنالوجی کی سہولت حاصل نہ تھی لیکن ذرائع نقل و حمل کی دشواریوں کے باوجود تہذیبی لین دین کا یہ عمل کسی نہ کسی طور پر جاری رہتا تھا۔ جس کا دیگر امور کے ساتھ لسانی سطح پر بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ لسانی سطح پر اس کا مظاہرہ ایک زبان سے مختلف زبانوں کے الفاظ، اصطلاحات اور محاورات کی صورت میں ملتا ہے اور یہ صرف اردو ہی سے مخصوص نہیں بلکہ دنیا کی تمام بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں میں لسانی لین دین کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ کبھی زبان کے حروف تہجی کی بنا پر وہ الفاظ بعینہٖ رہ جاتے ہیں تو کبھی زبان بولنے والوں کے آلات سماعت اور آلات نطق کی مخصوص نوعیت کی بنا پر آواز اور انداز بدل کر کچھ کے کچھ بن جاتے ہیں چنانچہ مفرس، معرب اور مہند جیسی اصطلاحات اس کی غماز ہیں اور اشتقاقیات نے لسانی مباحث میں جو اتنی اہمیت حاصل کر لی ہے، وہ بھی اسی باعث ہے اور دخیل الفاظ اور غریب الفاظ جیسے مباحث بھی اسے لیے معرض وجود میں آئے۔

کیا کوئی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ انگریزی کی معروف صنف essay کا نام فرانسیسی کی بجائے عربی الاصل ہے۔ فرانس کے مونتین نے جب اپنی تحریروں کو ۱۵۸۰ء میں "assai" کے نام سے شائع کیا تو فرانسیسی زبان میں نئی صنف اور ادبی اصطلاح معرض وجود میں آ گئی بقول محمد ارشاد دراصل یہ "فرانسیسی زبان کا لفظ نہیں بلکہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں سعی کے معنی کوشش اور کوشش کرنا کے ہیں۔" یہی assai کے بھی بیان کیے جاتے ہیں۔

سو نتیین جنوبی فرانس کا رہنے والا تھا اور جنوبی فرانس میں بولی جانے والی بولی میں عربی الفاظ کی بہتات ہے۔ جنوبی فرانس عربوں کی نوآبادی رہ چکا ہے اور محققین نہ صرف وہاں کی زبان پر عربی زبان کے اثرات تسلیم کرتے ہیں بلکہ گستاؤلی بان وہاں کی آبادی کو بھی عربی الاصل بتاتا ہے۔[1] اسی طرح والٹیر کی تصنیف "zadig" دراصل عربی لفظ صدیق ہے۔[2] اس انداز کی لاتعداد مثالیں عالمی ادبیات سے تلاش کی جاسکتی ہیں۔

تہذیبی لین دین۔

جس طرح لسانی سطح پر الفاظ کا لین دین ہوتا ہے، اسی طرح تہذیبی سطح پر خیالات، تصورات، علوم و فنون، دانش و حکمت اور معلومات و کوائف کا لین دین بھی ترجمے کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ آج ہی سے نہیں بلکہ صدیوں پہلے سے تراجم ملتے ہیں چنانچہ اہل علم بادشاہوں کے ضمن میں مؤرخین یہ بھی بتاتے ہیں کہ انھوں نے غیر ملکی زبانوں کے ماہرین کو اپنے دربار میں بلوایا اور ان سے تراجم کرائے وہ خلیفہ بغداد ہوں یا اندلس کے حکمران یا ہندوستان کے مغل شہنشاہ، سب نے اہم علمی و ادبی کتابوں کے تراجم کرائے۔ چنانچہ آج یونانی لاطینی عبرانی، سنسکرت جیسی زبانوں کے علمی ذخائر جو محفوظ رہ گئے، تو اس کا ایک بڑا باعث مسلم بادشاہوں کی علم دوستی اور تراجم میں دلچسپی بھی ہے۔ آج کے یورپ کے لیے اگر یونانی فلسفہ اور رومی دانش محفوظ رہ گئی، تو یہ صرف عربی تراجم کی بدولت ممکن ہوا۔ چنانچہ گستاؤلی بان کے بموجب "قدمائے یونان کی تصانیف کا علم، ان کے عربی ترجمے ہی کے ذریعے سے پھیلاتھا، ان ہی ترجموں کی بدولت وہ تصانیف قدیم ہم تک پہنچی ہیں جن کی اصلیں بالکل تلف ہو گئیں --- صرف عربوں کی بدولت، نہ کہ ان راہبوں کی وجہ سے جو زبان یونان کا نام بھی نہیں جانتے تھے، تصانیف قدیم ہم تک پہنچی ہیں اور دنیا کو ان کا ممنون رہنا چاہیے کہ انھوں نے ذخیرہ بے بہا کو تلف ہونے سے بچایا۔ موسیولی بری لکھتے ہیں کہ اگر عربوں کا نام تاریخ میں سے نکال دیا جائے تو یورپ کی علمی نشاۃ الثانیہ کئی صدی تک پیچھے ہٹ جاتی ہے۔[3]

گستاؤلی بان جیسے دیگر غیر متعصب محققین جیسے گب، ختی، آربری، سب نے اس نوع کی کاوشوں کو کھلے دل سے سراہا ہے۔

ادھر ہندوستان میں اکبر پہلا مغل بادشاہ ہے جس نے باقاعدہ دارالترجمہ قائم کر کے

دیگر زبانوں کے تراجم، عربی اور فارسی میں کرائے۔ ملاحظہ ہو ابوالفضل کی "آئین اکبری" جلد اول (۱۹۹۴-۱۹۹۱ء) اور مولانا محمد حسین آزاد کی "دربار اکبری" (ص ۱۸-۱۱۵) جس میں ترجمہ شدہ کتب کی تفصیلات درج ہیں۔

مغرب مشرق کے زیر اثر

یہ تسلیم کہ مغرب نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے مشرق پر سیاسی تفوق حاصل کیا لیکن جہاں تک تخلیقات کے ذریعہ سے ذہنی اثرات قبول کرنے کا تعلق ہے تو حکمت و دانش کی کتب کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادب کے تراجم کے ذریعہ سے بھی مغرب نے ذہنی آفاق کو وسعت دینے کی کوشش کی۔ اس میں انہیں کتنی کامیابی ہوئی اور وہ اثرات کتنے گہرے تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں مشرق سے دلچسپی نے اورنٹیل ازم (orientalism) اور انڈیالوجی (indialogy) جیسی اصطلاحات جنم دیں اور یہ رجحان عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کی معروف کتب کے تراجم کی بنا پر ممکن ہوسکا۔ فرانس میں وکٹر ہیوگو اور والیٹر مشرقیت کے حامی تھے جب کہ جرمنی میں تو "مشرقی تحریک" ایک باقاعدہ ادبی رجحان کی صورت میں ملتی ہے۔ جرمنی میں اس کا آغاز گوئٹے سے سمجھا جاتا ہے جو فارسی شاعری اور غزل کے تراجم میں اتنا متاثر ہوا کہ ان کی بنا پر اس نے ایک عالمی ادب (welt literature) کا تصور پیش کیا۔ کالی داس کا ڈرامہ "شکنتلا" یورپ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو کر خراج تحسین حاصل کرچکا ہے۔

فٹز جیرلڈ نے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ کر کے اہل انگلستان کے لیے گویا دائمی میخانہ مہیا کر دیا۔ ادھر محققین یہ بھی بتاتے ہیں کہ دانتے کی طربیہ خداوندی (divine comedy) ایک ہسپانوی عرب مصنف کی تصنیف "کتاب المعراج" کے لاطینی ترجمہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ بوکاچو کی "De cameron" پر الف لیلہ کے اثرات نمایاں ترہیں اور پسترار کی یہ سو کہانیاں ۱۳۴۸-۵۳ء میں لکھی گئیں اس طرح چاسر بھی الف لیلیٰ سے متاثر تھا اور اس کی "canterbury tales" پر محققین نے الف لیلیٰ کے اثرات ثابت کیے ہیں، بالخصوص اس کی کہانی "pardonre" پر۔ (۳)

ادھر جب فرانس میں گلستان سعدی (مترجم آدم اولیارلوس ۱۶۵۴ء) کے بعد حافظ کے تراجم (فان ہامر ۱۸۱۲ء) ہوئے تو انھوں نے گوئٹے اور اس کے آنے والے جرمن شعراء

کو بطور خاص متاثر کیا۔ خود گوئٹے حافظ سے بہت متاثر تھا۔ گوئٹے کے لیے حافظ نے وہی حیثیت اختیار کر لی تھی جو علامہ اقبال کے لیے مولانا رومی نے۔ اس نے اپنے ایک شعری مجموعے کا نام مشرقی مغربی دیوان (West Ostlicher divan 1819) رکھا۔ اس کے بعض ابواب کے عنوانات "زلیخا نامہ"، "تیمور نامہ" اور "پارسی نامہ" ہے۔ اس کی ایک نظم کا عنوان "فتویٰ" ہے جب کہ ایک اور نظم "نغمہ محمد" میں حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

گوئٹے کے بعد پلاٹن نے فارسی غزل کے انداز پہ جرمنی میں غزلیں کہیں چنانچہ اس کا پہلا مجموعہ "Ghaselen" ۱۸۲۱ء میں طبع ہوا جب کہ تیسرے مجموعہ کلام کا نام "آئینہ حافظ" Spiegel Des Hafiz 1822 اور پھر اگلے برس "نئی غزلیں" (Neve Ghaselen) طبع ہوا۔ پلاٹن نے غزل کو اس کی ہیئت کے مطابق لکھا یعنی قافیہ اور ردیف کے ساتھ اس نے رباعی اور قصیدہ میں بھی طبع آزمائی کی۔

اس کے ساتھ آوکرٹ کا نام لیا جاتا ہے جو حافظ کے ساتھ ساتھ مولانا رومی سے بھی متاثر تھا۔ اس نے بھی غزلیں لکھیں بلکہ اس معاملہ میں تو اسے پلاٹن پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ اس نے قافیے کی پیروی کی اور رباعیاں بھی لکھیں۔(۵)

جرمنی میں مشرقی تحریک تراجم کے ذریعے سے معرض وجود میں آئی۔ اس انداز پر دیگر یورپین زبانوں میں بھی مشرقی تخلیقات کے تراجم سے وہاں کی زبان و ادب پر تہذیبی اور لسانی اثرات کے سراغ لگائے جاسکتے ہیں۔ جرمنی یا یورپ کا تذکرہ اس لیے کیا گیا تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ تراجم کیسے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں اور ہماری مانند دیگر اقوام بھی تراجم سے تخلیقی آفاق میں وسعت پیدا کرتی رہی ہیں۔

این ہمہ مضامین فارسی:

اردو کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہاں بھی تراجم اہم ترین کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ تمام ترقی کے باوجود فارسی زبان اور ادب اہل اردو کے لیے مثالی نمونہ تھے۔ اس لیے اہل قلم کسی نہ کسی طور پر تراجم سے اردو کا دامن مالامال کرنے کی سعی کرتے رہتے تھے۔ جہاں تک لسانی محققین کی تحقیقات کا تعلق ہے تو دکن کے صوفی حضرات میراں صاحب یا شاہ میراں جی حسن خدا نما (وفات ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء) کے ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ

ہمدانی کی عربی تالیف "تمہیدات ہمدانی" کے اردو ترجمہ کے ترجمے کی اولین مثال تسلیم کیا جاتا ہے [٦]۔ احسن مارہروی نے اسے "شرح تمہید ہمدانی" یا "شرح تمہید" لکھا ہے نمونہ عبارت پیش ہے۔

"خواب میں پیغمبر ﷺ قاضی عین القضات کو کہے کہ تمہیں کئے سو کتاب مجے دکھلاؤ تو کتاب دیکھ کر بہوت خوش ہوئے ہور کہے کیا خوب بیان میرے نور کا ہور خدا کے نور کا کیے۔ ہور اسے کہنا بھی میرا چہ ہے اسے یکسیں ایک سطے ہیں تمہیں جوں پاتا ہے یوں پائے وے ہر کسی کوں اسے نکو کہو۔ جے اس کی قدر معلوم ہوگی اسے کہو۔ ہور بھی کوئی طلب رکھے گا تو اسے بھی کہو وے اس جنس سوں تعلیم دیو۔ یوں دودھ پتا سوں ننھواں کوں بیرا روٹی کھانے کے لائق کرتے ہیں یوں کرور جیوں میں کیا ہوں۔" [٧]

حضرت شاہ میراں جی قطب شاہی عہد کے تھے۔ اس ترجمے کی قطعی تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکتا تاہم حامد حسن قادری کے بموجب ١٦٥٣ء کا ایک مخطوطہ ملتا ہے۔ گویا اسے سب رس پر ٣٢ برس کی فوقیت حاصل ہوجاتی ہے۔

ادبی لحاظ سے ملاوجہی کے ترجمہ "سب رس" (١٦٣٥ء) کی بہت اہمیت ہے جو محمد یحییٰ سیبک فتاحی نیشاپوری کے منظوم فارسی قصہ "دستور عشاق المعروف قصہ حسن ودل کا" آزاد نثری ترجمہ ہے۔ اس تمثیلی قصے کی عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے۔ یہ ترجمہ دکنی ادب کی اہم ترین کتب میں شمار ہوتا ہے۔

شمالی ہند میں نثر کی پہلی باقاعدہ تصنیف فضلی کی کربل کتھا (١١٣٥ھ/١٧٢٢-٢٣ء) فارسی کی "روضۃ الشہدا" (از کمال الدین حسین بن علی واعظ کاشفی) کا آزاد ترجمہ ہے۔

جب ولی ١٧٠٠ء میں دہلی وارد ہوئے تو کلام سن کر مشہور صوفی سعد اللہ گلشن نے مشورہ دیا تھا:

"ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اند در ریختہ خود بکار بیر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔"

سعد اللہ گلشن کا یہ مشورہ اس لحاظ سے بہت مقبول اور بروقت تھا کہ غزل میں دکنی الفاظ ومحاورات کے ساتھ ساتھ مقامی رنگ بھی شامل تھا جو مغربی اسلوب اور فارسی اساتذہ کے خیالات کے تراجم کے ذریعہ سے غزل میں نئے آہنگ کا محرک بنا۔

دیکھا جائے تو ان کی یہ نصیحت ترجمے کے بارے میں تھی۔ شاعری میں ترجمہ دو طرح کا ہو سکتا ہے یا تو کسی استاد کا شعر سامنے رکھ کر شعوری کاوش سے اس کا ترجمہ کرنا یا پھر اساتذہ کے مضامین اور خیال کو اپنے الفاظ کے سانچے میں ڈھالنا۔

ہمیں یہ تو نہیں معلوم کہ ولی نے فارسی کے اساتذہ کے کن اشعار کا ترجمہ کیا یا کس حد تک مضامین اخذ کیے تاہم اتنا ہے کہ اردو غزل گو شعرا کے ہاں بعض اوقات فارسی شعرا کے ساتھ جو توارد مضمون نکل آتا ہے وہ غالباً اسی باعث ہوگا۔ اسے سرقہ نہ سمجھنا چاہیے۔ اس عہد میں ترجمے وغیرہ کے بارے میں کتابیاتی قواعد درج کرنے کا رواج نہ تھا، اس لیے لفظی ترجمہ یا خیال کا ترجمہ جائز تھا۔ اس انداز کے ترجمے کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مسی مالیدہ لب دار رنگ پان است
تماشہ کن تہ آتش دخان است (حزیں)

مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے
تماشہ ہے تہ آتش دھواں ہے (سودا)

گفتہ بودم غم دل با تو بگویم چو بیائی
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی (سعدی)

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے (غالب)(۸)

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما (رومی)

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا (غالب)

بگوشم ایں صدا از مقری تسبیح می آید
کہ صد دل مضطرب گردد چو یک دل ما بہ آرا ے (غنی)

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا (غالب)

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزہ خود را بہ نماز آمدہ ای (حافظ)

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا[9] (غالب)

تراجم کے دو دور۔

اردو میں تراجم کی روایت کا تجزیہ کرنے پر اسے دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان دو ادوار سے وابستہ رجحانات کی زمانی تقسیم کا تعلق ہندوستان کے سیاسی حالات سے مشروط نظر آتا ہے۔ انگریزوں کی سیاسی بالادستی سے پہلے جو تراجم کیے گئے، وہ سیاسی مقاصد کی خاطر نہ تھے۔ بلکہ تہذیبی، مذہبی اور تخلیقی نوعیت کے تھے۔ عربی سے زیادہ تر اسلام، عقائد اور تصوف کے بارے میں کتب کے تراجم کے ساتھ ساتھ طب، نجوم، ریاضی، ہئیت، فلسفہ ادب اور شاعرانہ تصورات کے تراجم کیے گئے۔ اگرچہ موضوعات کی یہ تقسیم قطعی نہیں کہ ہر زبان سے ہر موضوع کی کتاب کا ترجمہ کیا جاسکتا تھا اور کیا گیا ہوگا لیکن بحیثیت مجموعی تراجم کا کچھ یہی انداز نظر آتا ہے۔ اگرچہ علم دوست بادشاہوں، نوابوں، وزیروں اور متمول حضرات کی سرپرستی کے باعث ہی کتابوں کے تراجم ہوتے تھے۔ لیکن ان تراجم سے کسی قسم کے سیاسی مقاصد وابستہ نہ تھے۔ یہ ترجمے علمی ضروریات کے تحت کرائے جاتے تھے اور بنیادی مقصد علمی جستجو ہوتا تھا۔ ان تراجم میں موضوعات کا کتنا تنوع ملتا ہے، اس کا اندازہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کتابیات مرتب کی جائیں۔ پاک و ہند کی بڑی بڑی لائبریریوں کے علاوہ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور بعض دیگر یورپی ممالک کی مرکزی لائبریریوں میں مخطوطات کی فہرستوں کا جائزہ لینے پر تراجم میں موضوعاتی تنوع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

تراجم کا دوسرا دور انگریزی سیاست کی بالادستی سے مشروط نظر آتا ہے اور اگر قطعی طور سے اس کی زمانی حدود کا تعین مقصود ہو تو فورٹ ولیم کالج (۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء) سے آغاز کرتے ہوئے۔ "باغ و بہار" پہلی کتاب قرار دی جاسکتی ہے جو کہ "نو طرز مرصع" پر استوار تھی اور وہ خود ترجمہ تھی۔ میر عطا حسین تحسین کے ۱۷۹۸ء کے فارسی قصے کا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی پالیسی، کس طرح سیاسی عزائم میں تبدیل ہو گئی اس سے سب آگاہ ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کمپنی کے اہلکاروں کو دیسی زبانیں اور بالخصوص ہندوستانی سکھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ کالج کے نصاب کے لیے کتابیں نو وارد انگریزوں کی مخصوص ضروریات کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کرائی گئیں۔ ان سے کسی طرح کے ادبی یا تخلیقی مقاصد وابستہ

نہ تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس وقت اردو نثر برائے نام تھی۔ اس لیے داستانوں کے تراجم نصابی ضروریات سے قطع نظر، انفرادی صورت میں مقبول ہو کر سلیس نثر کا نقطہ آغاز قرار پاگئے۔

تراجم کے اس منصوبے کے لیے بہر حال گلکرسٹ کو داد دینی پڑتی ہے جس نے صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے جو نصابی منصوبہ بندی کی، اس کے دور رس نتائج ظاہر ہوئے۔ محمد عتیق صدیقی کی تالیف "گلکرسٹ اور اس کا عہد" میں فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام طبع کی گئی (اور بوجوہ طبع نہ ہو سکی) تمام کتابوں کی تفصیل درج ہے۔ (ص ۱۹۷-۱۹۳) کل مطبوعہ زیر طبع اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۶۰ بنتی ہے۔ دیوناگری رسم الخط کی دس کتابیں چھوڑ کر باقی ۵۰ اردو میں تھیں ۳۲ مقامی حضرات فورٹ ولیم کالج کے باقاعدہ تنخواہ دار ملازم (منشی) تھے مگر یہ سبھی اہل قلم نہ تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام کیے گئے تراجم میں بلاشبہ باغ و بہار، حسن بیان اور طرز ادا کے لحاظ سے مقبولیت میں سرفہرست قرار پاتی ہے۔ ہر چند کہ کمپنی حکام کا مقصد اسے اردو میں سلاست نگاری کا نقطہ آغاز بنانا نہ تھا۔ لطیفہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو سیکھنے کے لیے خود انگریز تگ و دو کرتے تھے اور مقامی لباس پہن کر داڑھیاں رکھ کر مقامی لوگوں سے گھلنے ملنے کی کوشش کرتے، قواعد اور لغت مدون کرتے اور تراجم سے اردو سیکھتے مگر سقوط دہلی کے بعد حالات بدلے، انگریز حاکم ہو گئے تو اب صورت حال برعکس ہو گئی یعنی "نیٹو" انگریزی سیکھنے کی تگ و دو میں مصروف ہو گئے۔ جب سے اہل قلم اور اہل علم کو جدید علوم اور نئے فنون کے معاملہ میں اردو کی تنگ دامانی کا احساس ہوا تو انگریزی سے اردو میں تراجم کا آغاز ہوا، صدی بیت گئی مگر ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے بلکہ اب تو انگریزی کے ساتھ فرانسیسی، جرمنی اور روسی اور لاطینی امریکہ تک سے تراجم ہو رہے ہیں۔

پہلا ترجمہ:

جہاں تک انگریزی سے اردو میں تراجم کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں جزوی سعی کا آغاز جوشوا کوٹلر کی "لاطینی میں ہندوستانی زبان کے قواعد و لغت سے سمجھا جا سکتا ہے جس میں انجیل کے اوامر عشرہ کا ہندوستانی ترجمہ بھی شامل تھا جو ہندوستانی زبان میں کسی یورپین زبان کا پہلا ترجمہ تھا۔ (۱۰) اس کے بعد بنجمن شلز کا نام آتا ہے جس کی "A Grammer of Hindustani Language" (مدراس ۱۷۴۱ء) اس انداز کے ترجمے کی ثانوی مثال

ہے۔ یہ گرامر طبع ہو چکی ہے اور گزشتہ باب میں اس کا مفصل تعارف کرایا جا چکا ہے۔ شلزے کیونکہ پادری تھا، اس لیے گرامر کے ضمیمہ میں جن مذہبی دعاؤں کے تراجم دیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں۔

اعتبار کا دعا یعنی The Appostle's Creed (1)، خاوند کی بندگی یعنی Lords (2) Prayer، روسپیا کا مذکور یعنی Baptism (3) کے علاوہ Ten commandments کو The Dialogue کا عنوان دے کر جو اردو میں ترجمہ کیا گیا، اس کی صورت میں دکھنی نثر کا ایک قدیم نمونہ مل جاتا ہے۔ لہذا یہ ترجمہ اور نہیں تو صرف اسی بنا پر قابل توجہ ہے۔ اس ضمن میں سلیم الدین قریشی نے یہ معلومات بہم پہنچائی ہیں: "۱۷۴۳ء میں اپنی پہلی اردو کتاب شائع کرنے کے بعد شلزے کا ارادہ پرانے عہد نامہ کے ترجمہ کو مکمل کرنے کا تھا۔ لیکن یہ کام داؤد کے گیت (The book of psalms) کے ترجمے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کے بعد شلزے نے پوری توجہ نئے عہد نامہ کے ترجمے کی طرف کر دی۔ نئے عہد نامہ کے مختلف حصوں کے ترجمہ ۱۷۴۹ء، ۱۷۵۸ء کے درمیان شائع ہوئے۔ ۱۷۵۸ء اور میں جب نئے عہد نامہ کے تمام مختلف حصوں کا ترجمہ مکمل ہو کر شائع ہو گیا تو ان مطبوعات کو ایک نئے سرورق، عنوان اور دیباچے کے ساتھ یکجا کر کے جلد بندی کر دی گئی۔ انجیل کے ترجموں کے علاوہ شلز کی دو اور کتابیں بھی ہیں، ان میں سے پہلی اللہ کے لائق ہے تو ایمان کی تعلیم کا کوتاب یعنی ہے جو ۱۷۴۳ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اسلام اور عیسائیت کی تعلیم کا موازنہ کیا گیا ہے اور عیسائی عقائد کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔"[11]

محمد عتیق صدیقی نے "گلکرسٹ اور اس کا عہد" میں گلکرسٹ کی ہندوستانی زبان کے کوائف (۱۷۹۶ء) کے ضمن میں یہ بتایا کہ شیکسپیئر کے دو ڈراموں کے کچھ اجزا (ہیملٹ اور ہنری ہشتم) گلکرسٹ نے ترجمہ کیے تھے اور اسے "اولیت کا فخر"[12] قرار دیا لیکن جیسا کہ مندرجہ بالا سے واضح ہو جاتا ہے، یہ اولین کوشش نہیں۔

اس انداز کی مزید مثالیں بھی مل سکتی ہیں لیکن جہاں تک باقاعدہ کتاب کے ترجمے کا تعلق ہے تو ڈاکٹر سموئل جانسن کے تمثیلی قصہ "تواریخ راسلس شہزادہ حبشی کی" (۱۷۵۹ء) کا کمال الدین حیدر عرف محمد میر حسنی الحسینی نے جو اردو ترجمہ (۱۸۳۹ء) کیا، اب تک کی معلومات کی رو سے یہ ترجمے کی پہلی کتاب ثابت ہو سکتی۔ اس ترجمے کی نظر ثانی پادری جان جیمز مور اور منشی فتح اللہ خان اکبر آبادی نے کی تھی۔ اس کا انگریزی دیباچہ جان جیمز مور نے

قلمبند کیا تھا اور گرین وے پریس آگرہ سے ۱۸۳۹ء میں طبع ہوئی (۱۳)۔
معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد میر حسن الحسینی پیشہ ور مترجم تھے کیونکہ انھوں نے سائنسی موضوعات پر انگریزی کتب کے متعدد تراجم کیے۔ مرزا حامد بیگ نے اپنی کتابیات تراجم (اسلام آباد جلد اول ۱۹۸۶ء، جلد دوم ۱۹۸۷ء) میں ان کی پانچ کتابوں کے اندراج کے بعد متذکرہ مقالہ میں مزید گیارہ کتب ترجمہ کی نشاندہی کی ہے تفصیل درج ہے۔ یہ سبھی گرین وے پریس آگرہ سے چھپی تھیں۔

۱۔ رسالہ علوم طبیعی، مصنف؟ ۱۸۲۸ء - ۱۸۲۹ء
۲۔ رسالہ ہیئت از ڈاکٹر ولسن ۱۸۲۸ء - ۱۸۲۹ء
۳۔ رسالہ دیگر ہیئت از ڈاکٹر برکلی ۱۸۲۸ء - ۱۸۲۹ء
۴۔ رسالہ علم کیمیا از ریورنڈ چارلس ۱۸۲۸ء
۵۔ رسالہ علم المناظر ۱۸۲۸ء
۶۔ رسالہ قوت مقناطیس
۷۔ رسالہ علم الماء
۸۔ اصول منطق، مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۳ء
۹۔ رسالہ عالم الہواء از ریورنڈ چارلس آگرہ ۱۸۲۸ء
۱۰۔ رسالہ مقاصد العلوم، از لارڈ براہم کلکتہ ۱۸۳۱ء

تھوڑی سی کوشش

۱۸۵۷ء کے بعد برعکس صورت حال کے باعث اب انگریزوں کو ہندوستانی سیکھنے کی ضرورت نہ رہی۔ کیونکہ اب تو خود ہندوستانی انگریزی سیکھنے پر مجبور تھے۔ یہ سماجی ضرورت تھی جس کے نتیجے میں انگریزی جزو نصاب بنی اور اب تک جزو نصاب بنی چلی آرہی ہے۔
انگریزی سے نصابی سطح کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خاں، مولانا محمد حسین آزاد اور ان کے رفقا کو شدت سے یہ احساس تھا کہ اردو کی روایتی غزلیہ شاعری، مشرق کا پسماندہ ادب اور تازہ ترین علمی تحقیقات سے عاری اور ذہنی طور پر جامد فنون، جدید زندگی کے تقاضوں کے لیے ناموزوں ہیں۔ ان کا ایک حل تو یہی انگریزی زبان کی تحصیل تھا لیکن بنیادی دقت یہ تھی کہ نہ تو وسیع پیمانے پر انگریزی کی تحصیل ممکن تھی اور نہ ہر شخص اس پر قادر۔ جب مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کہا۔
"اے جوہر زبان کے پرکھنے والو! میں زبان انگریزی میں بالکل بے

زبان ہوں اور اس ناکامی کا مجھے بھی افسوس ہے۔" (۱۴)

تو یہ ان کا ذاتی المیہ تھا مگر شاید وہ انگریزی سے نابلد متعدد ایسے افراد کی بھی ترجمانی کر رہے تھے جن کے لیے اب انگریزی میں استعداد بہم پہنچانا ناممکن تھا۔ آزاد نے انجمن پنجاب لاہور میں دیے گئے مشہور لیکچر میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا "تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے لیکن نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں، وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں۔ کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔ (۱۵) آزاد نے سرکار کی دلچسپی کے حوالے سے مزید کہا۔

"دیکھتا ہوں کہ آج کل ہماری گورنمنٹ اور ان کے اراکین کو اس طرف توجہ ہوئی ہے جن کے دل ہماری تعلیم کا ذمہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ حق پوچھو تو ہماری انشا کے ستارے اقبال کی مبارک ساعت ہے۔ اس موقع پر ہماری تھوڑی کوشش بھی بہت سا اثر کرے گی۔ (۱۶)

اور اس "تھوڑی کوشش" میں تھوڑی سی کوشش ترجمے کی بھی تھی۔ یوں دیکھیں تو انگریزی سے اردو تراجم ایک طرح کا علمی شارٹ کٹ قرار پاتے ہیں۔ انفرادی کوششوں سے قطع نظر تراجم کے لیے باضابطہ اور منظم کوششیں بھی کی گئیں۔ اس مقصد کے لیے ادارے بھی قائم کیے گئے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں نے بھی اپنی سی سعی کی۔

اس سلسلے میں یہ ادارے قابل ذکر ہیں:

دارالترجمہ شاہان اودھ

"دہلی کالج" ۱۸۵۳ء میں ٹرانسلیشن سوسائٹی دارالترجمہ قائم کی گئی۔

آگرہ کتب سوسائٹی، آگرہ ۱۸۴۳

انجمن پنجاب لاہور، ۱۸۷۳ء

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۰۳ء

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن (شعبہ تالیف و ترجمہ ۱۹۱۶ء میں قائم ہوا)۔

نواب شمس الامراء فخر الدین کا تصنیف و تالیف و ترجمہ کے لیے مطبع و مدرسہ فخریہ حیدر آباد دکن ۱۸۳۴ء۔

مدرسہ طبابت، حیدر آباد دکن ۱۸۳۵ء

انجمن مجمع علم و ہنر (سائنٹیفک سوسائٹی مدراس ۱۸۵۳ء)

میڈیکل سکول آگرہ ۱۸۵۳ء
انجینئرنگ کالج، رڑکی ۱۸۵۶ء
سائنٹیفک سوسائٹی، غازی پور ۱۹۶۲ء
سائنٹیفک سوسائٹی مظفر پور بہار، ۱۸۶۸ء
دفتر مترجم السنۂ شرقیہ (اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس بمبئی)
دار المصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکیڈمی، اردو اکیڈمی جامعہ ملیہ دہلی وغیرہ۔

ان اداروں کی مساعی کے نتیجہ میں اردو زبان میں فلسفہ، منطق، کیمیا، طب، طبعیات، نفسیات، ریاضی، جیومیٹری، ہئیت، نجوم، جغرافیہ، تاریخ اور معاشیات جیسے اہم علمی موضوعات تراجم ہوتے رہے، اتنے کہ بلاشبہ اس عہد کو عہد تراجم قرار دیا جاسکتا ہے۔ (۱۷)

تراجم کی اقسام:

اصولاً تو تراجم کی بھی اتنی ہی اقسام بن جاتی ہیں جتنی کہ اصناف ادب یا علوم ہیں تاہم سہولت کے لیے تراجم کو تخلیقی تراجم اور علمی تراجم، دو بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان دو شعبوں کی مزید نوعی اقسام بھی ہو جاتی ہیں۔ جیسے تخلیقی تراجم میں شاعری، ڈرامہ، افسانہ، ناول وغیرہ اور علمی تراجم میں سماجی علوم اور سائنس کی مختلف شاخیں شامل سمجھی جا سکتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ بنیادی علوم اور سائنس کی مختلف شاخیں شامل سمجھی جاسکتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ بنیادی بات واضح رہے کہ جس طرح تخلیقی ادب سے وابستہ تخلیقی عمل جداگانہ ہے، علمی یا تحقیقی موضوعات پر تحریر کا انداز الگ ہوتا ہے، اس طرح سے ترجمہ نہیں ہوتا۔ جہاں تک تخلیقی ادب کے تخلیقی عمل کا تعلق ہے تو مترجم اس معاملے "باہر والا" ثابت ہوتا ہے تخلیق ادب کی تخلیقی شخصیت میں لاشعوری محرکات کی کارفرمائی نے موضوع کو کتنی گہرائی بخشی اور اسلوب میں کیا جوت جگائی، مترجم کو اس غرض نہیں۔ اسی طرح غیر تخلیقی موضوعات کے لیے لکھنے والے نے فراہمی معلومات کے لیے کن کن دروازوں پر دستک دی۔ کتنی لائبریریوں کی خاک چھانی، کتنے مخطوطات کی دھول پھانکی، مترجم کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں، کیونکہ ترجمے کے لیے اسے تکمیل شدہ کتاب، مقالہ یا تخلیق ملتی ہے۔ اس لیے مصنف کی مانند تحریر سے ان کی جذباتی دلچسپی نہیں ہو سکتی بلکہ مصنف کے برعکس اس کا کام تو خاصا ٹیکنیکل ثابت ہوتا ہے یعنی رواں ترجمہ کے لیے مناسب الفاظ و محاورات کی تلاش اور علمی

ترجمے کی صورت میں موزوں اصطلاحات کی جستجو۔

علمی کتابوں کے مقابلے میں تخلیقات کا ترجمہ مشکل ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ عقل یا تصورات کی عکاسی کا ہوتا ہے اور جذبات احساسات کی تصویر کشی مقصود ہوتی ہے۔ لہذا علمی کتب کی مانند یہاں لفظ بہ لفظ کی چول بٹھانے سے بات نہیں بن سکتی۔

مترجم کی بنیادی الجھن، ایسی الجھن ہے جو اس بنیادی مسئلے سے جنم لیتی ہے کہ مفہوم کا ترجمہ کیا جائے یا اسلوب کا۔ متعدد تراجم جو ناکام ثابت ہوئے اس کا بنیادی سبب یہی ہے۔ شاعرانہ تخلیق میں یہ الجھن نمایاں تر صورت میں نظر آتی ہے کہ یہاں تو بعض اوقات کیفیت یہ ہوتی ہے۔

ع: آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

مترجم آبگینہ کی عکاسی کرے یا تندیٔ صہبا کی۔ ترجمہ بھی ایک فن ہے اور ہر فن کی مانند اس کی بھی کچھ مبادیات، مخصوص تقاضے اور ان سے متعلق فنی رموز ہیں۔ اردو میں ترجمے کی دو صدیوں پر محیط جو روایت ملتی ہے، وہ نامور اہل قلم کی کہکشاں پر مشتمل ہے اور اسی لیے یہ بے حد توانا بھی ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ترجمہ صرف پیشہ ور مترجمین ہی نے نہیں کیا بلکہ وہ حضرات بھی ملتے ہیں جو خود تخلیقی فنکار بھی تھے بلکہ زیادہ بہتر تراجم بھی انہیں ادیبوں نے کیے جو تخلیق کے رمز آشنا بھی تھے۔ میر امن سے جس کام کا آغاز ہوا وہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا نظر آیا۔ دراصل ایسے تراجم ہی تخلیقی ترجمہ کہلانے کے اہل ہیں جن کے مترجمین تخلیق کار بھی تھے۔ ترجمہ تخلیق کبھی بھی نہیں بن سکتا لیکن مترجمین اگر صاحب تخلیق کی اس ذہنی فضا تک جا پہنچیں جو تخلیقی عمل سے مشروط ہوتی ہے، تو ایسا ترجمہ تخلیق نہ ہوتے ہوئے بھی تخلیق کے اوصاف سے عاری نہیں ہوگا۔ اور اسی پر رشید احمد صدیقی (مراسلہ بنام، مشفق خواجہ) نے بھی زور دیا۔ انہوں نے تخلیقی اصناف کے تراجم پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا:

ہم اصل تصنیف کے مطلب و مفہوم کو تو اردو میں منتقل کر سکے، اصل کے مضمرات و مضمرات اور ان کی فضا اور ان کی بازگشت کامیابی کے ساتھ اپنی زبان میں نہ لا سکے۔ انگریزی، جرمن، فرنچ اور سنسکرت وغیرہ کی ادبیات کے جو ترجمے اردو میں ہوئے، ان میں اکثر ایسے معلوم ہوں گے جیسے وہ ترجمہ نہ ہوں، اردو ہی کی کوئی تصنیف ہو۔ عام طور پر اسے ترجمہ کی بہت بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔ مجھے ایسا ماننے میں تامل ہے۔ مغرب کے ہر ادب کے اختصاصی مترجم ہوتے ہیں جن کا کمال فن یہ ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کرتے ہیں۔ اس کی پوری

آب و ہوا، نوک پلک اور رنگ و بو ترجمے میں منتقل کر دیتے ہیں۔ پڑھنے والا زیادہ تر یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کس زبان کا ترجمہ پڑھ رہا ہے اور کمتر یہ کہ کس زبان میں پڑھ رہا ہے۔ اچھا ترجمہ بڑا پائیدار و دلکش لیکن اتنا ہی دشوار و سیلہ ہوتا ہے غیر زبانوں کی ممتاز اور مفید خصوصیات کو اپنی زبان میں ڈھالنے کا۔ جو لوگ انشا پردازی کے رموز سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ غیر زبان کی جینئس (Genius) کو اپنی زبان کے پہلو بہ پہلو جلوہ گر کرنا کتنا مشکل کام ہے۔"(۱۸)

تراجم اور تخلیقی رویے۔

اردو کے علمی تنگ دامنی کے احساس نے تراجم (بالخصوص) علمی تراجم کو فروغ دیا۔ اس نقطہ نظر سے مترجمین کی مساعی قابل ستائش ہے کہ ان کی بدولت ہمارے ہاں نئے علمی تصورات متعارف ہوئے، نصابی ضروریات پوری کی گئیں، سنجیدہ علمی موضوعات سے عمومی دلچسپی بڑھی، لیکن تخلیقی نقطہ نظر سے بھی تراجم کی اہمیت خالی از دلچسپی نہیں۔ جہاں تک اردو میں تخلیقات کی ترقی کا تعلق ہے تو ہماری تمام شعری اصناف فارسی سے مستعار ہیں۔ جبکہ ڈراموں اور داستانوں کی استثنائی مثالوں سے قطع نظر جملہ نثری اصناف جیسے ناول، افسانہ، انشائیہ، رپوتاژ، خاکہ، انگریزی سے در آمد شدہ ہیں اور اس ضمن میں بھی تراجم کا کردار اساسی ہے مثلاً ڈاکٹر محمد صادق کے بموجب نذیر احمد کا "بنات النعش" تھامس ڈے کے ہسٹری آف سین فورڈ اینڈ میٹرن (History of sandford and metron 1703)اور توبۃ النصوح "ڈینئل ڈیفو کے فیملی انسٹرکٹر" (۱۷۱۵ء) سے مستعار ہیں۔ افسانہ میں سجاد حیدر یلدرم کا مقام واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اب تو زمانی لحاظ سے انھیں پریم چند پر فوقیت دی جاتی ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "خیالستان" ترکی افسانوں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے افسانے کس کے ترجمے تھے لیکن اب ترکی کے ایک اردو دان پروفیسر ڈاکٹر ایر کن ترکمان کی تحقیق سے یہ معلوم ہو گیا کہ "خیالستان و گلستان"، "صحبت ناجنس" اور "ثالث بالخیر" احمد حکمت اوغلو کی ترکی افسانوں کے تراجم ہیں۔(۱۹)

اسی طرح انشائیہ بھی انگریزی (essay) کے تراجم کے ذریعے سے یہاں متعارف ہوا۔ اس معاملے میں اگرچہ سرسید کو اولیت دی جاتی ہے لیکن ان سے بھی پہلے ماسٹر رام چندر ملتے ہیں جنھوں نے انگریزی کے معروف "Essary" لکھنے والوں جیسے بیکن اور ایڈیسن کے

بعض "Essay" کے آزاد ترجمے کیے اور بقول ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی "اردو نثر کی تاریخ میں رام چندر کی یہ تقدیمی حیثیت بھی لائق احترام ہے کہ انھوں نے اردو کو مضمون یعنی "Essay" سے روشناس کرایا۔(۲۰)

اسی طرح ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بھی اپنی تالیف "ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ" میں انھیں "Essay" کا بانی قرار دیتے ہوئے اس کا باعث تراجم کو بتایا۔ وہ لکھتی ہیں "انھوں نے کئی انگریزی مضامین کا ترجمہ بھی کیا تھا اور متعدد موضوعات پر انگریزی ترجمے مضامین لکھنے کی کوشش کی تھی۔" (ص: ۳۷) ڈاکٹر صاحبہ نے ترجمہ شدہ انشائیوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔

ان کے بعد سرسید آتے ہیں جنھوں نے سولائزیشن کے دیوتاؤں سر رچرڈ سٹیل اور مسٹر ایڈیسن کے تراجم بھی کیے اور ان کے رنگ میں انشائیے بھی لکھے اور اس اعتراف کے ساتھ کہ "ہم نے یورپ کے نامی عالموں ایڈیسن اور سٹیل کے مضامین کو بھی اپنی طرز اور اپنی زبان میں لکھا ہے کہ جہاں ہم نے اپنے نام کے ساتھ اے ڈی اور ایس ٹی کا اشارہ کیا ہے اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے(۲۱)۔"

ان کے بعد مولانا محمد حسین آزاد ہیں جن کی "نیرنگ خیال" کے مضامین جانسن، ایڈیسن، سپکٹیٹر اور ٹیٹلر کے بعض Essay کے آزاد تراجم ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق کی تحقیق سے پیشتر انھیں طبع زاد سمجھا جاتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے اصل Essay کا کھوج لگا کر یہ کہا: "درحقیقت نیرنگ خیال کے تمام انشائیے انگریزی سے ترجمہ شدہ ہیں(۲۲)۔"

الغرض اردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز کرنے والے (ماسٹر رام چندر) بحیثیت صنف اسے تقویت دینے والے (سرسید احمد خان) اور اس میں اسلوب کی نزاکت شامل کرنے والے (محمد حسین آزاد) تینوں ہی تراجم کے مرہون منت ہیں۔ یوں دیکھیں تو صنف انشائیہ کا آغاز ہی تراجم پر استوار نظر آتا ہے۔

تراجم کے بارے میں مزید معلومات، مباحث اور فن سے آگاہی کے لیے مندرجہ ذیل کتب استفادات سے رجوع کیا جاسکتا ہے:

ڈاکٹر قمر رئیس، "ترجمہ کا فن اور روایت" دہلی

نثار احمد قریشی (مرتب) "ترجمہ روایت اور فن" اسلام آباد ۱۹۸۵ء

کل پاکستان اہل قلم کانفرنس (اسلام آباد) ۱۹۸۳ء کی ایک نشست، "ادب میں تراجم کی

افادیت" کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔
اس کے مقالہ نگاروں میں یہ اہل قلم شامل تھے۔
اے کے بروہی، خطبہ صدارت "ادب میں ترجمہ کی اہمیت اور قدر و قیمت" (ترجمہ مقالہ نظیر صدیقی)
دلشاد کلانچوی "ادب میں تراجم کی افادیت"۔
عبداللہ جان جمال دینی "ادبی تراجم کی افادیت"۔
غلام ربانی آگرو "ادب میں ترجمے کی افادیت"۔
ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری "ادب میں تراجم کی اہمیت"۔
یہ تمام مقالات ادبی زاویے (اسلام آباد ۱۹۸۳ء میں شامل ہیں)۔

اصطلاح کیا ہے؟

کسی علمی نظریہ، تصور، وقوعہ، کیفیت یا نتیجہ کے جوہر کو مختصر ترین الفاظ میں بیان کرنا، اصطلاح ہے۔ ہر شعبہ علم اور اس سے وابستہ مخصوص تصورات یا ایجادات و اختراعات اپنے اپنے وجود کے ساتھ اپنی ذات سے مخصوص اصطلاحات بھی لے کر آتی ہیں۔ جس طرح بچہ پیدا ہو کر مخصوص نام پاتا ہے اور پھر یہ نام عمر بھر اس کی پہچان کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح تصورات یا ایجادات بھی معرض وجود میں آ کر اصطلاحات سے اپنا تشخص برقرار رکھتی ہیں۔ یوں کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب اصطلاح اور اس سے متعلق شے یا تصور ایک ہو کر یوں لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں کہ تصور یا شے اور لفظ کی دوئی مٹ جاتی ہے اور اس تصور یا شے کی مقبولیت اصطلاح کے قبول عام پر منتج ہوتی ہے جس کے نتیجے میں وہ بالآخر لسانی اور زمانی حدود بھی پار کر جاتی ہے، اس حد تک کہ بعض اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تصور علمی حیثیت سے متروک ہو گیا یا شے دائرہ استعمال سے خارج ہو گئی مگر ان سے متعلق اصطلاحات باقی رہ جاتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ اساسی امر ملحوظ رہے کہ ہر زبان کے مخصوص مزاج اور اس کے لسانی ڈھانچے کے تناظر میں اصطلاح تشکیل پاتی ہے اور اس لحاظ سے جیسی بھی اصطلاح بنے گی، ٹھیک ہو گی۔ یہی نہیں بلکہ اصطلاح جن الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے، ان کے لغوی مفہوم کو اس تصور یا شے سے مطابقت بھی لازم نہیں۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ لفظ اور شے کے برعکس ہونے کے باوجود اصطلاح مقبول ہو جاتی ہے۔ اسے علامہ اقبال کے فلسفے کی ایک مثال

سے سمجھا جا سکتا ہے جنھوں نے اپنے افکار کا مرکزی نکتہ خودی کو قرار دیا۔ خودی کا یہ مفہوم خودی کے روایتی مفہوم اور ان سے وابستہ متصوفانہ تصورات کے برعکس ہے۔ جب یورپ کے مترجمین اس کا ترجمہ "ایگو" کرتے ہیں تو اس میں وہ انائی مفہوم بھی شامل ہو جاتا ہے جس کی علامہ اقبال کے تصور خودی سے توثیق نہیں ہوتی۔ اس طرح انھوں نے غزل کے روایتی تصور کے برعکس اپنی شاعری میں عشق کو یقین محکم، عمل پیہم کے مفہوم میں استعمال کیا اور اس اصطلاح پر اپنے فلسفہ عمل کی اساس استوار کی مگر اسے انگریزی لفظ Grand passion, passion, love یا فرانسیسی کے L' amore سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح علامہ اقبال کے جنون کی نفسیات کا عام اصطلاحات "Psychopath, amnic" یا "Neurosis" وغیرہ سے نہ صرف یہ کہ درست ترجمانی ممکن نہیں بلکہ یہ اصطلاحات برعکس مفہوم کا باعث بنتی ہیں۔ اسی طرح فرائڈ نے تحلیل نفسی میں لڑکے اور لڑکی کی، ماں باپ سے جنسی محبت کی وضاحت کے لیے یونان کے مشہور المیوں کے کرداروں سے ایڈیپس اور الیکٹرا کمپلیکس کی جو اصطلاحات ساخت کیں، وہ اس کے تصور جنس کی درست ترجمان ہیں مگر ان تصورات سے یہ اس حد تک مخصوص ہو چکی ہیں کہ اصل ڈراموں کے عدم مطالعے کے باوجود بھی یہ اصطلاحات کارآمد ثابت ہو رہی ہیں۔ بس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر اصطلاح کے الفاظ لغوی مفہوم شے یا تصور کی نمائندگی کر سکیں تو بہت اچھا لیکن برعکس صورت میں بھی اصطلاح کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

وضع اصطلاح:

سوال یہ ہے کہ اصطلاح کی تشکیل کس نوع کے الفاظ سے ہوتی ہے۔ اس ضمن میں سید وحید الدین سلیم نے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔

> "دنیا کی ہر علمی اور ترقی یافتہ زبان میں دو قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں جو اصطلاحات کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ (اول) مفرد الفاظ یا مفرد اصطلاحیں (دوم) مرکب الفاظ یا مرکب اصطلاحیں۔ اگرچہ مرکب الفاظ علمی زبانوں میں اہم ہوتے ہیں اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ تاہم مفرد الفاظ کی ایک بڑی تعداد ہر علمی زبان میں پائی جاتی ہے یہ مفردات یا تو ایسے ہیں جن پر مرکب الفاظ کی بنیاد ہے یا ایسے ہیں جن سے ترکیب الفاظ کے وقت کام نہیں لیا گیا اور مفرد ہونے کی

حالت میں بدستور باقی ہیں۔ علمی زبان میں مرکب اصطلاحیں بلاشبہ
زیادہ اہم ہیں تاہم مفردات ہماری بحث سے خارج نہیں ہو سکتے۔(۴۳)

اصطلاح سازی سے وابستہ فنی مباحث کے ضمن میں یہ امر قابل توجہ ہے کہ کسی خاص زبان میں اصطلاح وضع کرنا کوئی مسئلہ نہیں۔ دنیا کی بیشتر ترقی یافتہ زبانوں کے پاس وافر ذخیرہ الفاظ ہوتا ہے جس سے اصطلاح سازی ممکن ہو جاتی ہے۔ لیکن زبانوں میں موزوں الفاظ کی عدم دستیابی کی صورت میں دیگر زبانوں سے رجوع کر لیا جاتا ہے جیسے انگریزی میں یونانی اور لاطینی سے مدد لیتے ہیں اور ہم عربی اور فارسی سے، اچھی بری موزوں اور ناموزوں جیسی بھی اصطلاح ساخت ہوتی ہے، وہ چل نکلتی ہے مگر اردو کے نقطہ نظر سے ایک الجھن یہ ہے کہ ہمارے پاس اصطلاح اختراع کرنے کے حوالے سے معرض وجود میں آنے والے بیشتر مباحث اساسی طور پر اصطلاحات کے تراجم سے وابستہ ہوتے ہیں یہ مسئلہ اردو کا ہی نہیں بلکہ ان تمام زبانوں کا بھی ہے جن کا یہ مسئلہ ہے کہ اصطلاحات کے موزوں ترین تراجم کیسے کیے جائیں۔ ادھر آج کی دنیا میں جس رفتار سے انکشافات اور ایجادات ہو رہی ہیں اور جس تیزی سے علمی تصورات وضع کیے جا رہے ہیں، اس کی بنا پر "پی بی بوم" کی مانند "ٹرم بوم" سمجھنا غلط نہ ہوگا۔ تراجم خواہ کتنی ہی تیز رفتاری سے کیوں نہ ہوں اور ان کے لیے منظم سعی کی علمی اساس کتنی ہی مستحکم کیوں نہ ہو مگر تراجم کا اصطلاحات کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا ممکن نہیں۔ اصطلاح کے وجود میں آنے اور اس کے ترجمے کے عمل میں جو بعد ملتا ہے اسے ریاضی سے یوں واضح کیا جا سکتا ہے۔ اصطلاحات کی اختراع یا غیر ملکی اصطلاحات کی آمد Geo-matrical progression کے مطابق ہوتی ہے۔ یعنی ایک دو چار آٹھ سولہ۔ لہذا کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے، اصطلاحات کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا ممکن نہیں، قطع نظر اس امر کے کہ ترجمہ شدہ اصطلاح موزوں ہے بھی یا نہیں اور علمی حلقوں سے اسے سند قبولیت ملتی بھی ہے یا نہیں۔

اردو میں اصطلاح سازی کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک دور انگریزی اثرات سے پہلے کا ہے جب اردو میں فارسی، عربی اور کسی حد تک سنسکرت الفاظ کی امداد سے اصطلاحات تشکیل پاتی تھیں۔ دربار کی زبان فارسی تھی اس لیے امور مملکت اور تہذیبی معاملات میں فارسی سے مدد لی جاتی تھی۔ جبکہ دینی مسائل کے لیے عربی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ رہے سائنسی علوم بالخصوص، طب، ہیئت، نجوم، جغرافیہ وغیرہ تو ان کے لیے مسلم محققین

اوران کی سائنسی کتابوں کے ساتھ ساتھ قدیم سنسکرت کتب بھی موجود تھیں، اس لیے بجا طور پر اصطلاحات کی حد تک خود کفیل تھے۔ مخصوص نصاب تھا، مخصوص علوم اور مخصوص اصطلاحات۔ انگریزی کی آمد نے صورت حال کو بتدریج تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اب تک اپنے علوم سے مطمئن تھے چونکہ تقابل کے لیے کچھ نہ تھا لیکن انگریزی کی صورت میں جب تقابل کی ایک صورت پیدا ہو گئی تو پھر دونوں زبانوں میں علوم کے بعد کا اندازہ ہوا اور اسی کو ختم کرنے کے لیے تراجم کا آغاز ہوا۔ گذشتہ صفحات میں تراجم کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا ہے کہ اصطلاح سازی کا دوسرا دور جو اب تک جاری ہے، تراجم سے مشروط ہے۔ تراجم کی رفتار میں تیزی نے اصطلاح سازی کے مسئلہ کو انفرادی اور اجتماعی صورت میں نمایاں کیا گیا، اس لیے اب ہمارے لیے اصطلاح سازی اختراع کے معنوں میں "سازی" ہونے کے برعکس ترجمے کے مترادف ہے۔ اٹھارویں صدی میں ترجمہ کی انفرادی کوششوں کے بعد انیسویں صدی میں اردو کی صورت میں منظم طور پر تراجم کیے گئے جن کی بدولت اصطلاحات کے تراجم میں تیز رفتاری پیدا ہوئی۔

متغیر اصطلاح:

اصطلاح کے ایک مرتبہ ترجمہ یا وضع پا جانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ پتھر پر لکیر ثابت ہوتی ہے۔ علمی تصورات میں تغیرات کا ساتھ دینے کے لیے بعض اوقات اصطلاح بھی تغیر آشنا ہو جاتی ہے چنانچہ وضع کردہ اور ترجمہ شدہ اصطلاحات تبدیلیوں سے آشنا ہوتی رہتی ہیں۔ بقول پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی "اہل فرنگ کے ساتھ ہم کو بھی اپنی اصطلاحوں میں ترمیم کرنا پڑی۔ انگریزی میں پہلے پولیٹیکل اکانومی ایک علم کا نام تھا، ہم اسے سیاست مدن کہتے تھے۔ اب یورپ میں اس علم کی وضع قطع کے ساتھ اس کا نام بھی بدل گیا او رہم اکنومکس کو معاشیات کہنے لگے حالانکہ پرانی اصطلاح جلال الدین دوانی کی وضع کی ہوئی تھی (۲۳)۔ کیفی صاحب نے ۱۹۳۲ء میں یہ بات ایک لیکچر میں کہی تھی مگر اب نصف صدی کے بعد معاشیات کی جگہ اقتصادیات مروج ہے۔ خود اقتصادیات کو بھی علم الاقتصاد کی ترقی یافتہ صورت سمجھنا چاہیے۔

اصطلاح میں عمل تغیر کو سائیکولوجی کے لیے نفسیات کی مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے جو کبھی "علم النفس (القوا)" مترجم شیخ انعام علی بی۔ اے ۱۸۸۵ء تھی تو کبھی "روحانی

(تمدن عرب)" مترجم سید علی بلگرامی ۱۸۹۶ء لیکن ۱۹۲۷ء کے بعد نفسیات رائج ہو گیا۔
("معاشرتی نفسیات" مترجم مرزا محمد ہادی رسوا)(۲۵)۔

الغرض علوم کے مفاہیم میں تبدیلیوں کی نسبت سے اصطلاحات بھی تغیر آشنا رہتی ہیں البتہ تبدیلی کا یہ عمل خاصا سست رفتار اور غیر محسوس کن ہوتا ہے۔

اصطلاح: نفسیاتی تناظر:

اصطلاح کے اختراع یا ترجمہ کی صورت میں عمرانی، تہذیبی اور تمدنی امور کے ساتھ ساتھ لسانی پہلو بھی تشکیلی کردار ادا کرتا ہے۔ اصطلاح کی تشکیلی عناصر کے تجزیہ و تحلیل میں ان سب کی انفرادی کارفرمائی اہم ہوتی ہے۔ کرداری نفسیات کے نقطۂ نظر سے اگر اصطلاح کی مقبولیت یا عدم قبولیت کا جائزہ مقصود ہو تو اسے Conditioning سے سمجھا جا سکتا ہے جو وسیع پیمانے پر بلکہ قومی سطح پر ہوتی ہے۔ جو اصطلاح زبان زد عوام ہو گئی، اسے شعوری تبدیلی یا احکام سے عوام کی زبان سے اتارنا آسان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیلی ویژن کے لیے "دور درشن" یا "دور نما" زبان پر نہیں چڑھتا، نہ ہی ریڈیو کو کوئی "آکاش وانی" سمجھتا ہے۔ ایوب خان نے ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے خبروں میں مشرقی پاکستان کو "پوربو پاکستان" کہلوانا شروع کیا تھا مگر اسے بھی عوام نے قبول نہ کیا۔ اس کی وجہ تعصب نہیں بلکہ یہی ہے کہ جو اصطلاح زبان پر چڑھ گئی ہو کنڈیشنگ کی بنا سماعی اور گویائی اعصاب سے مشروط ہو جاتی ہے اس کی جگہ نئی اصطلاح استعمال کرنے کی شعوری کاوش کا مطلب ہے۔ De- conditioning اور یہ عمل آسان نہیں ہوتا۔ اگر موجد نے ٹیلی ویژن کا نام "دور درشن" یا "دور نما" یا کچھ بھی کیوں نہ رکھا ہوتا تو ایجاد کے ساتھ یہ نام بھی مقبول ہو کر زبان زد عوام ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لغوی طور پر درست ہونے کے باوجود بھی "دور درشن"، "دور سماعت" (ٹیلی فون) "دور شبیہ" (ٹیلی فوٹو) یا دور تحریر (ٹیلی گرام) مقبول نہیں ہو سکتے۔ یہ تو عام اشیا سے متعلق اصطلاحات کی بات ہے لیکن معاملہ جب مذہبی یا تہذیبی امور کا ہو تو ان سے وابستہ شدید جذبات کی بنا پر تبدیلی سے متعلق ذہنی عمل مزید دشوار ہو جاتا ہے۔ اصطلاح سازی ہمارا ہی مسئلہ نہیں، ایشیا کی بیشتر زبانوں کا یہی مسئلہ ہے بلکہ ترقی یافتہ ممالک بھی کسی نہ کسی حد تک اس مسئلہ سے دوچار ہوتے ہوں گے۔ گویا یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر زبان کے اپنے خصوصی لسانی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے اور

اپنی مخصوص مذہبی، تہذیبی ثقافتی روایات اور ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصطلاح سازی کی جاتی ہے۔ ہم معرب اصطلاحات بے شک نہ وضع کریں لیکن ہم غیر اسلامی اصطلاحات مروج نہیں کر سکتے۔ خنزیر سے پاکستانی مسلمانوں کی نفرت اور کراہت عیاں ہے، اس لیے اس سے متعلق کسی طرح کے الفاظ کی اصطلاح ناپسندیدہ ہوگی۔

اب ایران کی مثال لیجیے جہاں ہمارے برعکس عربی الفاظ کے مقابلے میں فارسی الفاظ پر مشتمل اصطلاحات قابل قبول ہوں گی۔ وہ فرانسیسی، انگریزی یا دیگر زبانوں کے الفاظ کو تو مفرس بنا لیتے ہیں جیسے پوسٹ کا پست مگر بیشتر الفاظ فارسی زبان سے ہی لیتے ہیں۔ جب سرکاری سطح پر تراجم اور اصطلاحات میں معیار بندی کے لیے اپریل ۱۹۳۵ء میں "فرہنگستان" کے نام سے وزارت تعلیم کے زیر اہتمام ادارہ کی تشکیل کی گئی تو انہوں نے تخلیق، تحقیق، ترجمہ اور اصطلاحات کے ضمن میں اصول وضع کیے، ان میں سے دو اصول یہ بھی تھے۔ "جہاں تک ممکن ہو زندگی کے ہر شعبہ میں فارسی اصطلاحات و الفاظ اختیار کرنا۔" اور "ناپسندیدہ خارجی الفاظ سے زبان کو پاک کرنا(۳۶)۔" اسی طرح اردو کے تعصب میں ہندوستان میں بھی عربی فارسی الفاظ ترک کر کے ان کی جگہ سنسکرت اصطلاحات اور الفاظ لانے کی سرکاری پالیسی کے نتیجہ میں وہ سرکاری زبان کو اجنبی زبان بنا لینے میں یقیناً کامیاب ہو گئے ہوں گے لیکن کیا اسے عوامی مقبولیت بھی حاصل ہو سکی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کیا ایک بہت بڑی قدیم اور جامع زبان سے تعلق منقطع کر لینے سے وہ خود کتنا بڑا لسانی زیاں کرتے ہیں، اسے بھی مد نظر رکھا گیا کہ نہیں؟

اردو میں اصطلاح سازی

اردو میں وضع اصطلاحات اور اس سے وابستہ مسائل کو تراجم جتنا ہی قدیم سمجھا جانا چاہیے۔ جس مترجم نے پہلی مرتبہ کسی علمی کتاب کا ترجمہ کیا ہوگا، اسی دن سے اصطلاح سازی کا آغاز ہو گیا ہوگا۔ یہ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر، اس سے فرق نہیں پڑتا البتہ اجتماعی صورت میں چونکہ کسی ادارہ سے وابستہ ہوتی ہے، اس لیے معیار بندی ممکن ہو جاتی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل جامعہ عثمانیہ اور انجمن ترقی اردو کی اصطلاحات معیاری تصور کی جاتی تھیں۔

وضع اصطلاحات اور پھر ان کی افادیت کے بارے میں یہ بات غور طلب ہے کہ لسانی اصولوں سے مطابقت کے باوجود بھی کسی اصطلاح کا زبان زد عوام ہو جانا لازم نہیں۔ عوام کی

زبان پر چڑھنے کے لیے اصطلاح کا سہل اور مختصر ہونا بنیادی شرط ہے، اسی لیے دقیق اصطلاحات ماہرین کی تحریروں میں تو جگہ پا سکتی ہے لیکن عوام کی زبان سے بالعموم دور ہی رہتی ہیں۔ اسے اس مثال سے سمجھیے: اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر ایسا ہے جس سے ہر سرکاری ملازم کو کام پڑتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات تو مرنے کے بعد بھی اس دفتر سے پیچھا نہیں چھٹتا۔ اکاؤنٹنٹ جنرل کے لیے مندرجہ ذیل اصطلاحات وضع کی جا چکی ہیں، ناظم حسابات، ناظم اعلیٰ حسابات، محاسب اعلیٰ، صدر محاسب، مقیب اعلیٰ، مہتمم اعلیٰ، میر محاسب، میر بخش، محتسب اعلیٰ، حساب دار اعلیٰ[۲۷]۔ مگر ان میں سے ایک اصطلاح بھی عوام کی زبان پر نہ چڑھ سکی وہ تو اکاؤنٹنٹ جنرل بلکہ اے جی کہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ یوں عوامی سطح پر جب اصطلاحات مسترد ہوں تو پھر سارا عمل ہی بے مصرف نظر آتا ہے اور یہ انگریزی یا غیر ملکی الفاظ کے معرب یا مفرس ترجمے کی صورت میں ہوتا ہے اور اس سے اس استدلال کو تقویت ملتی ہے کہ اصطلاحات اصل صورت میں استعمال ہونی چاہییں۔

اصطلاح سازی کے لیے مقرر کیے گئے راہنما اصولوں کی اہمیت مسلم۔ ان سب مباحث کی اساس ان دو بنیادی نکات پر استوار نظر آتی ہے۔

۱۔ کیا انگریزی یا دیگر زبانوں سے مستعار اصطلاحات کو بعینہٖ استعمال کیا جانا چاہیے؟

۲۔ یا ان کا معرب یا مفرس ترجمہ ہونا چاہیے؟

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو غالباً اس سے کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا کہ اردو زبان کے لسانی ڈھانچے میں اتنی لچک پائی جاتی ہے کہ ہر نوع کے الفاظ کے درست املا پر قادر ہے اور اردو بولنے والے ان کے درست تلفظ کے اہل ہیں تو کیوں نہ تمام اصطلاحات کو ان کی اصل صورت میں قبول کر کے ترجمے اور بالخصوص غلط، ناموزوں اور گمراہ کن تراجم کے نتیجہ میں جنم لینے والی الجھنوں سے نجات حاصل کر لیں۔ رہا اصطلاحات کے مفرس یا معرب تراجم کا مسئلہ تو اگرچہ عربی زبان الفاظ و اصطلاحات اور مترادفات کی صورت میں وسیع ذخیرہ الفاظ کی حامل ہے اور پھر اس سے ہمارا مذہبی رابطہ بھی ہے۔ ادھر فارسی سے ہمارا تہذیبی اور ادبی تعلق رہا ہے لیکن معرب اور مفرس تراجم کے سلسلے میں یہ اہم حقیقت بالعموم فراموش کر دی جاتی ہے کہ عربی اصطلاحات آج سے چار پانچ صدیوں پہلے کے علوم و فنون سے متعلق ہیں اور اپنی تمام تر جامعیت کے باوجود عربی جدید دور کی سائنسی اور تکنیکی ضروریات کے ساتھ دینے کی اہل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود مصر، شام اور عراق میں بھی تازہ ترین اصطلاحات کے

تراجم کا مسئلہ درپیش ہے اس لیے آج محض عربی یا فارسی کے تراجم پر انحصار چنداں سودمند نہیں۔ دیکھا جائے تو اصطلاح سازی سے وابستہ بیشتر مباحث محض عربی فارسی تراجم کے باعث پیدا ہوئے۔ انگریزی اصطلاحات اصل صورت میں تسلیم کر لی جائیں تو تمام بحثیں، الجھنیں اور مسائل خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں اکاؤنٹنٹ جنرل کی مثال سے واضح کیا جا چکا ہے کہ ماہرین کی وضع کردہ اصطلاحات نامقبول رہیں اور عوام اصل انگریزی لفظ کے استعمال ہی کو ترجیح دیتے رہے۔ یہ محض ایک مثال ہے ورنہ اس انداز کی لاتعداد مثالیں مل سکتی ہیں۔ اردو کے اہل علم و فکر، محققین، مترجمین اور ماہرین لسانیات نے ایک صدی ان تراجم میں صرف کر دی مگر اصطلاحات کے تراجم کا تنوع ہی عدم معیار کا مظہر بھی ہے۔

وضع اصطلاحات سے متعلق اصول و قواعد کے ضمن میں سید وحید الدین کی تالیف "وضع اصطلاحات" (حیدر آباد دکن: ۱۹۲۱ء) اس موضوع پر اولین اور بنیادی کتاب تصور ہوتی ہے اور اس موضوع پر کام کرنے والے حضرات کے لیے اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کو اسٹھ برس ہونے کو آئے ہیں ان کے بعد مولوی عبدالحق، برجموہن دتاتریا کیفی، سید سلیمان ندوی، مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم اور متعدد اہل قلم نے خامہ فرسائی کی۔ پاکستان میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے اصحاب نے قلم اٹھایا اور اب اس مد میں خاصہ کام ہو گیا ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر عطش درانی کی کتاب "اردو اصطلاحات سازی" منظر عام پر آئی ہے۔ یہ اس موضوع پر وقیع کام ہے جس پر ڈاکٹر درانی کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔

پاکستان میں اصطلاح سازی کے ضمن میں ہمیں اپنے مخصوص حالات کی روشنی میں ایک لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں اس وقت مترجمین کی انفرادی کوششوں کے ساتھ ساتھ سرکاری سطح پر کئی ادارے فعال ہیں مثلاً اردو کالج کراچی (۱۹۴۹ء)، مجلس ترقی ادب (لاہور ۱۹۵۰ء)، سائنٹیفک سوسائٹی (کراچی ۱۹۵۵ء)، مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی (لاہور ۱۹۵۶ء) ترقی اردو بورڈ (کراچی ۱۹۵۸ء)، مرکزی اردو بورڈ (اب سائنس بورڈ لاہور، ۱۹۶۲ء)، مجلس زبان دفتری حکومت پاکستان (لاہور ۱۹۴۹ء)، مقتدرہ قومی زبان، (اسلام آباد ۱۹۷۹ء)، ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی (لاہور)، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی (کراچی ۱۹۵۶ء)۔ اس ضمن میں مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے پاکستان

تراجم کا مسئلہ درپیش ہے اس لیے آج محض عربی یا فارسی کے تراجم پر انحصار چنداں سود مند نہیں۔ دیکھا جائے تو اصطلاح سازی سے وابستہ بیشتر مباحث محض عربی فارسی تراجم کے باعث پیدا ہوئے۔ انگریزی اصطلاحات اصل صورت میں تسلیم کر لی جائیں تو تمام بحثیں، الجھنیں اور مسائل خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں اکاونٹنٹ جنرل کی مثال سے واضح کیا جا چکا ہے کہ ماہرین کی وضع کردہ اصطلاحات نامقبول رہیں اور عوام اصل انگریزی لفظ کے استعمال ہی کو ترجیح دیتے رہے۔ یہ محض ایک مثال ہے ورنہ اس انداز کی لاتعداد مثالیں مل سکتی ہیں۔ اردو کے اہل علم و فکر، محققین، مترجمین اور ماہرین لسانیات نے ایک صدی ان تراجم میں صرف کر دی مگر اصطلاحات کے تراجم کا تنوع ہی عدم معیار کا مظہر بھی ہے۔

وضع اصطلاحات سے متعلق اصول و قواعد کے ضمن میں سید وحید الدین کی تالیف "وضع اصطلاحات" (حیدر آباد دکن: ۱۹۲۱ء) اس موضوع پر اولین اور بنیادی کتاب تصور ہوتی ہے اور اس موضوع پر کام کرنے والے حضرات کے لیے اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کو اسّی برس ہونے کو آئے ہیں ان کے بعد مولوی عبدالحق بر سو بھی دتا تریا کیفی، سید سلمان ندوی، مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم اور متعدد اہل قلم نے خامہ فرسائی کی۔ پاکستان میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے اصحاب نے قلم اٹھایا اور اب اس مد میں خاصہ کام ہو گیا ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر عطش درانی کی کتاب "اردو اصطلاحات سازی" منظر عام پر آئی ہے۔ یہ اس موضوع پر وقیع کام ہے جس پر ڈاکٹر درانی کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔

پاکستان میں اصطلاح سازی کے ضمن میں ہمیں اپنے مخصوص حالات کی روشنی میں ایک لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں اس وقت مترجمین کی انفرادی کوششوں کے ساتھ ساتھ سرکاری سطح پر کئی ادارے فعال ہیں مثلاً اردو کالج کراچی (۱۹۴۹ء)، مجلس ترقی ادب (لاہور ۱۹۵۰ء)، سائنٹیفک سوسائٹی (کراچی ۱۹۵۵ء)، مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی (لاہور ۱۹۵۶ء) ترقی اردو بورڈ (کراچی ۱۹۵۸ء)، مرکزی اردو بورڈ (اب سائنس بورڈ) لاہور، ۱۹۶۲ء، مجلس زبان دفتری حکومت پاکستان (لاہور ۱۹۴۹ء)، مقتدرہ قومی زبان، (اسلام آباد ۱۹۷۹ء)، ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی (لاہور)، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی (کراچی ۱۹۵۶ء)۔ اس ضمن میں مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے پاکستان

میں اردو کے ترقیاتی ادارے (از پروفیسر ایوب صابر)۔

اصطلاحات کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مولوی عبدالحق "اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ" کراچی ۱۹۳۹ء
سید وحید الدین سلیم "وضع اصطلاحات" حیدر آباد دکن ۱۹۲۱ء
ڈاکٹر سید عبداللہ: "وضع و استناد اصطلاحات" (پمفلٹ) اسلام آباد ۱۹۸۶ء
ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری: "اردو اصطلاحات سازی: کتابیات" اسلام آباد ۱۹۸۵ء
محمد طاہر منصوری: "عربی اصطلاحات سازی: کتابیات" اسلام آباد ۱۹۸۵ء
عارف نوشاہی، ڈاکٹر مہر نور محمد خان: "فارسی اصطلاحات سازی: کتابیات" اسلام آباد ۱۹۸۵ء
ڈاکٹر مہر نور محمد: "ایران میں وضع اصطلاحات کے اصول" (پمفلٹ) اسلام آباد ۱۹۸۵ء
شکیل سنگوری: "متندرہ قومی زبان اور اصطلاح سازی" (پمفلٹ) اسلام آباد ۱۹۸۷ء
طارق محمود: "جامعہ کراچی میں اردو" (پمفلٹ)، اسلام آباد ۱۹۸۶ء
ڈاکٹر سید سلطان محمود: "مغربی ممالک میں ترجمے کے قومی اور عالمی مراکز" اسلام آباد ۱۹۸۶ء
خورشید یوسف: "مشینی تراجم کا ماضی اور مستقبل" (پمفلٹ)، اسلام آباد ۱۹۸۶ء
ڈاکٹر سلیم اختر: "اصطلاح سازی: تاریخ، مسائل، مباحث" لاہور ۱۹۹۰ء
ڈاکٹر عطش درانی: "اردو اصطلاحات سازی"، انجمن فروغ علمیہ اسلام آباد، طبع اول ۱۹۹۳ء، بار دوم ۱۹۹۳ء۔
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "لسانی مطالعے میں شماریاتی ادوای طریق کا استعمال (مقالہ) سیپ، شمارہ ۶ کراچی

حواشی

۱۔ سو نجیی: انشائیہ اور انشائیہ نگاری "فنون"، لاہور، جولائی، اگست ۱۹۸۴ء
۲۔ "ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر" ص: ۳۲
۳۔ "تمدن عرب" ص: ۵۶۳
۴۔ "ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر" دیباچہ از مترجم، ص: ۲۵۱
۵۔ تمام کوائف "ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر" سے ماخوذ۔
۶۔ "داستان تاریخ اردو" طبع سوم ص: ۳۳
۷۔ "نمونہ منثورات" ص: ۳۶
۸۔ اس نقطہ نظر سے غالب پر بعض اوقات اعتراضات بھی کیے گئے ہیں کے جواب کے لیے سید ہندو سبحانی کی "گنجینہ تحقیق" ملاحظہ ہو۔
۹۔ گنجینہ تحقیق ص ۱۱۲ تا ۱۳۶
۱۰۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۲۴۷
۱۱۔ "اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب" ص: ۱۷
۱۲۔ "گلکرسٹ اور اس کا عہد" ص: ۹۶
۱۳۔ "اردو دنیا کا پہلا بین الاقوامی شہری" از ڈاکٹر حامد بیگ، مطبوعہ "ماہ نو" لاہور، ستمبر ۱۹۸۸ء
۱۴۔ "نیرنگ خیال" دیباچہ، ص: ۱۰
۱۵۔ "نظم آزاد" ص: ۳۶
۱۶۔ نظم آزاد، ص: ۵۰
۱۷۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہوں
الف۔ احمد عبداللہ قدوسی "مملکت حیدر آباد ایک علمی ادبی اور ثقافتی لوان" کراچی ۱۹۶۷ء
ب۔ محمد سجاد مرزا بیگ، دہلوی: فہرست، حیدر آباد دکن ۱۹۳۲ء
ج۔ صبیر حسن، ایم اے: مغربی تصانیف کے اردو تراجم، حیدر آباد دکن ۱۹۳۹ء
د۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ: کتابیات تراجم، اسلام آباد ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۷ء
۱۸۔ "خطوط رشید احمد صدیقی" مرتبہ لطیف الزمان خان، ص: ۲۴۹، ۲۵۰
۱۹۔ "سجاد حیدر یلدرم اور ان کے ترکی تراجم" مطبوعہ ماہ نو لاہور جون ۱۹۸۸ء
۲۰۔ صدیق الرحمن قدوائی "ماسٹر رام چندر" مقدمہ، ص: ۳۶
۲۱۔ مقالات سرسید (حصہ دہم) مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، ص: ۸۶
۲۲۔ ڈاکٹر محمد صادق: محمد حسین آزاد: احوال و آثار ص: ۶۷، اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب راقم کی "انشائیہ کی بنیاد" بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔
۲۳۔ "وضع اصطلاحات" ص: ۱۷
۲۴۔ "منثورات" ص: ۷۳
۲۵۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "نفسیاتی تنقید" لاہور ۱۹۸۶ء
۲۶۔ ڈاکٹر مہر نور محمد "ایران میں وضع اصطلاحات کے اصول" ص: ۱۰
۲۷۔ "اخبار اردو"، اسلام آباد، ستمبر ۱۹۸۵ء

کتابیات

کتابیات

آرزو، سراج الدین علی خان:
"نوادر الالفاظ" (مرتبہ: ڈاکٹر سید عبداللہ) کراچی، انجمن ترقی اردو
پاکستان 1951ء

آرزو لکھنوی، سید انوار حسین:
"نظام اردو" لکھنو اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۷۹ء

آزاد، جگن ناتھ:
"اردو" نئی دہلی مکتبہ جامعہ طبع ششم ۱۹۶۶ء

آزاد، محمد حسین:
"آب حیات" لاہور شیخ مبارک علی ۱۹۵۰ء
"دربار اکبری" لاہور سنگ میل پبلیکیشنز
"مقالات محمد حسین آزاد" (مرتبہ آغا محمد باقر) جلد سوئم لاہور، مجلس
ترقی ادب ۱۹۸۷ء
"نظم آزاد" لاہور مکتبہ عالیہ ۱۹۷۸ء

آغا افتخار حسین:
"یورپ میں اردو" لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۶۸ء
"یورپ میں تحقیقی مطالعے" لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۷ء

ادیب، سید مسعود حسن رضوی:
"اردو زبان اور اس کا رسم الخط" لکھنو دانش محل ۱۹۴۸ء

ابن حنیف:
"تخلیق کائنات" ملتان دانش کدہ، ۱۹۶۶ء
"جلجامش کی داستان" لاہور مکتبہ معین الادب ۱۹۶۱ء
"مصر کی قدیم مصوری" ملتان کاروان ادب ۱۹۸۱ء
"ابوریحان البیرونی" لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، سنہ ندارد۔

ابوالفضل:

"آئین اکبری" (ترجمہ مولوی محمد فدا علی طالب) لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، سنہ ندارد۔

ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر:

(بطور مرتب) "جامع القواعد۔ حصہ صرف" لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۷۱ء

ہندوستانی گرامر" از: بنجمن شلزے، لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۷۷ء

ابوسلمان شاہجہانپوری، ڈاکٹر:

"اردو اصطلاحات سازی: کتابیات" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۴ء

"کتابیات: قواعد اردو" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۵ء

احتشام حسین/ڈاکٹر آغا سہیل:

"اردو لسانیات کا مختصر خاکہ" لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ۱۹۷۷ء

احسن مارہروی:

"نمونہ منثورات" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

احسن، عبدالشکور (مرتب):

"پاکستانی ادب" لاہور، ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب ۱۹۸۱ء

——— "ادبی زاویے" اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۸۳ء

احمد، بے خود موہانی، سید:

"گنجینہ تحقیق" لکھنؤ اترپردیش اردو اکادمی ۱۹۷۹ء

امداد صابری:

"تلامذہ میر" راولپنڈی، اختر اکادمی ۱۹۶۵ء

اقتدار حسین خان، ڈاکٹر:

"اردو صرف و نحو" نئی دہلی، ترقی اردو بیورو ۱۹۸۵ء

انعام الحق کوثر، ڈاکٹر:

"براہوئی سے اردو تراجم (توضیحی کتابیات) اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء، مختلف

انیس اشفاق، ڈاکٹر:
"انتخاب غزلیات قائم چاند پوری" لکھنو اتر پردیش، اردو اکاڈمی
ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر:
(مرتب) "اردو میں اصولِ تحقیق" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جلد اول
۱۹۸۶ء، جلد دوم ۱۹۸۸ء
ایوب صابر، پروفیسر:
"پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان
۱۹۸۵ء
پریشان خٹک، پروفیسر:
"لسانی رابطہ" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۷ء
پریم چند:
"مضامین پریم چند" (مرتبہ عتیق احمد) کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان
۱۹۸۱ء
تاثیر، محمد دین:
"نثر تاثیر" (مرتبہ فیض احمد فیض) بہاولپور اردو اکادمی ۱۹۶۳ء
"مقالات تاثیر" (مرتبہ ڈاکٹر ممتاز گوہر) مجلس ترقی ادب لاہور
تارا چند، ڈاکٹر:
"اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر" دلی، آزاد کتاب گھر، طبع دوم
۱۹۷۲ء
تبارک علی نقشبندی، ڈاکٹر سید:
"مرزا مظہر جان جاناں (ان کا عہد اور اردو شاعری)" نئی دہلی، انجمن
ترقی اردو ۱۹۸۸ء
ثریا حسین، پروفیسر:
"گارسین دتاسی، اردو خدمات اور علمی کارنامے" لکھنو اتر پردیش اردو
اکاڈمی ۱۹۸۳ء

جابر علی سید:

"کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ" (جلد اول) اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۴ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر:

"تاریخ ادب اردو" لاہور، مجلس ترقی ادب، جلد اول ۱۹۷۵ء، جلد دوم ۱۹۸۴ء

"قدیم اردو کی لغت" لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۷۳ء

حاتم، شیخ ظہور الدین:

"دیوان زادہ" (مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار) لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۷۵ء

حسرت موہانی، سید فضل الحسن:

"نکات سخن" حیدر آباد دکن، طبع ششم ۱۹۲۵ء

حسن اختر ڈاکٹر، ملک:

"اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک" لاہور، یونیورسل بک ۱۹۸۶ء

خدیجہ شجاعت علی:

"ترجمہ سہل حدائق البلاغت" از امام بخش صہبائی لاہور ۱۹۵۴ء

خلیل الرحمن داؤدی:

(مرتب)

"قواعد زبان اردو مشہور بہ رسالہ گلکرسٹ" لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۶۲ء

خلیل صدیقی:

"زبان کا مطالعہ" مستونگ قلات پبلشرز ۱۹۶۴ء

خسرو، امیر:

"مثنوی نہ سپہر" (مترجم: محمد رفیق عابد) نئی دہلی مکتبہ جامع ۱۹۷۹ء

خورشید لکھنوی:

"افادات" لکھنؤ، اترپردیش اردو اکادمی ۱۹۸۴ء

خورشید یوسف:

"مشینی ترجمہ کا ماضی اور مستقبل" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء

خیال، نصیر حسین خاں نواب:
"داستان اردو" حیدر آباد دکن، ادارہ اشاعت اردو
خیال، محمد نعیم اللہ
"اردو ایک ہمہ گیر زبان" لکھنئو، دانش محل ۱۹۸۵ء
"اردو کی بین الاقوامی حیثیت" (حصہ اول) لکھنو دانش محل ۱۹۸۴ء
راز، ڈاکٹر رام آسرا:
"اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ" نئی دہلی مکتبہ جامعہ ۱۹۷۵ء
رام، بابو سکسینہ:
"تاریخ ادب اردو" (مترجم: مرزا محمد عسکری) لاہور، کتب خانہ علمیہ
رشید اختر ندوی:
"ارض پاکستان کی تاریخ، اسلام آباد ۱۹۸۶ء
رشید حسن خان:
"اردو املا" دہلی، نیشنل اکادمی ۱۹۷۴ء
"زبان اور قواعد" لاہور، مکتبہ عالیہ ۱۹۸۷ء
رضیہ نور محمد، ڈاکٹر مس:
"اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" لاہور، مکتبہ خیابان ادب ۱۹۸۵ء
رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر:
"اردو نثر کا آغاز وارتقا" کراچی کریم سنز ۱۹۷۸ء
رے ے، آر تھرایف جے:
"ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر" (مترجم ریاض الحسن) کراچی، پاک جرمن فورم ۱۹۷۴ء
زور، سید محی الدین قادری:
"اردو کے اسالیب بیان" لاہور مکتبہ معین الادب ۱۹۶۴ء
"دکنی ادب کی تاریخ" کراچی، اردو اکادمی سندھ ۱۹۶۹ء
"سر گذشت حاتم" حیدر آباد، دکن ادارہ ادبیات اردو ۱۹۳۴ء
"ہندوستانی لسانیات" لاہور، مکتبہ معین الادب ۱۹۶۱ء

سبط حسن:

"ماضی کے مزار" کراچی، مکتبہ دانیال ۱۹۸۴ء

سر جیشورورما:

"آریائی زبانیں" لاہور، مکتبہ معین الادب ۱۹۸۴ء

سرشار، رتن ناتھ:

"فسانہ آزاد" (جلد اول) لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ۱۹۸۴ء

سلطان محمد حسین، ڈاکٹر سید:

"یورپ میں اردو کے مراکز انیسویں صدی میں" لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۸۴ء

سلیم الدین قریشی:

"اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء

سلیمان ندوی، سید:

"عرب و ہند کے تعلقات" کراچی، اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۸۷ء

"نقوش سلیمانی" کراچی، مکتبہ شرق

سید احمد دہلوی، مولوی:

"فرہنگ آصفیہ" دہلی، نیشنل اکادمی ۱۹۷۴ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر:

"اردو کا روپ" لاہور، آزاد بک ڈپو ۱۹۷۱ء

"اردو کی کہانی" لاہور، مکتبہ عالیہ ۱۹۷۵ء

"ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ" کراچی، مکتبہ اسلوب ۱۹۸۵ء

شبیر علی کاظمی، سید:

"پراچین اردو" کراچی، مکتبہ اسلوب ۱۹۸۴ء

شرف الدین اصلاحی، ڈاکٹر:

"اردو سندھی کے لسانی روابط" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع دوم ۱۹۸۷ء

شمس اللہ قادری، حکیم، سید:

"اردوئے قدیم" کراچی، جنرل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۳ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر:

"اردو قواعد" کراچی، مکتبہ اسلوب ۱۹۸۲ء

"اردو زبان کا ارتقا" ڈھاکہ، پاک کتاب گھر ۱۹۵۶ء

"اردو لسانیات" کراچی، مکتبہ تخلیق ادب ۱۹۶۶ء

صدیق الرحمان قدوائی:

"ماسٹر رام چندر" دہلی، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ء

طارق عزیز، ڈاکٹر:

"اردو رسم الخط اور ٹائپ" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۷ء

عابد علی عابد:

"اسلوب" لاہور، ادارہ فروغ اردو ۱۹۵۶ء

"تنقیدی مضامین" لاہور، مکتبہ میری لائبریری ۱۹۶۶ء

عبدالحق، ڈاکٹر، مولوی:

"اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۵۳ء

"تنقیدات عبدالحق" (مرتبہ محمد تراب علی خان باز) حیدر آباد، دکن کتب خانہ عزیزیہ۔

عبدالقیوم:
(مرتب)

"تاریخ ادب اردو" کراچی، پاکستانی ایجوکیشنل پبلشرز سندھ

عصمت جاوید:

"نئی اردو قواعد" نئی دہلی، ترقی اردو بیورو ۱۹۸۱ء

عطش درانی، ڈاکٹر:

"اردو زبان اور یورپی اہل قلم" لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ۱۹۸۷ء

"مغربی ممالک میں ترجمہ کے قومی اور عالمی مراکز" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء پمفلٹ۔

علی جواد زیدی:

"انتخاب رند" لکھنو اتر پردیش، اردو اکادمی ۱۹۸۳ء

علی لطف میرزا:

"تذکرہ گلشن ہند" لکھنو اتر پردیش، اردو اکادمی ۱۹۸۶ء
"اردو کے خوابیدہ الفاظ" لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۷۲ء

عین الحق فرید کوٹی:

"اردو زبان کی قدیم تاریخ" لاہور اورین ریسرچ سنٹر ۱۹۷۹ء

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر:

"حاتم، حالات و کلام" لاہور، مکتبہ خیابان ادب ۱۹۶۳ء

غلام علی الانا، ڈاکٹر:

"زبان اور ثقافت" اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر:

"جامع القواعد حصہ نحو" لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۷۳ء

فائق، قاضی نور الدین:

"تذکرہ مخزن الشعرا (تذکرہ شعرائے گجرات) لکھنو اتر پردیش، اردو اکادمی ۱۹۵۸ء

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر:

"اردو املا اور رسم الخط اصول و مسائل" لاہور سنگ میل پبلیکیشنز ۱۹۷۷ء
"زبان اور اردو زبان" لاہور، آئینہ ادب ۱۹۷۳ء

فضلی، فضل علی:

"کربل کتھا (دہ مجلس)" مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، دہلی، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ء

کمال قریشی، ڈاکٹر: (مرتب)

"اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب" دہلی اردو اکادمی ۱۹۸۷ء
"کتاب مقدس کا پہلا حصہ یعنی پرانا عہد نامہ" (عبرانی سے اردو

ترجمہ) لاہور برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی پنجاب، انگریزی، طبع ہشتم ۱۹۰۸ء

کیفی، برجموہن دتاتریہ:
"کیفیہ" لاہور، مکتبہ معین الادب ۱۹۵۰ء
"منشورات" لاہور، مکتبہ معین الادب ۱۹۵۰ء

گستاوی بان، ڈاکٹر:
"تمدن عرب" (مترجم شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی) سرگودھا ظفر ٹریڈرز۔

گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر:
(مرتب) "لغت نویسی کے مسائل" نئی دہلی، مکتبہ کتاب نما ۱۹۸۵ء

لطیف الزمان خان:
(مرتب) "خطوط رشید احمد صدیقی" کراچی، مجلس ادبیات مشرق ۱۹۸۸ء

محمد اجمل، ڈاکٹر:
"نفسی طریق علاج میں مسلمانوں کا حصہ" (ترجمہ شہزاد احمد) لاہور، ادارہ معرفت اسلامیہ ۱۹۸۸ء

محمد اسحاق صدیقی:
"فن تحریر کی تاریخ" علی گڑھ انجمن ترقی اردو ۱۹۶۲ء

محمد اسماعیل پانی پتی:
"مقالات سرسید (حصہ دہم)" لاہور، مجلس ترقی ادب

محمد باقر، ڈاکٹر:
"اردو قدیم دکن اور پنجاب میں" لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۷۲ء

محمد سردار علی:
"تذکرہ یورپین شعرائے اردو" حیدر آباد دکن ۱۹۳۱ء

محمد سلیم پروفیسر سید:
"اردو رسم الخط" کراچی، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۱ء

محمد صادق، ڈاکٹر:

"محمد حسین آزاد احوال و آثار" لاہور، مجلس ترقی ادب
"کچھ آب حیات کی حمایت میں" لاہور، مجلس ترقی ادب

صالح کمبوہ:

"عمل صالح المعروف بہ شاہجہان نامہ" (مترجم: ڈاکٹر ناظر حسین زیدی) لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۷ء

محمد عتیق صدیقی:

"گلکرسٹ اور اس کا عہد" علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ۱۹۶۰ء

محمد مجیب:

"تاریخ تمدن ہند" لاہور پروگریسو بک ۱۹۸۶ء

محمد ہادی حسین:

"زبان اور شاعری" لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۸۴ء

محمود خاں شیرانی، حافظ:

"پنجاب میں اردو" لاہور، مکتبہ معین الادب طبع چہارم س ؟
"مقالات حافظ محمود شیرانی" (مرتبہ: مظہر محمود شیرانی) لاہور، مجلس ترقی ادب جلد دوم ۱۹۶۶ء
"مقالات شیرانی" لاہور، کتاب منزل ۱۹۳۸ء

محمود حسین خاں، ڈاکٹر:

"مقدمہ تاریخ زبان اردو" لاہور، اردو مرکز ۱۹۶۶ء

مہر عبدالحق، ڈاکٹر:

"ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق" بہاولپور اردو اکادمی ۱۹۶۷ء

میر تقی میر:

"نکات الشعراء" مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی لاہور، ادارہ ادب و تنقید ۱۹۸۰ء

میرزا ادیب:

(مرتب) "تنقیدی مقالات" جلد اول لاہور، لاہور اکیڈمی ۱۹۶۰ء

ناطق لکھنوی، سید ابوالعلا حکیم:
"نظم اردو" لکھنو ۱۹۳۱ء

نصیر احمد، ڈاکٹر:
"اردو کی بولیاں اور کرخنداری کا عمرانی لسانیاتی مطالعہ" دہلی ادارہ تصنیف ۱۹۷۹ء

نصیر الدین ہاشمی:
"دکن میں اردو" حیدر آباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ، طبع سوم ۱۹۳۶ء
"دکنی کلچر" لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۳ء
"دکھنی (قدیم اردو)" کے چند تحقیقی مضامین" دہلی، آزاد کتاب گھر ۱۹۶۳ء

نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر:
"دلی کا دبستان شاعری" کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۴۹ء

وحید الدین سلیم، سید:
"افادات سلیم" لاہور، مکتبہ عالیہ ۱۹۸۷ء
"وضع اصطلاحات" نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، طبع دوم ۱۹۸۸ء

یونس جاوید (مرتب):
"کلیات ناسخ" لاہور، مجلس ترقی ادب، جلد اول ۱۹۸۷ء

جرائد/اخبارات

"آج کل" دہلی اردو تحقیق نمبر اگست ۱۹۶۷ء، اردو نمبر اگست ۱۹۶۸ء

"اردو معلیٰ" (قدیم اردو نمبر) دہلی، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی (غالب نمبر شمارہ ۸) دہلی شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی۔

"اخبار اردو" اسلام آباد جون ۱۹۸۲ء، جنوری ۱۹۸۳ء، فروری ۱۹۸۳ء، ستمبر ۱۹۸۵ء، جولائی ۱۹۸۷ء

"ادبی دنیا" لاہور، فروری ۱۹۳۱ء

"اردو" (سہ ماہی) کراچی، جولائی ۔ ستمبر ۱۹۷۵ء

"اردو نامہ" لاہور سالنامہ مارچ ۱۹۸۳ء، مارچ ۱۹۸۶ء

"الناظر" لکھنؤ، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۵ء

"افکار" کراچی، برطانیہ میں اردو، ایڈیشن اپریل ۱۹۸۱ء

"اقبال ریویو" لاہور، جولائی ۱۹۶۵ء

"اقبال" (سہ ماہی) لاہور اکتوبر ۱۹۷۳ء

"امروز" (روزنامہ) لاہور، ۷ جون ۱۹۸۷ء، ۲۶ جون ۱۹۷۲ء، یکم نومبر ۱۹۷۸ء، ۲۲ فروری ۱۹۸۰ء۔

"اوراق" نمبر ۳ نومبر ۱۹۶۸ء، ستمبر ۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء

"اورینٹل کالج میگزین" شعبہ اردو جامعہ پنجاب، مارچ ۔ جون ۱۹۷۲ء

"خیابان" جلد ۱، نمبر ۳، جنوری ۱۹۲۷ء

"سویرا" لاہور، مئی ۱۹۷۶ء

"سیپ" نمبر ۶، کراچی

"شاعر" بمبئی شمارہ نمبر ۳، ۴۔۱۹۸۶ء

"شب خون" الہ آباد شمارہ ۵۳ اکتوبر ۱۹۷۶ء

"صحیفہ" سہ ماہی لاہور، جولائی ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۷ء، اپریل ۱۹۶۸ء، اکتوبر ۱۹۶۸ء، اپریل ۔ جولائی ۱۹۷۰ء، جنوری ۔ مارچ، اپریل ۔ جون، جولائی ۔ ستمبر ۱۹۸۶ء، جولائی ۔ اگست ۱۹۸۸ء

"غالب" (سہ ماہی) کراچی، اپریل - جون ۱۹۷۵ء، جنوری - مارچ ۱۹۷۷ء

"فنون" لاہور سالنامہ غالب نمبر ۱۹۶۹ء، جولائی - اگست ۱۹۸۲ء

"قومی زبان" کراچی، دسمبر ۱۹۸۱ء جولائی ۱۹۸۸ء

"ماہ نو" لاہور، مارچ ۱۹۵۳ء، اکتوبر ۱۹۷۸ء، جنوری ۱۹۷۹ءٹ اگست ۱۹۸۰ء، جولائی ۱۹۸۱ء، اکتوبر ۱۹۸۲ء، دسمبر ۱۹۸۷ء، جون ۱۹۸۸ء، ستمبر ۱۹۸۸ء۔

"مجلہ تحقیق" جامعہ پنجاب جلد ۱، شمارہ خاص ۱، ۲۔

"نیا دور" مارچ ۱۹۶۷ء

"نقوش" لاہور، سالنامہ ۱۹۶۲ء، جنوری ۱۹۷۶ء، ادبی معرکہ نمبر ستمبر ۱۹۸۱ء۔

"نگار پاکستان" کراچی، جنوری ۱۹۸۵ء، اگست ۱۹۸۶ء، جولائی ۱۹۸۷ء، جنوری ۱۹۸۸ء، جولائی ۱۹۸۸ء۔

"ہمایوں" دہلی، سالنامہ جنوری ۱۹۶۹ء

"ہم سخن" (جناح گورنمنٹ کالج کراچی) حضرت امیر خسرو نمبر ۱۹۷۳ء، ۱۹۷۵ء

"ہندوستانی" الہ آباد، جنوری ۱۹۳۱ء۔

BIBLIOGRAPHY

Bailey, T. Grahame
"Teach Your Self Hindustani" London, English University Press, 1950.

Cassirer, Ernest
"An Essay On Man" N. Y. Doubleday, 1954.

Forbes, Duncan
"Dictionary Urdu And English" Lahore, Sang-E-Meel Publications, 1986.

Hamilton, Edith
"Mythology" N. Y. Mentor Books, 1959.
"Life" Bible issue, 9 4. 1965.

Platts, John T.
" A Dictionary of Urdu Calssical Hind, and English" Lahore, Sang-E-Meel Publications 1983.

Poybus, G. D.
"Urdu Prosody and Rhetoric" Lahore 1924.

Sandars, N. K.
"The Epic of Gilgamish" Baltimore Pengin Books, 1964.

Shakespear, John
Dictionary 'Urdu - English and English - Urdu" Lahore, Sang-E-Meel Pulbications 1980.

Shumaker, Whyne
"Literature and the Irrational" N. Y.

Spence, Lewis:
"The Out Line of Mythology" N. Y. Pengin Books 1961.

Steingass, F.
"A Comprehensive Persian English Dictionary, Lahore, Sang-E-Meel Publications 1977.

Whitworth, George Cliff Ord
"An Anglo Indian Dictionary" Lahore, Sang-E-Meel Publications, 1981.